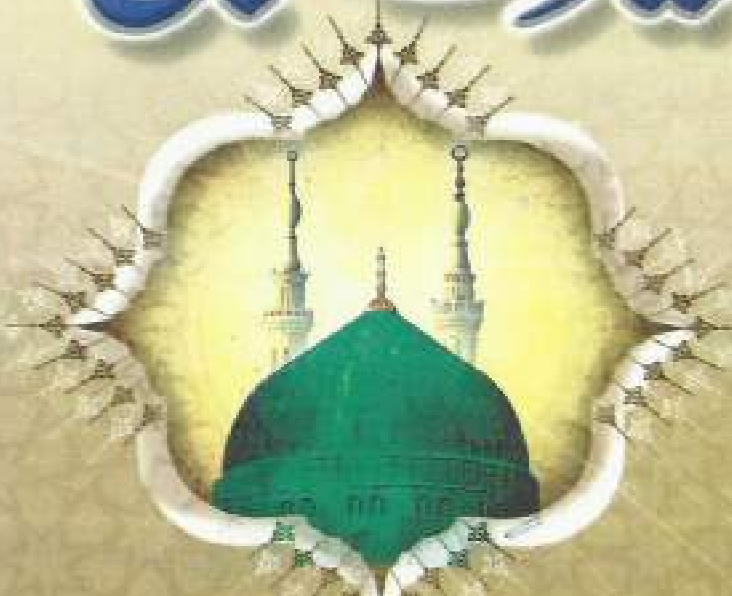
{ وَمَآ أَرْسَلْنٰكَ إِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِينَ }

اور ہم نے آپ [ﷺ] کو تمام جہان والوں کیلئے رحمت بنا کر بھیجا ہے

(الانبیاء: ۱۰۷)

سیرت النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم



تالیف

خلیق احمد مفتی

﴿وَمَا أرسَلْنَاكَ اِلّا رَحْمَةً لِّلعَالَمِينَ﴾

اور ہم نے آپ [صلی اللہ علیہ وسلم] کو تمام جہان والوں کیلئے رحمت بنا کر ہی بھیجا ہے

(الأنبیاء: ۱۰۷)

سیرت النبی

صلی اللہ علیہ وسلم

تألیف:

خلیق احمد مفتی

نام کتاب : سیرت النبی ﷺ

طبع : اول

تأ لیف : خلیق احمد مفتی

ناشر :

﴿ رابطہ ﴾

پوسٹ بکس نمبر:1625 عجمان، متحدہ عرب امارات ۔

khaleeqmufti@hotmail.com

face book: Khaleeq Ahmed Mufti

☆☆☆

ملاحظہ: یہ کتاب مفت تقسیم کیلئے ہے۔

فہرستِ مضامین

عنوان:	صفحہ:

بسم اللّٰہ الرحمٰن الرحیم

حرفِ آغاز:

الحمد للّٰہ ربّ العالمین ، والصّلاة والسّلام علیٰ أشرف الأنبیاء والمرسلین ، نبیّنا محمّد وعلیٰ آلہ وأصحابہ أجمعین ، أمابعد :

اللہ سبحانہ وتعالیٰ پرایمان کے بعد کسی بھی مسلمان کیلئے سب سے قیمتی ترین متاع رسول اللہ ﷺ کے ساتھ عقیدت ومحبت ہے، بلکہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی معرفت اوراس کی رضا وخوشنودی کے حصول کا واحد طریقہ بھی ''اتباعِ رسول ﷺ'' میں ہی منحصر ہے۔

یہی وجہ ہے کہ قدیم وجدید ہر دور میں بڑی تعداد میں رسول اللہ ﷺ کی سیرتِ مبارکہ کے موضوع پر کتابیں تحریر کی گئی ہیں......اور یقیناً آئندہ بھی تا قیامت یہ سلسلہ جاری رہے گا......کیونکہ......جیسا کہ مثال مشہور ہے: مَن أحَبَّ شَیئاً أکثَرَ ذِکرَہٗ...... یعنی ''انسان جس چیز سے محبت کرتا ہے' بار بار اسی کا تذکرہ کرتا ہے......'' وہ یہ نہیں سوچتا کہ مجھ سے قبل اسی بارے میں کتنے لوگ کیا کچھ کہہ چکے ہیں......یا کیا کچھ لکھ چکے ہیں......

اسی کیفیت کے تحت یہ نا کارہ اور بے علم وعمل انسان بھی اپنے ٹوٹے پھوٹے الفاظ اور بے ربط عبارات میں وقتاً فو قتاً کچھ نہ کچھ تحریر کرتا رہا......(۱)

بالآخر محض اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے فضل وکرم سے بے ربط عبارات کا یہی مجموعہ کتابی شکل میں تیار ہو گیا......

(۱) خصوصاً ۲۰۱۱ء میں بیرونِ ملک ایک ٹی وی چینل کی طرف سے فرمائش پر ''سیرت النبی ﷺ'' کے عنوان سے مفصل پروگرام پیش کرنے کا موقع ملا، تب ان تحریروں کا مجموعہ مسلسل بڑھتا رہا......

اللہ سبحانہ وتعالیٰ سے دعاء ہے کہ اس ناچیز کی سعی کو شرفِ قبولیت سے نوازیں، اور اسے میرے لئے، میرے والدین، اہل وعیال، ذوی الأرحام، تمام اساتذۂ کرام، نیز ہر اس شخص کیلئے جس نے اس کتاب کی طباعت واشاعت میں کسی بھی شکل میں تعاون کیا ہو ذخیرۂ آخرت بنائیں۔

وآخردعوانا أن الحمدللّٰه ربّ العالمين ،

وصلّیٰ اللّٰه تعالیٰ علیٰ خيرخلقه محمّد وعلیٰ آله وأصحابه أجمعين .

خلیق احمد مفتی

۱۸/ ربیع الاول ۱۴۳۵ھ، مطابق ۱۹/ جنوری ۲۰۱۴ء بروز اتوار۔

پوسٹ بکس نمبر: 1625 عجمان، متحدہ عرب امارات ۔

khaleeqmufti@hotmail.com

face book: Khaleeq Ahmed Mufti

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

سیرتِ مبارکہ......قبل از ولادت:

عام طور پر اہلِ قلم کے یہاں رواج یہ ہے کہ جب کسی اہم شخصیت کی سیرت نگاری یا اس کے حالات وواقعات کا تذکرہ مقصود ہوتو اکثر و بیشتر ابتداء اس کی ولادت سے کی جاتی ہے، یا اس علاقے کا کچھ تذکرہ کر دیا جاتا ہے جہاں اس کی ولادت ہوئی، اور اس سے متعلق کچھ جغرافیائی تفصیلات ومعلومات درج کر دی جاتی ہیں، یا زیادہ سے زیادہ اس دور اور اس علاقے کے مذہبی، سیاسی ومعاشرتی حالات کا تذکرہ کیا جاتا ہے جن میں اس شخصیت کی ولادت اور پھر نشوونما ہوئی۔

جبکہ رسول اللہ ﷺ کی سیرت مبارکہ اور حیاتِ طیبہ کے بارے میں جب ہم غور وفکر کرتے ہیں تو ہمیں اس حقیقت کا ادراک ہوتا ہے کہ آپ ﷺ کی شان نرالی ہے اور آپؐ کی سیرتِ مبارکہ کا معاملہ بالکل ہی مختلف ہے۔ کیونکہ آپؐ کا مبارک تذکرہ تو آپؐ کی ولادت سے بہت پہلے ہی سے چلا آ رہا تھا، گذشتہ امتوں میں بھی آپؐ کا چرچا تھا، اور آپؐ کی شخصیت گذشتہ انبیائے کرام علیہ السلام کے نزدیک جانی پہچانی تھی، اور اس حقیقت کو جاننے کیلئے کسی تاریخی کتاب کی ورق گردانی کی کوئی ضرورت نہیں، کیونکہ یہ حقیقت تو خود قرآن کریم سے ثابت ہے۔

چنانچہ قرآن کریم میں ارشاد ہے: ﴿وَإِذ أَخَذَ اللّٰهُ مِيثَاقَ النَّبِيّينَ لَمَا آتَيتُكُم مِن كِتَابٍ وَحِكمَةٍ ثُمَّ جَاءَكُم رَسُولٌ مُّصَدِّقٌ لِّمَا مَعَكُم لَتُؤمِنُنَّ بِهٖ وَلَتَنصُرُنَّهٗ

قَالَ أَأَقْرَرْتُم وَأَخَذتُم عَلَىٰ ذٰلِكُم اِصْرِي قَالُوا أَقرَرنَا قَالَ فَاشْهَدُوا وَأَنَا مَعَكُم مِنَ الشَّاهِدِينَ فَمَنْ تَوَلَّىٰ بَعدَ ذٰلِكَ فَأُولَٓئِكَ هُمُ الفَاسِقُونَ﴾ (۱)

ترجمہ: (اور جب اللہ نے نبیوں سے یہ عہد لیا کہ جو کچھ میں تمہیں کتاب وحکمت دوں' پھر تمہارے پاس وہ رسول آئے جو تمہارے پاس موجود کتاب کی تصدیق کرنے والا ہو' تو تم سب اس رسول پر ضرور ایمان لاؤ گے اور اس کی مدد ونصرت کرو گے، فرمایا: کیا تم سب نے اقرار کیا؟ اور اس میرے عہد کو قبول کیا؟ ان سب نے کہا: ہم نے اقرار کیا، فرمایا: پھر اب تم گواہ رہو، اور میں بھی تمہارے ساتھ گواہ ہوں، پھر جو کوئی [اس عہد واقرار کے بعد] پھر جائے تو یقیناً وہی لوگ نافرمان ہیں)۔

یعنی رسول اللہ ﷺ کے بارے میں گذشتہ تمام انبیائے کرام علیہم السلام سے یہ عہد لیا گیا کہ اگر ان کے دور میں ہی آپؐ کا ظہور ہو گیا تو وہ اپنی نبوت چھوڑ کر آپ پر ایمان لائیں گے اور آپؐ ہی کا اتباع کریں گے۔ (۲)

اسی طرح اللہ کے جلیل القدر پیغمبر حضرت ابراہیم علیہ السلام اور ان کے فرزندِ جلیل حضرت اسماعیل علیہ السلام جب اللہ کے حکم کی تعمیل میں دونوں تعمیرِ کعبہ میں مشغول تھے' اس وقت حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اللہ رب العزت سے دعاء ومناجات کے دوران یہ دعاء بھی

(۱) آل عمران: [۸۱-۸۲]

(۲) اس آیت کی ایک تفسیر تو یہی بیان کی گئی ہے۔ لیکن یہاں یہ وضاحت ضروری ہے کہ مفسرین کی ایک بڑی تعداد کے نزدیک اس کی تفسیر یہ ہے کہ تمام انبیائے کرام علیہم السلام سے یہ عہد لیا گیا کہ وہ باہم ایک دوسرے کی تائید ونصرت کریں گے۔ حقیقت یہ ہے کہ دونوں تفسیروں میں کوئی تعارض نہیں ہے اور اس دوسری تفسیر کے ضمن میں ہی پہلی تفسیر بھی خود بخود شامل ہے، کیونکہ تمام انبیائے کرام علیہم السلام کی طرف سے ایک دوسرے کیلئے تائید ونصرت کے عہد میں ہی یقیناً رسول اللہ ﷺ کیلئے تائید ونصرت بھی شامل ہے۔

مانگی:﴿رَبَّنَا وَابعَث فِيهِم رَسُولاً مِّنهُم يَتلُوا عَلَيهِم آيَاتِكَ وَيُعَلِّمُهُمُ الكِتَابَ وَالحِكمَةَ وَيُزَكِّيهِم اِنَّكَ أَنتَ العَزِيزُ الحَكِيمُ﴾(۱)

ترجمہ:(اے ہمارے رب! ان میں انہی میں سے رسول بھیج جو اِن کے پاس تیری آیتیں پڑھے، انہیں کتاب وحکمت سکھائے اور انہیں پاک کرے، یقیناً تو غلبہ والا اور حکمت والا ہے)

قرآن کریم میں ارشاد ہے:﴿هُوَ الَّذِي بَعَثَ فِي الأُ مِّيِّنَ رَسُولاً مِنهُم يَتلُوا عَلَيهِم آيَاتِهٖ وَيُزَكِّيهِم وَيُعَلِّمُهُمُ الكِتَابَ وَالحِكمَةَ وَاِن كَانُوا مِن قَبلُ لَفِي ضَلَالٍ مُّبِينٍ﴾ (۲)

ترجمہ:(وہی ہے جس نے ان ناخواندہ لوگوں میں انہی میں سے ایک رسول بھیجا جو انہیں اس کی آیتیں پڑھ کر سناتا ہے اور ان کو پاک کرتا ہے اور انہیں کتاب وحکمت سکھاتا ہے، اگر چہ یہ اس سے قبل یقیناً کھلی گمراہی میں تھے)

مفسرین اس بات پر متفق ہیں کہ اس سے مراد رسول اللہ ﷺ ہیں، یعنی حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جو دعاء مانگی تھی اس کی قبولیت آپ ﷺ کی بعثت کی شکل میں ہوئی۔

اسی طرح حضرت عیسیٰ علیہ السلام جو کہ رسول اللہ ﷺ سے چھ سو سال پہلے گذرے ہیں' قرآن کریم میں ان کے بارے میں تذکرہ ہے کہ انہوں نے اپنی قوم بنی اسرائیل کو خطاب کرتے ہوئے نبیٔ آخر الزمان ﷺ کے بارے میں یوں خوشبری سنائی:﴿وَاِذقَالَ عِيسىٰ ابنُ مَريَمَ يَا بَنِي اِسرَائِيلَ اِنِّي رَسُولُ اللّٰهِ اِلَيكُم مُصَدِّقاً لِّمَا بَينَ يَدَيَّ مِنَ التَّورَاةِ وَمُبَشِّراً بِرَسُولٍ يَّأتِي مِن بَعدِي اسمُهٗ أَحمَدُ﴾ (۳)

(۱)البقرة[۱۲۹] (۲)الجمعہ[۲] (۳)الصّف[٦]

ترجمہ:(اور جب مریم کے بیٹے عیسیٰ نے کہا کہ اے بنی اسرائیل! میں تم سب کی طرف اللہ کا رسول ہوں، مجھ سے پہلے کی کتاب تورات کی میں تصدیق کرنے والا ہوں اور اپنے بعد آنے والے ایک رسول کی میں تمہیں خوشخبری سنانے والا ہوں جن کا نام احمد ہے)(۱)

رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:(اِنّي عِندَاللّٰهِ مَكتُوبٌ :خَاتَمُ النَّبِيِّينَ وَاِنَّ آدَمَ لَمُنجَدِلٌ فِي طِينَتِهٖ) (۲) ترجمہ:(میں اللہ تعالیٰ کے ہاں اس وقت سے ''خاتم النبیین'' لکھا ہوا ہوں کہ جب آدم علیہ السلام کا خمیر تیار ہو رہا تھا)

یعنی آپ ﷺ علمِ الٰہی میں ازل سے ہی خاتم النبیین تھے جبکہ حضرت آدم علیہ السلام اس وقت تخلیقی مراحل میں تھے۔

نیز رسول اللہ ﷺ کا تذکرہ چونکہ سابقہ کتب سماویہ میں موجود تھا اس لئے اہلِ کتاب آپ کی بعثت و رسالت سے بخوبی واقف تھے اور آپ کی شخصیت ان کے نزدیک خوب جانی پہچانی تھی، قرآن کریم میں متعدد مقامات پر اس بات کا تذکرہ موجود ہے۔

مثلاً ارشادِ ربانی ہے:﴿وَلَمَّا جَاءَ هُم كِتَابٌ مِن عِندَ اللّٰهِ مُصَدِّقٌ لِّمَا مَعَهُم وَكَانُوا مِن قَبلُ يَستَفتِحُونَ عَلَىٰ الَّذِينَ كَفَرُوا فَلَمَّا جَاءَ هُم مَّا عَرَفُوا كَفَرُوا بِهٖ فَلَعنَةُ اللّٰهِ عَلَىٰ الكَافِرِينَ﴾ (۳) ترجمہ:(اور جب اللہ کی طرف سے ایک کتاب [قرآن کریم] ان کے پاس آئی جو تصدیق کرتی ہے اس کتاب [تورات] کی جو ان کے پاس تھی، حالانکہ پہلے یہ خود [اس کے ذریعے] کافروں پر فتح چاہتے تھے، اور

(۱) واضح ہو کہ آپ ﷺ کا نام مبارک محمد بھی ہے اور احمد بھی ہے۔

(۲) مشکاۃ المصابیح [۵۷۵۹] باب فضائل سید المرسلین۔

(۳) البقرہ [۸۹]

جب وہ چیز آ گئی تو باوجود اس کو پہچان لینے کے اس کا انکار کرنے لگے ،اللہ کی لعنت ہو انکار کرنے والوں پر)۔

یعنی یہ یہودِ مدینہ جب کسی جنگ کے موقع پر مشرکین سے شکست کھا جاتے تو دعاء کرتے کہ یااللہ ! آخری نبی کو جلد مبعوث فرما' تاکہ اس کے ساتھ مل کر ہم ان مشرکین پر غلبہ اور فتح حاصل کرسکیں ،یعنی رسول اللہ ﷺ کی بعثت ان کے علم میں تھی اوراس چیز سے خوب واقف تھے ،مگراس کے باوجود محض حسد کی وجہ سے انہوں نے کفرکیا۔

اسی طرح قرآن کریم میں ارشاد ہے:﴿اَلَّذِینَ آتَینَاھُمُ الکِتَابَ یَعرِفُونَہٗ کَمَا یَعرِفُونَ أَبنَاءَ ھُم﴾ (۱) ترجمہ:(جنہیں ہم نے کتاب دی ہے وہ تو اسے [یعنی رسول اللہ ﷺ کو] ایسے پہچانتے ہیں جیسے وہ اپنے بچوں کو پہچانتے ہیں،ان کی ایک جماعت حق کو پہچان کر پھر اسے چھپاتی ہے)

یعنی رسول اللہ ﷺ کی شخصیت اور آپؐ کی حقانیت وصداقت ان اہلِ کتاب کے ہاں اس قدر معروف اور یقینی تھی اور وہ اس طرح آپؐ کو جانتے اور پہچانتے تھے کہ جس طرح بغیر کسی شک وشبہہ کے خود اپنے بچوں کو جانتے اور پہچانتے تھے۔

اسی طرح قرآن کریم میں ارشاد ہے:﴿...... یَجِدُونَہٗ مَکتُوباً عِندَھُم فِي التَّورَاۃِ وَالاِنجِیلِ﴾ (۲) یعنی یہ اہلِ کتاب رسول اللہ ﷺ کا تذکرہ اپنے پاس تورات وانجیل میں لکھا ہوا پاتے ہیں۔

☆......☆......☆

(۱) البقرہ [۱۴۶] (۲) اعراف [۱۵۷]

شہر مکہ......اور......حضرت ابراہیم علیہ السلام

رسول اللہ ﷺ کا آبائی وطن چونکہ مکہ مکرمہ تھا لہٰذا آپؐ کی سیرتِ مبارکہ اور حیاتِ طیبہ کے تذکرہ و بیان کے ضمن میں اس شہر اور اس خطے کا مختصر تذکرہ بھی ضروری ہے، اور جب شہر مکہ کا تذکرہ ہوگا تو ضرور حضرت ابراہیم علیہ السلام کا تذکرہ بھی ہوگا، کیونکہ یہ دونوں لازم وملزوم ہیں۔

شہر مکہ کی اولین آبادی دو پاکیزہ نفوس پر مشتمل تھی، یعنی حضرت اسماعیل علیہ السلام اور ان کی والدہ ''ہاجرؔ''۔(۱)

حضرت اسماعیل علیہ السلام اللہ کے جلیل القدر پیغمبر حضرت ابراہیم علیہ السلام کے فرزند تھے، جنہیں ابوالأنبیاء بھی کہا جاتا ہے، کیونکہ ان کے بعد جتنے بھی نبی آئے وہ سب انہی کی اولاد میں سے تھے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعوت پر ایمان قبول کرنے والوں کی تعداد تو اگرچہ بہت کم تھی، یعنی صرف ان کی اہلیہ حضرت سارہ، دوسری اہلیہ حضرت ہاجر، نیز بھتیجے حضرت لوط علیہ السلام (۲) یہ کل امت تھی حضرت ابراہیم علیہ السلام کی، لیکن اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی طرف سے انہیں مقام ورتبہ بہت ہی بلند عطاء کیا گیا اور ''امام الناس'' کا لقب عطاء کیا گیا۔

قانونِ قدرت یہ ہے کہ جب کسی کو بلند مقام ورتبہ سے نوازنا مقصود ہو تو اس کیلئے آزمائشوں

(۱) ''ہاجَرؔ'' کو اردو دان طبقے میں برصغیر میں عام طور پر حضرت ہاجرہ کہا جاتا ہے۔ (۲) حضرت ابراہیم علیہ السلام کے دونوں صاحبزادوں حضرت اسماعیل اور حضرت اسحاق علیہما السلام کی ولادت تو بعد میں ہوئی، لہٰذا وہ تو پیدائشی ہی مؤمن تھے، جبکہ آپ کی دعوت پر ایمان قبول کرنے والوں کی کل تعداد تین ہی تھی۔

اور ابتلائات کا سلسلہ بھی اسی قدر دشوار اور سخت ہوتا ہے، حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ساتھ بھی یہی معاملہ ہوا، اور ابتلائات کے ایک طویل سلسلہ سے انہیں گذرنا پڑا۔

قرآن کریم میں ارشاد ہے: ﴿وَاِذِ ابْتَلَیٰ اِبرَاهِیمَ رَبُّهٗ بِكَلِمَاتٍ فَأَتَمَّهُنَّ قَالَ اِنِّي جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ اِمَاماً......﴾ (۱)

ترجمہ: (اور جب ابراہیم [علیہ السلام] کو ان کے رب نے کئی کئی باتوں سے آزمایا اور انہوں نے ان سب کو پورا کر دیا تو اللہ نے فرمایا میں تمہیں لوگوں کا امام بنادوں گا......)

یعنی حضرت ابراہیم علیہ السلام متعدد و مختلف قسم کی آزمائشوں سے گذارے گئے اور ہر آزمائش میں کامیاب و کامران رہے، جس کے صلے میں انہیں اللہ کی طرف سے ''امام الناس'' کے عظیم ترین منصب پر فائز کیا گیا، چنانچہ صرف مسلمان ہی نہیں' یہود و نصاریٰ کے نزدیک بھی ان کی شخصیت انتہائی محترم اور پیشوا مانی اور سمجھی جاتی ہے، حتیٰ کہ مشرکینِ عرب کے نزدیک بھی وہ واجب الاحترام تھے، اگرچہ ان کی اپنی امت اور اپنے پیروکار محض تین افراد ہی تھے۔

اسی طرح قرآن کریم میں ارشاد ہے: ﴿وَاِبْرَاهِیمَ الَّذِي وَفَّیٰ﴾ (۲) ترجمہ: (اور وہ ابراہیم جنہوں نے وفاء کی)

یعنی حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اللہ کے ساتھ کئے گئے تمام وعدے وفاء کئے اور ہر آزمائش میں ثابت قدم رہے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کیلئے آزمائشوں کے اس طویل سلسلے کی ابتداء تو خود ان کے گھر سے ہی ہوگئی تھی جب خود ان کے مشرک باپ آزر نے انہیں گھر سے نکال دیا تھا (۳)

(۱) البقرہ [۱۲۴] (۲) النجم [۳۷] (۳) اس واقعہ کی تفصیل سورہ مریم آیات ۴۱۔۵۰ میں موجود ہے۔

اس کے بعد انہیں اپنا وطن چھوڑنا پڑا اور ہجرت کی نوبت آئی، پھر آگ میں ڈالے گئے...... آزمائشوں کے اسی سلسلے کے دوران آپ علیہ السلام کا اپنی اہلیہ محترمہ حضرت سارہ کے ہمراہ ایک ایسے علاقے سے گذر ہوا جہاں ایک بدکردار اور ظالم انسان کی حکمرانی تھی، اس نے اپنے کارندے چھوڑ رکھے تھے جن کے ذمے یہ کام تھا کہ اس علاقے سے گذرنے والے مسافروں اور قافلوں پر نظر رکھیں، اگر کبھی کسی قافلے میں کوئی خوبصورت عورت نظر آئے تو وہ اسے زبردستی اغواء کرلیں اور اس حکمران کے سامنے پیش کریں تاکہ وہ بدبخت اسے اپنی ہوس کا نشانہ بنا سکے۔

جب ان دونوں حضرات یعنی ابراہیم علیہ السلام اور ان کی اہلیہ محترمہ حضرت سارہ کا گذر اس علاقے سے ہوا تو اس بدبخت حکمران کے کارندوں نے حضرت سارہ کو بالجبر اس حکمران کے پاس پہنچا دیا، جبکہ اس عجیب وغریب اور انتہائی پریشان کن اور نازک ترین صورتِ حال میں حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اس مشکل سے نجات کیلئے اللہ سے فریاد اور دعاء ومناجات کا سلسلہ شروع کیا......ان برگزیدہ ہستیوں کا یہی مزاج تھا......یہی ان کا مذہب ومسلک تھا......اور یہی ان کا شیوہ وشعار تھا......کہ...... ہر مشکل سے نجات کیلئے صرف اللہ کے سامنے دعاء وفریاد......اور صرف اسی سے استعانت والتجاء......!

ادھر اس بدبخت شخص نے حسبِ معمول بری نیت اور غلط ارادے سے حضرت سارہ کی طرف دست درازی کی، جس پر اس کا ہاتھ شل ہوگیا، جس پر اسے کچھ اندازہ ہوا کہ شاید یہ کوئی بزرگ خاتون ہیں اس لئے ان کی طرف دست درازی کی وجہ سے مجھے یہ سزا ملی ہے، لہٰذا اس نے ان سے کہا کہ میں وعدہ کرتا ہوں کہ دوبارہ ایسی حرکت نہیں کروں گا، آپ میرے لئے دعاء کیجئے تاکہ میرا ہاتھ ٹھیک ہوجائے، حضرت سارہ نے اس کیلئے دعاء کی،

جس کے نتیجے میں اس کا ہاتھ ٹھیک ہو گیا، مگر فوراً ہی اس نے پھر وہی حرکت کی اور پھر اس کا ہاتھ مفلوج اور شل ہو گیا، اور اب دوبارہ اس نے منت سماجت اور خوشامد شروع کی کہ میرے لئے دعاء کیجئے اور یہ کہ اب میں ایسی حرکت ہرگز نہیں کروں گا، حضرت سارہ نے دوبارہ دعاء کی، جس پر اس کا ہاتھ درست ہو گیا، مگر اب پھر اس نے وہی حرکت کی اور پھر وہی ہوا...... یوں تین بار یہی صورتِ حال پیش آئی، تب اسے یقین ہو گیا کہ یہ تو واقعی کوئی بہت ہی عظیم ترین اور پہنچی ہوئی خاتون ہیں...... اور اس نے سچی توبہ کی اور خوب منت سماجت کی، تب حضرت سارہ کی دعاء کے نتیجے میں اس کا ہاتھ درست ہوا تو اس نے نہ صرف یہ کہ حضرت سارہ کو آزاد کر دیا اور جانے کی اجازت دی بلکہ ایک کنیز بھی بطورِ ہدیہ پیش کی اور خدمت کی غرض سے اسے بھی ان کے ہمراہ روانہ کیا، اس کنیز کا نام تھا ''ہاجرہ''(۱)

چونکہ حضرت ابراہیم علیہ السلام اس وقت تک بے اولاد تھے اور کافی عمر رسیدہ بھی ہو چکے تھے، جس کا حضرت سارہ کو بہت قلق اور رنج تھا اس لئے حضرت سارہ نے اپنے شوہرِ نامدار حضرت ابراہیم علیہ السلام سے یہ اصرار کیا کہ مجھ سے تو آپ کو اولاد کی خوشی مل نہیں سکی...... لہٰذا میری خواہش یہ ہے کہ میں یہ کنیز آپ کو ہبہ کر دوں، یوں شاید اللہ ہمیں اولاد کی نعمت عطاء فرما دے اور ہماری زندگی میں بھی خوشی کا جھونکا آ سکے......!

چنانچہ حضرت سارہ نے خود اصرار کر کے وہ کنیز حضرت ابراہیم علیہ السلام کو ہبہ کر دی، جس کے نتیجے میں اللہ نے انہیں بیٹا اسماعیل (علیہ السلام) عطاء کیا، یوں ہاجرہ ''اُمِ اسماعیل'' بن گئیں۔ اللہ کی قدرت ملاحظہ ہو کہ اس کے بعد حضرت سارہ سے بھی بیٹے یعنی اسحاق (علیہ

(۱) اصل نام ''ہاجر'' تھا، البتہ برصغیر میں اہلِ اردو کے ہاں ''ہاجرہ'' مشہور ہے۔

السلام) کی ولادت ہوئی۔

لیکن اس سے قبل جب حضرت سارہ بے اولاد تھیں جبکہ حضرت ہاجرہ کے ہاں بیٹے کی ولادت ہوچکی تھی...... یہ ایسی صورتِ حال تھی کہ جس کی وجہ سے حضرت ابراہیم علیہ السلام خود اپنے گھر میں ہی بڑی آزمائش کا شکار ہوکررہ گئے اورصورتِ حال اس قدر بگڑی کہ بالآخر حضرت سارہ نے اب یہ اصرار کیا کہ ہاجرہ اوراسماعیل کوان سے دور کردیا جائے۔ جس پر حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ان دونوں کوحضرت سارہ سے الگ کہیں دور بسانے کا فیصلہ کیا۔ چنانچہ وہ ان دونوں کو لئے ہوئے اُس وقت اپنی جائے اقامت یعنی فلسطین سے روانہ ہوئے اور پہاڑوں' بیابانوں اورچٹیل ،میدانوں میں مسلسل سفر کرتے ہوئے آخرایک ویران وسنسان مقام پر پہنچ کررک گئے ،حضرت ہاجرہ اپنے شیرخوار بیٹے اسماعیل کوگود میں لئے ہوئے زمین پر بیٹھ گئیں۔جبکہ حضرت ابراہیم علیہ السلام ابھی بیٹھے بھی نہیں تھے کہ کھڑے کھڑے اچانک مڑے اورواپس چل دیئے ،حضرت ہاجرہ نے پوچھا کہ کہاں چل دیئے آپ......؟ مگرشوہر کی طرف سے کوئی جواب نہیں ملا،دوبارہ پوچھا کہ ہمیں یہاں اس ویرانے میں چھوڑکرآپ کہاں چلے جارہے ہیں......؟ مگراس باربھی کوئی جواب نہیں آیا،آخر تیسری بار پوچھا: کیا آپ کواللہ نے یہ حکم دیا ہے؟ تب حضرت ابراہیم علیہ السلام رک گئے' پلٹ کر پیچھے دیکھااورفرمایا:''ہاں''۔اس پرحضرت ہاجرہ نے کہا:''تب اللہ ہمیں برباد نہیں ہونے دے گا''۔

اس کے بعد حضرت ابراہیم علیہ السلام ان دونوں کوچھوڑکروہاں سے روانہ ہوگئے،کچھ دور چلنے کے بعد جب ان کی نظروں سے اوجھل ہوگئے توایک جگہ رک کر پہاڑی کی اوٹ سے اس مقام کی طرف دیکھتے ہوئے کہ جس کے بارے میں انہیں من جانب اللہ یہ خبردے

دی گئی تھی کہ ''آخر کار یہاں اللہ کا گھر تعمیر ہوگا، جو کہ تمام دنیائے انسانیت کیلئے توحید کا مرکز اور رُشد و ہدایت کا منبع قرار پائے گا......'' خوب گڑگڑا کر اللہ سے دعاء ومناجات میں مشغول ہو گئے۔ (پوری دعاء سورہ ابراہیم میں ملاحظہ ہو، آیات: ۳۵۔۴۱)

☆ اس دعاء میں حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اللہ سے اپنی اولاد کیلئے دین ودنیا کی صلاح وفلاح اور خیر وخوبی کا سوال کیا، مثلاً: امن وامان' سکون واطمینان' شرک اور بت پرستی سے حفاظت' نماز کی پابندی کی توفیق' لوگوں کے دلوں کو ان کی طرف مائل ومتوجہ کر دینا' ان کیلئے رزق کا انتظام' اور پھر اس رزق پر اللہ کا شکر ادا کرنے کی توفیق......!

چنانچہ اس جامع دعاء میں اللہ سے اپنی اولاد کیلئے بیک وقت دین ودنیا دونوں کی خیر وخوبی مانگی۔ اس سے معلوم ہوا کہ اپنی اولاد کیلئے دینی صلاح وفلاح کی دعاء کے ساتھ ساتھ ان کی معاشی بہتری اور دنیاوی خیر وخوبی کیلئے دعاء اور محنت وکوشش توکل علی اللہ یا تعلق مع اللہ کے منافی نہیں ہے، بلکہ یہ تو اُسوۂ انبیاء ہے اور یہی پیغمبرانہ استقامت وحسنِ انتظام کی مثال ہے کہ ایک پہلو کی رعایت کے وقت دوسرا پہلو کبھی نظر انداز نہیں ہوتا۔

چنانچہ اس موقع پر حضرت ابراہیم علیہ السلام اللہ کے حکم کی تعمیل میں اگرچہ اپنے اہل وعیال کو اس ویران وسنسان مقام پر چھوڑ کر وہاں سے روانہ ہو گئے اور یوں حضرت ہاجرہ اور شیر خوار بیٹا اسماعیل ان کی نظروں سے اوجھل تو ضرور ہو گئے......لیکن وہ ان کی رعایت ونگہبانی اور ان کیلئے فکرمندی کے فریضے سے غافل ہرگز نہیں ہوئے، اور خوب گڑگڑا کر اپنے اللہ سے ان کیلئے یوں دعاء وفریاد کی:

﴿رَبّنـا اِنّـي أسـكَـنـتُ مِن ذُرِّيَّتِي بِوَادٍ غَيرِذي زَرعٍ عِندَ بَيتِكَ المُحَرَّمِ رَبَّنَا لِيُقِيمُوا الصَّلَاةَ فَاجعَل أفئِدَةً مِنَ النَّاسِ تَهوِي اِلَيهِمْ وَارزُقهُمْ مِنَ

الثَّمَرَاتِ لَعَلَّهُم يَشكُرُونَ﴾ (۱)

ترجمہ: (اے ہمارے پروردگار! میں نے اپنی کچھ اولاد اس بے کھیتی کی وادی میں تیرے حرمت والے گھر کے پاس بسائی ہے۔اے ہمارے پروردگار! یہ اس لئے کہ وہ نماز قائم رکھیں، پس تو کچھ لوگوں کے دلوں کو ان کی طرف مائل کر دے، اور انہیں پھلوں کا رزق عطاء فرما، تاکہ یہ شکر گذاری کریں)۔

اس کے بعد حضرت ابراہیم علیہ السلام وہاں سے روانہ ہوگئے اور یوں اپنے اس عمل سے ہمیشہ کیلئے دنیائے انسانیت کو یہ پیغام دے گئے کہ جہاں اللہ کے ہر حکم کے سامنے ہر تعلق بے معنیٰ اور ہر رشتہ ہیچ ہے...... وہیں انسان کیلئے یہ بات بھی ضروری ہے کہ شفقتِ پدری کے تقاضے کے مطابق اپنی اولاد کی سلامتی اور دنیوی واخروی صلاح وفلاح کیلئے ہمیشہ خوب گڑگڑا کر اور دل لگا کر اللہ سے دعاء وفریاد کیا کرے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی روانگی کے بعد حضرت ہاجرہ اور ان کا شیر خوار بیٹا اسماعیل دونوں وہیں اس ویرانے میں رہ گئے جہاں کوئی انسان نہیں تھا، جہاں نہ زندگی تھی نہ زندگی کا کوئی نشان......تھوڑی بہت جو خوراک تھی وہ ختم ہوگئی، اب انہیں بھوک اور پیاس نے ستایا، اور شیر خوار بچے نے بری طرح رونا اور بلکنا شروع کر دیا، حضرت ہاجرہ اس ویرانے میں حیران و پریشان پانی کی تلاش میں اِدھر اُدھر نظریں دوڑانے لگیں، قریب ہی ایک ٹیلہ (صفا) نظر آیا، اس خیال سے اس کے اوپر چڑھ گئیں کہ ٹیلے کے اوپر بلندی سے دور دور تک نگاہ جائے گی اور یوں شاید کوئی انسان یا کھانے پینے کا کوئی سامان نظر آجائے، لیکن وہاں ایسی کوئی چیز نظر نہ آئی، سامنے (نصف کلومیٹر کے فاصلے پر) ایک اور ٹیلہ (مروہ) نظر آیا تو

(۱) ابراہیم [۳۷]

صفا سے نیچے اتریں اور دوڑتی ہوئی اس دوسرے ٹیلے پر چڑھ گئیں، لیکن وہاں بھی کچھ نظر نہ آیا تو واپس پھر صفا پر پہنچیں...... یوں ممتا کی ماری ہوئی اس خاتون نے اپنے بچے کیلئے پانی کی تلاش میں اس پہاڑی اور پتھریلی زمین پر دوڑتے ہوئے ان دونوں ٹیلوں کے درمیان مسلسل سات چکر لگائے۔ساتویں چکر کے اختتام پر جب وہ مروہ پر کھڑی ہوئی نہایت بے چینی کے ساتھ اِدھر اُدھر نظر دوڑا رہی تھیں کہ اچانک انہیں ایک آواز سنائی دی، پلٹ کر دیکھا تو بچے کے قریب کسی کو کھڑا ہوا پایا، جو کہ درحقیقت جبریل علیہ السلام تھے، جنہوں نے وہاں اس مقام پر اپنا پر زمین پر مارا کہ جہاں بچہ مسلسل روتے اور بلکتے ہوئے اپنی ایڑیاں رگڑ رہا تھا، تب اللہ کے حکم سے اس سنگلاخ اور پتھریلی زمین میں ''زمزم'' کا چشمہ پھوٹ پڑا...... یوں حضرت ہاجرہ اور ان کے شیر خوار لختِ جگر حضرت اسماعیل علیہ السلام کیلئے من جانب اللہ وہاں زندگی بسر کرنے کا انتظام کر دیا گیا......اور یوں یہ دونوں ماں بیٹا مستقل طور پر اسی جگہ قیام پذیر ہو گئے...... لہٰذا یہی دونوں نفوسِ قدسیہ ہی اُس مقدس ترین بقعۂ زمین یعنی شہر ''مکہ'' کے اولین مکین تھے۔

وقت کا پہیہ چلتا رہا......ایک روز ملکِ یمن سے تعلق رکھنے والے قبیلۂ ''بنو جُرہم'' کا ایک قافلہ جب وہاں سے گذر رہا تھا تو انہوں نے اچانک وہاں ایک پرندہ اڑتا ہوا دیکھا جس پر انہیں حیرت بھی ہوئی اور مسرت بھی، کیونکہ یہ اس بات کی علامت تھی کہ یہاں قرب وجوار میں کہیں پانی موجود ہے۔جبکہ اس سے قبل انہیں یہاں کبھی کوئی پرندہ نظر نہیں آیا تھا اور ان کے علم کے مطابق ماضی میں یہاں پانی کا کوئی نام ونشان نہیں تھا۔جبکہ اب پرندہ اڑتا ہوا نظر آیا تو انہوں نے سرگرمی سے پانی کی تلاش شروع کی جس کے نتیجے میں وہ جلد ہی ''زمزم'' تک جا پہنچے، وہاں حضرت ہاجرہ سے ملاقات ہوئی، تب انہوں نے ان

سے یہ گذارش کی کہ ہمیں یہاں مستقل قیام کی اور اس پانی سے استفادے کی اجازت دی جائے۔غور طلب بات ہے کہ وہ پورا قافلہ تھا،جبکہ دوسری طرف محض ایک عورت اور اس کا کم سِن بیٹا، اگر وہ چاہتے تو زبردستی بھی قبضہ کر سکتے تھے......لیکن انہوں نے ایسا نہیں کیا،اور اعلیٰ اخلاق وکردار کا مظاہرہ کرتے ہوئے محض گذارش کی اور اجازت چاہی۔جس پر حضرت ہاجرہ نے انہیں اس شرط پر اجازت دے دی کہ وہ اس پانی سے استفادہ تو کریں' لیکن اس پر ان کا کوئی ''حق ملکیت''نہیں ہوگا،اور یہ حق بدستور خود ان کے پاس ہی رہیگا۔ چنانچہ اس شرط کو قبول کرتے ہوئے وہ لوگ مستقل وہیں آباد ہوگئے اور یوں مکہ کی آبادی بڑھتی گئی،حتیٰ کہ حضرت اسماعیل علیہ السلام جوان ہوگئے اور ان کی والدہ نے ان کی شادی اسی قبیلہ بنوجرہم میں کرادی۔یوں حضرت ابراہیم علیہ السلام کی نسل کا یہ سلسلہ حضرت اسماعیل علیہ السلام (جو کہ حضرت ہاجرہ سے تھے) کے توسط سے مکہ مکرمہ میں بڑھتا چلا گیا۔ جبکہ دوسری طرف فلسطین میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کی نسل حضرت اسحاق علیہ السلام (جو حضرت سارہ سے تھے) کے توسط سے مسلسل بڑھتی چلی گئی اور آخر یہی لوگ ''بنی اسرائیل'' کہلائے۔

نسب مبارک:

اس سے قبل یہ تذکرہ ہو چکا ہے کہ اللہ کے جلیل القدر پیغمبر حضرت ابراہیم علیہ السلام اور ان کے فرزندِ جلیل حضرت اسماعیل علیہ السلام جب اللہ کے حکم کی تعمیل میں دونوں تعمیرِ کعبہ میں مشغول تھے اس وقت حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اللہ رب العزت سے دعاء ومناجات کے دوران یہ دعاء بھی مانگی تھی: ﴿رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيهِم رَسُولاً مِّنهُم يَتْلُوا عَلَيهِم آيَاتِكَ وَيُعَلِّمُهُمُ الكِتَابَ وَالحِكْمَةَ وَيُزَكِّيهِم اِنَّكَ أَنتَ العَزِيزُ الحَكِيمُ﴾(۱)

ترجمہ: (اے ہمارے رب! ان میں انہی میں سے رسول بھیج جو ان کے پاس تیری آیتیں پڑھے، انہیں کتاب وحکمت سکھائے اور انہیں پاک کرے، یقیناً تو غلبہ والا اور حکمت والا ہے)

چنانچہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی یہ دعاء اسی شہر مکہ میں رسول اللہ ﷺ کی ولادت اور پھر بعثت کی شکل میں پوری ہوئی، جیسا کہ خود قرآن کریم میں ارشادِ ربانی ہے:

﴿هُوَ الَّذِي بَعَثَ فِي الأُمِّيِّينَ رَسُولاً مِنهُم يَتلُوا عَلَيهِم آيَاتِهِ وَيُزَكِّيهِم وَيُعَلِّمُهُمُ الكِتَابَ وَالحِكمَةَ وَاِن كَانُوا مِن قَبلُ لَفِي ضَلَالٍ مُّبِينٍ﴾

ترجمہ: (وہی ہے جس نے ان ناخواندہ لوگوں میں انہی میں سے ایک رسول بھیجا جو انہیں اس کی آیتیں پڑھ کر سناتا ہے اور ان کو پاک کرتا ہے اور انہیں کتاب وحکمت سکھاتا ہے، اگرچہ یہ اس سے قبل یقیناً کھلی گمراہی میں تھے) (۲)

رسول اللہ ﷺ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے فرزند جلیل حضرت اسماعیل علیہ السلام کی نسل

(۱) البقرۃ [۱۲۹] (۲) الجمعہ [۲]

سے تھے۔اور صحت ودرستی کے اعتبار سے اس سلسلۂ نسب کے دو حصے ہیں:

☆ پہلا حصہ آپ ﷺ کے والد عبداللہ سے آپؐ کے اکیسویں پشت کے دادا عدنان سے جاملتا ہے، سلسلۂ نسب کے اس حصے میں کوئی شک وشبہ نہیں ہے، بلکہ آپ ﷺ نے خود یہاں تک اپنا نسب زبانی بیان فرمایا ہے۔(۱)

☆ دوسرا حصہ بائیسویں پشت سے شروع ہوکر باسٹھویں دادا یعنی حضرت ابراہیم علیہ السلام تک ہے، یہ حصہ بھی درست ہے، البتہ اس کی درستی وثقاہت پہلے حصے جیسی نہیں۔

بعض مؤرخین نے باسٹھویں پشت یعنی حضرت ابراہیم علیہ السلام سے اَسّیویں پشت یعنی ابوالبشر حضرت آدم علیہ السلام تک بھی نسب بیان کیا ہے، لیکن اس کی صحت کا درجہ نسبۃً مزید کمزور ہے۔

لہٰذا یہ بات طے ہوگئی کہ آپ ﷺ کا سلسلۂ نسب حضرت ابراہیم علیہ السلام تک بالکل یقینی اور قطعی ہے اور اس میں کسی شک وشبہ کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔(۲)

آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: (اِنَّ اللّٰہ اصطَفیٰ کِنَانَۃَ مِن وَلَدِ اِسمَاعِیلَ، وَاصطَفیٰ قُرَیشاً مِن کِنَانَۃ، وَاصطَفیٰ مِن قُرَیشٍ مِن بَنِي هَاشِم، وَاصطَفَانِي مِن بَني هَاشِم) (۳) ترجمہ: (اللہ نے اسماعیل [علیہ السلام] کی نسل میں سے کنانہ کو منتخب فرمایا، پھر کنانہ میں سے قریش کو منتخب فرمایا، پھر قریش میں سے بنوہاشم کو منتخب فرمایا، اور پھر بنوہاشم میں سے مجھے منتخب فرمایا)۔

(۱) حاشیۃ السیرۃ النبویۃ لابن ہشام ج:۱۔ص:۳۹ (ذکر نسب النبی ﷺ) نیز: دلائل النبوۃ للبیہقی: ۱/۱۸۰، وغیرہ

(۲) یعنی حضرت ابراہیم علیہ السلام تک آپ ﷺ کا نسب یقینی ہے، البتہ اس سلسلۂ نسب میں عدنان تک کا حصہ صحت اور یقین کے اعتبار سے قطعی اور مضبوط تر ہے، بنسبت اس حصے کے جو عدنان سے اوپر ہے......!

(۳) مسلم [۲۲۷٦] کتاب الفضائل، باب فضل النبی ﷺ (کتاب:۴۳، باب:۱)

☆......ہاشم:

رسول اللہ ﷺ کے شجرۂ نسب میں جو نام آئے ہیں ان میں سے متعدد شخصیات تاریخی اعتبار سے کافی شہرت کی حامل ہیں، لیکن چونکہ آپؐ کی نسبت عام طور پر خاندانِ بنو ہاشم کی طرف کی جاتی ہے، لہٰذا اس سلسلۂ نسب کے تفصیلی تذکرے کا آغاز بھی عموماً ''ہاشم'' سے ہی کیا جاتا ہے۔

ہاشم اپنے باپ عبد مناف کی وفات کے بعد قبیلے کے سردار منتخب ہوئے اور متولیٔ کعبہ بھی مقرر ہوئے، یوں کعبۃ اللہ کی خدمت ونگرانی' نیز حُجاج وزُوّار کی خدمت ومیزبانی کا شرف انہیں حاصل ہوا، گویا دنیاوی طور پر قبیلۂ قریش کی سرداری وسربراہی کے ساتھ ساتھ دینی رہنمائی کا اعزاز بھی انہی کے پاس تھا۔

☆......عبدالمطلب:

ہاشم کی وفات کے بعد قبیلے کی سرداری' نیز کعبہ مشرفہ کی خدمت ونگرانی کی ذمہ داری ہاشم کی وصیت کے مطابق ان کے بھائی مطلب بن عبد مناف کے حصہ میں آئی جس نے کچھ عرصہ اس ذمہ داری کو نبھانے کے بعد اپنے بھائی ہاشم کے اس احسان کا بدلہ چکانے کی غرض سے یہ فیصلہ کیا کہ اپنی اولاد میں سے کسی کو اپنا جانشیں مقرر کرنے کی بجائے ہاشم کی اولاد کو یہ شرف لوٹا دیا جائے۔

ہاشم کی ملکِ شام کی طرف تجارت کی غرض سے بکثرت آمدورفت رہتی تھی اور اس سفر کا راستہ یثرب یعنی مدینہ سے گذرتا تھا جہاں اکثر دورانِ سفر ہاشم کا قیام بھی رہتا تھا، جس کی وجہ سے وہاں ان کی اچھی خاصی شناسائی بھی تھی، ایسے ہی ایک سفر کے موقع پر مدینہ میں قیام کے دوران ہاشم نے وہاں مدینہ کے ایک معروف ومعزز خاندان ''بنو نجار'' کی

ایک خاتون سلمٰی بنت عمرو سے شادی کر لی تھی، اور اس شادی کے بعد جلد ہی وہ اپنی منزل یعنی ملکِ شام کی طرف روانہ ہو گئے، جہاں فلسطین کے علاقے ''غزہ'' میں پہنچ کر بیمار پڑ گئے اور پھر وہیں ان کی وفات ہو گئی۔

ادھر ان کی وفات کے بعد مدینہ میں ان کے بیٹے کی ولادت ہوئی جس کا نام اس کی ماں نے شیبہ رکھا (اسے شیبۃ الحمد بھی کہا جاتا تھا)۔ ہاشم کی اس شادی اور پھر اس بیٹے کی پیدائش کے بارے میں مکہ میں ہاشم کے بھائی مُطّلِب کے سوا کسی کو علم نہیں تھا، البتہ مطلب نے بھی کبھی اپنے اس بھتیجے کو دیکھا نہیں تھا۔

اب مُطّلِب کے دل میں بھائی کیلئے احسان مندی کے جذبے کے تحت جب یہ خواہش پیدا ہوئی کہ وہ بھائی کے احسان کا بدلہ چکائے (کیونکہ بھائی نے اسے اپنا جانشیں مقرر کیا تھا) تو اس مقصد کیلئے اس نے سوچا کہ بھائی کے اس بیٹے کو اپنا جانشیں مقرر کرے جو کہ پیدائشی طور پر ہی باپ کی شفقت و محبت سے محروم ہے اور مکہ سے بہت دور گمنامی کی زندگی بسر کر رہا ہے۔ چنانچہ وہ ایک روز اس کی تلاش میں مدینہ جا پہنچا، بھتیجے سے ملاقات ہوئی، اپنے فوت شدہ پیارے بھائی کی اس یادگار پر جب پہلی نگاہ پڑی تو مُطّلِب کی آنکھیں بھر آئیں، اور دیر تک اسے گلے لگائے رکھا...... اس کے بعد آمد کا مقصد بیان کیا اور ساتھ چلنے پر اصرار کیا۔ بھتیجے نے پہلے تو انکار کیا، لیکن جب مُطّلِب نے زیادہ اصرار کیا تو بھتیجے نے کہا کہ میری ماں سے پوچھ لیجئے، میرے بارے میں وہ جو فیصلہ کریں گی وہی آخری فیصلہ ہوگا......! نوجوان کے دل میں ماں کیلئے اتنی اہمیت...... یہ سوچ کر مُطلب کے دل میں بھتیجے کی قدر مزید بڑھ گئی اور اس کی ماں سے اس بارے میں بات کی، لیکن وہ اپنے لختِ جگر کو نظروں سے دور کرنے اور پردیس بھیج دینے پر کسی صورت آمادہ نہ ہوئی۔

مُطّلِب نے منت سماجت کرتے ہوئے کہا کہ تمہارا بیٹا کوئی پردیس نہیں جارہا، بلکہ وہ تو اپنے ہی آباؤاجداد کے شہر'' مکہ'' جارہا ہے، جہاں یہ کسی اجنبی یا پردیسی کی طرح کسمپرسی کی زندگی نہیں، بلکہ اپنے آباؤاجداد کی طرح شان وشوکت کی زندگی بسر کرے گا اور اپنے باپ کی طرح اپنی قوم کا سردار ہوگا......اس پر بھی شیبہ کی ماں راضی نہوئی،تب مُطّلب نے کہا کہ اس سرداری وسربراہی سے بھی بڑھ کر یہ کہ تمہارا یہ بیٹا وہاں اللہ کے گھر کا متولی ہوگا......اس سے بڑا اور کیا شرف ہوسکتا ہے......؟ تب شیبہ کی ماں اسے اس کے چچا کے ہمراہ مکہ بھیجنے پر رضامند ہوگئی، یوں مُطّلِب اپنے فوت شدہ بھائی ہاشم کی اس نشانی کو ہمراہ لئے ہوئے مدینہ سے مکہ کی جانب روانہ ہوگیا۔

یہ سفر طے کرنے کے بعد مُطّلِب جب اپنے بھتیجے شیبہ کو لئے ہوئے مکہ پہنچا تو لوگوں نے دیکھا کہ ان کے سردار کے ہمراہ اونٹ پر ایک نوجوان بھی سوار ہے،تب وہ کہنے لگے کہ دیکھو ہمارا سردار اپنے لئے ایک نیا غلام خرید لایا ہے۔جس پر مطلب نے انہیں تنبیہ کرتے ہوئے کہا کہ یہ کوئی غلام نہیں، یہ میرا بھتیجا ہے،اور یہی تمہارا مستقبل کا سردار بھی ہے، کیونکہ میں نے اسے اپنا جانشیں مقرر کیا ہے۔

اس کے بعد مکہ میں مُطّلِب نے اپنے اس بھتیجے کے ساتھ ہمیشہ اس قدر شفقت ومحبت اور لاڈ پیار کا معاملہ روا رکھا کہ چچا کے اس حسنِ سلوک اور شفقت ومہربانی سے متأثر ہوکر بھتیجے نے زندگی بھر خود کو اپنے اصل نام (شیبہ) کی بجائے''عبدالمطلب''ہی کہلانا پسند کیا......!

یہی عبدالمطلب ہمارے پیارے نبی ﷺ کے دادا محترم ہیں،اور انہوں نے ہی ہمارے نبی ﷺ کا اسمِ گرامی''محمد''تجویز کیا تھا۔

☆......مطلب کی وفات کے بعد ان کے یہ بھتیجے عبدالمطلب قبیلے کے سردار اور متولیٔ کعبہ

مقرر ہوئے، یہ بہت ہی وجیہ اور باوقار انسان تھے، مکہ میں انہیں انتہائی عزت واحترام اور قدر ومنزلت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا، ان کے دور میں دو اہم ترین اور قابلِ ذکر واقعات پیش آئے جن کا مختصر تذکرہ درجِ ذیل ہے:

(۱) زمزم کی کھدائی:

زمزم کا چشمہ تو دراصل اللہ کے حکم سے حضرت ہاجرہ اور ان کے لختِ جگر حضرت اسماعیل علیہ السلام کیلئے جاری کیا گیا تھا، لیکن صدیوں تک جاری رہنے کے بعد ایک مرحلہ ایسا آیا جب مکہ میں کسی قبائلی جنگ کے موقع پر جب مخالف قبیلہ غالب آ گیا تو جاتے جاتے حسبِ دستور مختلف قسم کی لوٹ مار مچانے اور توڑ پھوڑ کرنے کے ساتھ ساتھ ایک حرکت یہ بھی کی کہ زمزم کا کنواں وہ لوگ بند کر گئے، کیونکہ زندگی کا تمام دارومدار تو پانی پر تھا، لہٰذا دشمنی کے طور پر گویا وہ اہلِ مکہ کیلئے زندگی کا سامان ہی برباد کر گئے۔ اور پھر مرورِ زمانہ کے ساتھ نوبت یہاں تک پہنچی کہ لوگ اس کا محلِ وقوع تک بھول گئے کہ یہ کنواں تھا کہاں......؟

آخر عبدالمطلب جب قوم کے سردار اور متولیٔ کعبہ بنے تو ایک رات انہوں نے خواب میں دیکھا کہ کوئی انہیں زمزم کے کنویں کی کھدائی کا حکم دے رہا ہے، جس پر وہ بہت حیران ہوئے، پھر دوسری رات اور پھر اس کے بعد متواتر تیسری رات بھی یہی خواب دیکھا، اور تیسری رات مزید یہ بھی ہوا کہ خواب میں اس شخص نے انہیں زمزم کے کنوئیں کا محلِ وقوع بھی دکھایا......اور حکم دیا کہ اس جگہ کھدائی کرو۔

چنانچہ عبدالمطلب نے اپنے بڑے بیٹے حارث کو ہمراہ لے کر اس مقام پر کھدائی شروع کی، قبیلے والوں کو جب اس بات کا علم ہوا تو وہ سب مصر ہو گئے کہ اس کام میں ہم سب بھی آپ کے ساتھ شریک ہوں گے تا کہ ہم بھی اس شرف اور اعزاز کے حقدار بن سکیں۔ لیکن

عبدالمطلب نے ان کا یہ مطالبہ تسلیم کرنے صاف انکار کردیا، البتہ اس موقع پر ان لوگوں کے شدید اصراراور مسلسل دباؤ کی وجہ سے عبدالمطلب اس قدر پریشان ہوئے کہ انہوں نے منت مانی کہ ''یااللہ اگر تو مجھے دس بیٹے عطاء کرے اور وہ سب جوان ہوکر میرے دست وبازو بن جائیں (تاکہ آئندہ کوئی مجھے اس طرح پریشان کرنے کی جرأت نہ کرسکے) تو میں ان میں سے ایک بیٹا بطورِ شکر تیرے اس گھر کے سامنے قربان کروں گا......''۔

اس سے بخوبی اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ اس سلسلہ میں عبدالمطلب کو اپنی قوم کی طرف سے کس قدر دباؤ کا سامنا کرنا پڑا ہوگا۔

لیکن اس قدر شدید دباؤ کے باوجود فقط یہی دونوں باپ بیٹا ہی اس کھدائی میں مسلسل مشغول رہے، یہاں تک کہ آخر کئی روز کی محنتِ شاقہ کے بعد زمزم کا پانی نمودار ہوگیا، جو کہ آج تک جاری ہے، اور خلقِ خدا اس سے خوب مستفید ہورہی ہے۔

الغرض زمزم کی کھدائی کا کام انہی دونوں باپ بیٹا نے ہی بلاشرکتِ غیرے مکمل کیا، لہٰذا یہ کنواں حضرت ابراہیم علیہ السلام کے فرزندِ جلیل حضرت اسماعیل علیہ السلام کے علاوہ عبدالمطلب کی بھی یادگار رہے۔

(۲) واقعۂ اصحاب الفیل:

دوسرا اہم اور قابلِ ذکر واقعہ جو عبدالمطلب کے دور میں پیش آیا اور جس کا تذکرہ قرآن کریم میں سورۃ الفیل میں بھی موجود ہے، وہ یہ کہ ملکِ یمن کا بادشاہ جس کا نام ابرہہ تھا جب اسے اس بات کا علم ہوا کہ مکہ میں ایک گھر ہے جسے لوگ اللہ کا گھر کہتے ہیں اور اس کی انتہائی تعظیم وتکریم کرتے ہیں تو اس نے اس گھر یعنی کعبۃ اللہ کو منہدم کرنے کا فیصلہ کیا۔

ابرہہ کی طرف سے کعبۃ اللہ کو منہدم کرنے کی اس ناپاک و مذموم خواہش کے پیچھے اصل اور

براہِ راست محرکات واسباب کیا تھے؟ اور پھر یہ کہ جب وہ اس مقصد کیلئے یمن سے روانہ ہوا، اور پھر جب مکہ کی حدود میں پہنچا تو اس دوران کیا کیا ہوا......؟ اس سلسلے میں کافی تفصیل ہے جو کہ کتبِ تاریخ میں مذکور ہے۔

خلاصہ یہ کہ کعبۃ اللہ کو منہدم کرنے کی غرض سے وہ اپنا لشکرِ جرار لئے ہوئے مکہ کی حدود میں داخل ہوا اور کعبۃ اللہ کی طرف پیش قدمی کی، اس لشکر میں بڑی تعداد میں ہاتھی بھی موجود تھے، جو غالباً جنگی مقاصد کیلئے استعمال کے علاوہ مزید یہ کہ کعبۃ اللہ کو منہدم کرنے کی غرض سے بھی لائے گئے تھے۔

جب یہ لشکر مکہ مکرمہ کے مضافات میں منیٰ کے مقام پر پہنچا تو اچانک فضاء میں اللہ کی قدرت سے چھوٹے چھوٹے پرندوں کے غول نمودار ہوئے' ہر پرندے نے اپنی چونچ اور پنجوں میں کنکریاں تھامی ہوئی تھیں، اور اس لشکر کے عین اوپر پہنچ کر ان پرندوں نے وہ کنکریاں ان پر برسادیں، جس سے وہ تمام لشکر ہاتھیوں سمیت نیست ونابود ہو گیا، اور یوں اللہ نے اپنے گھر کی خود حفاظت فرمائی۔

جس سال مکہ مکرمہ میں یہ واقعہ پیش آیا اسی سال وہاں رسول اللہ ﷺ کی ولادت باسعادت ہوئی۔

☆......عبداللہ: (رسول اللہ ﷺ کے والدِ گرامی)

عبدالمطلب نے زمزم کا کنواں کھودتے وقت جو دعاء مانگی تھی وہ قبول ہوئی، اللہ نے انہیں دس بیٹے عطاء کئے، جو سب کے سب جوان ہوئے اور اپنے باپ کے دست وبازو بنے، ان دس جوان بیٹوں میں عبداللہ سب سے خوبصورت اور باپ کے بہت لاڈلے تھے۔

اب عبدالمطلب کو اپنی قسم پوری کرنے کی فکر لاحق ہوئی، بیٹوں کو اپنی قسم کے بارے میں

بتایا تو سب ہی بیٹوں نے باپ کے سامنے سرِ تسلیم خم کر دیا، جس پر قرعہ اندازی کی نوبت آئی، قرعہ کے نتیجے میں سب سے زیادہ لاڈلے اور پیارے بیٹے یعنی عبداللہ کا نام نکلا۔ ایک روز عبدالمطلب اپنے اس لاڈلے بیٹے کو قربان کرنے کی غرض سے جب کعبۃ اللہ کی طرف لے جانے لگے تو گھر سے روانگی کے وقت عبداللہ کی بہنوں کی حالت بگڑ گئی اور وہ زور زور سے رونے لگیں، جس پر وہاں لوگوں کا مجمع اکٹھا ہو گیا، سردارانِ قریش بھی آ پہنچے، ان سردارانِ قریش اور بہت سے عزیز و احباب نے اصرار کیا کہ عبداللہ کو قربان کرنے کی بجائے قسم پوری کرنے کا کوئی اور راستہ تلاش کیا جائے، ان لوگوں کے اس اصرار کے نتیجے میں عبداللہ کے بھائیوں میں سے ابوطالب نے بھی ہمت کی اور والد سے التجاء کی کہ عبداللہ کو قربان نہ کیا جائے......کوئی اور راستہ تلاش کیا جائے......ان سب لوگوں کے شدید اصرار پر عبدالمطلب نے کہا کہ پھر تم ہی لوگ اس مسئلے کا کوئی حل مجھے بتاؤ۔

اس پر ان سب نے طے کیا کہ یثرب (مدینہ) میں جو ایک مشہور کاہنہ رہتی ہے اس سے رجوع کیا جائے وہی اس مسئلے کا کوئی حل بتائیگی۔ چنانچہ یہ لوگ طویل سفر طے کر کے مکہ سے مدینہ پہنچے، وہاں پہنچ کر معلوم ہوا کہ وہ کاہنہ تو آجکل مدینہ سے مزید آگے خیبر گئی ہوئی ہے اور کچھ معلوم نہیں کہ وہاں سے اس کی واپسی کب ہوگی۔ تب یہ لوگ مدینہ سے خیبر پہنچے، کاہنہ سے ملاقات ہوئی، تمام صورتِ حال بیان کی، جسے سن کر اس نے دریافت کیا کہ تمہارے یہاں اگر کوئی کسی کو قتل کر دے تو اس پر مقتول کے ورثاء کو قاتل بطورِ فدیہ (خون بہا) کیا چیز اداء کرتا ہے؟ انہوں نے جواب دیا کہ ہمارے یہاں خون بہا دس اونٹ مقرر ہے۔

یہ سن کر کاہنہ نے کہا کہ ایک طرف عبداللہ اور دوسری طرف دس اونٹ رکھے جائیں اور پھر

ان دونوں کے درمیان قرعہ اندازی کی جائے۔قرعہ اندازی کی گئی،نام عبداللہ کا نکلا،کاہنہ نے کہا کہ دس اونٹ بڑھا دیئے جائیں،یعنی ایک طرف عبداللہ اور دوسری طرف بیس اونٹ،چنانچہ دوبارہ قرعہ اندازی کی گئی،مگر نام عبداللہ کا ہی نکلا...... اس کاہنہ کے کہنے پر ہر بار دس اونٹ بڑھتے رہے ...... اور قرعہ اندازی ہوتی رہی...... آخر جب سو اونٹ ہو گئے اور قرعہ اندازی کی گئی تو قرعہ اونٹوں کے نام نکلا،تب کاہنہ نے کہا کہ عبداللہ کی بجائے ان سو اونٹوں کو قربان کر دیا جائے،یوں قسم پوری ہو جائیگی۔لیکن عبدالمطلب نے مزید اطمینان کیلئے ایک بار پھر قرعہ اندازی کی اور تب بھی اونٹوں کے نام ہی قرعہ نکلا...... تب عبدالمطلب مطمئن ہو گئے اور ہنسی خوشی خیبر سے واپس مکہ پہنچے اور اپنے پیارے اور لاڈلے بیٹے کے عوض سو اونٹ کعبۃ اللہ کے سامنے قربان کئے اور ان کا گوشت اسی جگہ غریبوں اور مسکینوں کیلئے چھوڑ دیا،اور یوں عبدالمطلب بیٹے کی جان بچ جانے پر بھی خوش ہو گئے نیز یہ کہ اب انہیں اس بات کی بھی بیحد خوشی تھی کہ ان کی قسم پوری ہو گئی اور یوں ان کا رب بھی ان سے راضی ہو گیا۔

یوں ہمارے پیارے رسول ﷺ کے سلسلۂ نسب میں قربانی کا واقعہ ایک بار نہیں بلکہ دو بار پیش آیا،پہلی بار حضرت ابراہیم علیہ السلام اور ان کے لختِ جگر حضرت اسماعیل علیہ السلام کے ساتھ'اور دوسری بار عبدالمطلب اور ان کے لختِ جگر عبداللہ کے ساتھ۔

نیز یہ کہ اس واقعے کے نتیجے میں خون بہا دس اونٹوں سے بڑھکر اب سو اونٹ مقرر ہوا جس کے نتیجے میں انسان کی قدر و قیمت بڑھ گئی۔نیز قتل و خونریزی کے واقعات میں بھی کافی کمی آ گئی کہ اب قتل کرنے سے پہلے ہر کوئی بار بار سوچتا کہ اب دس کی بجائے سو اونٹ دینا پڑیں گے......اللہ نے اپنے رسول ﷺ کو'رحمۃ للعالمین' بنانا تھا...... یوں دنیا نے آپ ﷺ کی

ولادت باسعادت سے پہلے ہی اس ''رحمت'' کی جھلک دیکھ لی۔

☆......عبداللہ کی شادی:

قبیلہ قریش کے سردارعبدالمطلب کے لاڈلے بیٹے'ان کی آنکھوں کے نوراوردل کے سرور......یعنی عبداللہ...... جب سواونٹوں کی قربانی کےعوض قربان ہونے سے بچ گئے...... اورزندگی کا سفررواں دواں ہوگیا......تو عبدالمطلب کواپنے اس خوبصورت وخوب سیرت بیٹے کی شادی کی فکر دامن گیر ہوئی۔

قبیلۂ قریش کی جومتعدد شاخیں اور پھران میں جو بہت سے خاندان تھے'ان میں ''بنی زہرہ'' کے نام سے ایک بڑامعزز خاندان تھا،اس خاندان کے سربراہ کا نام ''وہب'' تھا،وہب اپنے حسب نسب' خاندان کی سربراہی وسرداری کے علاوہ شرافت ودیانت اوراعلیٰ اخلاق وکردار کےلحاظ سےبھی بہت معروف تھےاورمعاشرے میں ان کی بڑی قدرومنزلت تھی۔

وہب کی ایک نہایت چہیتی اورلاڈلی بیٹی تھی جوکہ عصمت وعفت اورشرافت ونجابت میں اپنی مثال آپ تھی اوراسی لئے خاندان میں اس کامنفرداورممتاز مقام تھا،اس لاڈلی بیٹی کا نام تھا''آمنہ''۔

عبدالمطلب کی نظرمیں اپنے لختِ جگرعبداللہ کیلئے قبیلۂ قریش کی بہت سی خاندانی لڑکیاں تھیں،لیکن ان کی یہ دلی خواہش تھی کہ کسی طرح عبداللہ کا رشتہ وہب کی اس بیٹی آمنہ کے ساتھ طے ہوجائے۔چنانچہ یہی تمنادل میں لئے ہوئے ایک روزوہ وہب کے گھر پہنچے، مدعیٰ بیان کیا،اپنے بیٹے عبداللہ کیلئے آمنہ کارشتہ مانگا...... جسے وہب نے بخوشی قبول کرلیا۔یوں ہمارے پیارے نبیﷺ کے گرامی قدروالدین رشتۂ زوجیت میں منسلک ہوگئے......!

اس شادی کے محض چند ہفتے بعد عبداللہ اپنے والد کی تجارت کے سلسلے میں ملکِ شام کی طرف جانے والے قافلے کے ہمراہ روانہ ہوگئے، جبکہ اس دوران ان کی اہلیہ محترمہ یعنی ''آمنہ'' ''امانت دارِ نورِ محمدی'' بن چکی تھیں......!

ملکِ شام سے واپسی کے موقع پر راستے میں عبداللہ بیمار پڑ گئے، اور یہ قافلہ جب مدینہ کی حدود میں پہنچا تو ان کی طبیعت اس قدر ناساز ہوگئی کہ وہ مزید سفر جاری رکھنے کے قابل نہ رہے اور مدینہ میں ہی رک گئے (۱) جبکہ قافلہ انہیں چھوڑ کر منزل کی جانب روانہ ہوگیا......

مکہ پہنچ کر قافلے والوں نے عبدالمطلب کو جب بیٹے کی بیماری کی اطلاع دی تو وہ انتہائی پریشان اور فکرمند ہوگئے اور فوراً اپنے بڑے بیٹے حارث کو عبداللہ کی خبر گیری کیلئے مدینہ کی طرف روانہ کیا، حارث انتہائی سرعت کے ساتھ جب یہ طویل سفر طے کر کے مدینہ پہنچے تو معلوم ہوا کہ عبداللہ کی وفات ہو چکی ہے اور انہیں مدینہ کے محلّہ ''دارالنابغہ'' میں دفن کیا جا چکا ہے...... اس پر حارث انتہائی رنجیدہ وافسردہ ہوا، اور فوراً ہی مکہ کی طرف واپس لوٹ گیا، اور مکہ واپس پہنچنے پر اس نے اپنے والد عبدالمطلب کو یہ افسوسناک خبر سنائی......!

انتقال کے وقت جناب عبداللہ کی عمر صرف پچیس برس تھی، جبکہ سیدہ آمنہ کی عمر اس سے بھی کم تھی۔ یوں سیدہ آمنہ اپنے محبوب شوہر کی امانت لئے ہوئے' عین عالمِ شباب میں بیوہ ہوگئیں......جبکہ وہ امانت ابھی اس دنیا میں آئی بھی نہیں تھی۔

(۱) مدینہ میں عبداللہ نے خاندانِ ''بنونجار'' میں قیام کیا تھا، جو کہ ان کی دادی کا خاندان تھا، بعد میں ہجرتِ مدینہ کے موقع پر رسول اللہ ﷺ کی اونٹنی اللہ کے حکم سے جب مسلسل چلتی چلی جارہی تھی، آخر ''بنونجار'' کے اسی محلے میں پہنچ کر خود بخود رک گئی تھی......آپؐ نے وہیں قیام فرمایا تھا اور مسجد نبوی بھی اسی مقام پر تعمیر کی گئی تھی، آپؐ کی مدینہ آمد کے موقع پر بنونجار ہی کی بچیاں نہایت والہانہ انداز میں خیر مقدمی اشعار پڑھ رہی تھیں ''طلع البدر علینا......''

ولادت باسعادت:

رسول اللہ ﷺ کی ولادت باسعادت سے تقریباً پانچ ہزار سال قبل اللہ کے جلیل القدر پیغمبر حضرت ابراہیم علیہ السلام نے تعمیرِ کعبہ کے وقت جو دعاء مانگی تھی، اس دعاء کی قبولیت کا وقت اب آچکا تھا۔

نیز جس مقصد کی خاطر انہوں نے اپنی ذُریت کے ایک حصے کو وہاں اس ویران وسنسان اور بے آب وگیاہ مقام پر چھوڑا تھا...... اس مقصد کی تکمیل کا وقت اب آپہنچا تھا۔

مکہ مکرمہ میں جس سال عام الفیل کا واقعہ پیش آیا، اسی سال اس واقعے کے تقریباً ڈیڑھ ماہ بعد شہرِ مکہ میں آباد خاندانِ بنو ہاشم میں ''آمنہ کے لال'' یعنی ہمارے پیارے نبی ﷺ کی ولادت ہوئی...... موسمِ بہار کی ایک صبح اس مبارک شہر میں ایسا پھول کھلا جس نے اپنی مہک اور خوشبو سے سارے عالَم کو معطر کرنا تھا...... ایک ایسا آفتاب جگمگایا جس نے اپنی روشنی سے تمام کائنات کو بقعۂ نور بنانا تھا...... رشد وہدایت کا ایسا دریچہ کھلا جس نے اس سلسلۂ نبوت کی تکمیل کرنا تھی جس کی ابتداء حضرت آدم علیہ السلام سے ہوئی تھی۔

رسول اللہ ﷺ کی ولادت کے بارے میں تمام اہلِ علم اس بات پر متفق ہیں کہ ماہِ ربیع الأول میں ولادت ہوئی، نیز دن کے بارے میں بھی سب کا اتفاق ہے کہ پیر کا دن تھا۔

البتہ تاریخِ ولادت کے بارے میں اہلِ علم کے متعدد اقوال ہیں، جن کے مطابق تاریخ نو سے بارہ کے درمیان تھی۔ متعدد قدیم وجدید اہلِ علم، مؤرخین، نیز ماہرینِ فلکیات کی نظر میں صحیح ترین تاریخ ۹/ ربیع الأول ہے۔ البتہ عام مشہور یہ ہے کہ آپ ﷺ کا یومِ ولادت ۱۲/ ربیع الأول ہے۔

آپ ﷺ کی ولادت باسعادت کے موقع پر من جانب اللہ متعدد اشارات وبشارات کا ظہور ہوا، مثلاً آپؐ کی والدہ ماجدہ نے آپؐ کی ولادت سے چندروز قبل خواب میں بہت بڑی روشنی دیکھی، نیز آپؐ کی ولادت کے موقع پر بہت بڑا نور دیکھا جس سے اطراف واکناف کی ہر چیز روشن ہوگئی۔اس کے علاوہ بعض عجیب وغریب حالات وحوادث اور غیر معمولی واقعات بھی پیش آئے، مثلاً اس وقت دنیا کی عظیم الشان اور انتہائی طاقتور مملکت یعنی فارس کے سب سے بڑے آتش کدے میں مسلسل ایک ہزار سال سے روشن آگ' جس کی وہ پوجا کیا کرتے تھے' اچانک بجھ گئی، کسریٰ شاہِ فارس کے عظیم الشان اور فلک بوس محل کی چند برجیاں اچانک ٹوٹ کر نیچے آگریں اور زمیں بوس ہوگئیں......!

یہ سب کچھ درحقیقت اس بات کے غیبی اشارے تھے کہ اس نومولود کو اللہ عزوجل کی طرف سے جو دین عطاء کیا جائے گا وہ بہت جلد مشرق ومغرب میں ہر جگہ چھا جائیگا اور قیصر وکسریٰ کی عظیم الشان سلطنتیں عنقریب اس کے قدموں میں ہوں گی......!!

ایامِ رضاعت وطفولت:

☆ ......حلیمہ سعدیہ کی گود میں:

رسول اللہ ﷺ کی ولادت باسعادت کے بعد سب سے پہلے آپؐ کی والدہ ماجدہ سیدہ آمنہ نے اپنے لختِ جگر کو چند روز تک خود دودھ پلایا، اس کے بعد کچھ مدت کیلئے ابولہب کی کنیز ثویبہ نے یہ خدمت انجام دی، اوراس کے بعد یہ شرف قبیلہ بنوسعد سے تعلق رکھنے والی حلیمہ سعدیہ کے حصے میں آیا۔

دراصل مکہ کے شرفاء میں یہ رواج تھا کہ وہ اپنے شیر خوار بچوں کو کچھ عرصہ کیلئے ''بادیہ'' (گاؤں) میں رکھنا پسند کرتے تھے، تاکہ شہر کے آلودہ ماحول سے دور صاف ستھری اور خالص آب وہوا میں بچے کی صحت پر خوشگوار اثرات مرتب ہوں اوراس کی نشو ونما بھی اچھی ہو۔ نیز یہ کہ شہر میں چونکہ بیرونی لوگوں کی بکثرت آمدورفت رہا کرتی ہے، لہٰذا ان کے ساتھ مسلسل اختلاط اور میل جول کی وجہ سے زبان بھی خالص نہیں رہتی اور لب ولہجہ بھی متأثر ہوتا ہے، جبکہ گاؤں والوں کی زبان خالص ہوا کرتی ہے اوراس میں دوسری کسی زبان کی ملاوٹ کا احتمال نہیں ہوتا۔

چنانچہ جن دنوں رسول اللہ ﷺ کی ولادت ہوئی آپؐ کی والدہ ماجدہ نے بھی حسبِ دستور اپنے لختِ جگر کو گاؤں بھیجنے کا ارادہ کیا، اتفاق سے انہی دنوں بادیۂ بنی سعد سے تعلق رکھنے والی کچھ عورتیں بچے گود لینے کی غرض سے شہر مکہ کی جانب روانہ ہوئیں، جن میں حلیمہ سعدیہ بھی تھیں، مکہ پہنچنے کے بعد شہر میں گھوم پھر کر سب ہی عورتوں نے کوئی نہ کوئی شیرخوار بچہ گود لے لیا، جبکہ حلیمہ کو کوئی بچہ نہ مل سکا، البتہ ایک یتیم بچہ تھا جسے کسی عورت نے محض اس

وجہ سے اپنا نا قبول نہیں کیا تھا کہ اس یتیم بچے کو گود لے کر شاید کوئی معقول معاوضہ اور مالی فائدہ نہ مل سکے......اور پھر یتیم بھی ایسا کہ جس نے باپ کا نام تو سنا ہو......مگر آنکھیں باپ کی صورت دیکھنے کو ترستی ہوں......جس کا باپ اس کی پیدائش سے پہلے ہی اس دنیا سے رخصت ہو چکا......!

حلیمہ کو چونکہ کوئی بچہ نہیں مل سکا تھا اس لئے سوچا کہ خالی ہاتھ واپس جانے سے بہتر ہے کہ اس یتیم کو ہی قبول کر لیا جائے، چنانچہ بادلِ ناخواستہ اسے گود لے لیا......جس یتیم بچے کو گود لینے پر حلیمہ رنجیدہ ودلبرداشتہ تھیں اور اس چیز کو اپنی ناکامی تصور کر رہی تھیں...... انہیں کیا خبر تھی کہ بظاہر تو یہ ناکامی تھی......لیکن ایسی ناکامی پر ہزاروں کامیابیاں قربان ہو جائیں......!

حلیمہ خود بھی لاغر وفاقہ زدہ تھیں......لہٰذا بقول ان کے خود ان کے اپنے شیر خوار بیٹے کو کبھی پیٹ بھر کر دودھ پینا نصیب نہیں ہوا تھا، لیکن اُس وقت جب انہوں نے بنو ہاشم کے اس ''دُرِّ یتیم'' کو گود لیا اور پہلی بار اسے اپنا دودھ پلایا تو اس نے خوب سیر ہو کر دودھ پیا اور اس کے بعد دیر تک سوتا رہا، اور تب حلیمہ نے اپنے حقیقی بیٹے کو بھی دودھ پلایا تو پہلی بار اس نے بھی خوب پیٹ بھر کر دودھ پیا اور اس کے بعد وہ بھی دیر تک سوتا رہا...... یہ بات حلیمہ اور ان کے شوہر (حارث بن عبدالعزیٰ) کیلئے انتہائی حیرت انگیز تھی۔ان کی ایک بکری اور ایک اونٹنی بھی اس سفر میں ہمراہ تھی، وہ دونوں بھی فاقہ زدہ تھیں اور ان کا دودھ نہ ہونے کے برابر تھا، لیکن اس روز ان دونوں نے بھی خوب زیادہ دودھ دیا، حلیمہ اور ان کے شوہر نے اس روز خوب جی بھر کر دودھ پیا۔

گاؤں سے مکہ شہر کی طرف آتے وقت کیفیت یہ تھی کہ حلیمہ کی گدھی کمزوری کی وجہ سے سب

سے پیچھے پیچھے چل رہی تھی اور حلیمہ کی سہیلیاں بار بار راستے میں رک کر اس کا انتظار کرتی تھیں......لیکن اب مکہ سے گاؤں کی طرف واپسی کا وقت آیا تو کیفیت یہ ہوئی کہ حلیمہ کی وہی گدھی اس قدر چست اور تیز رفتار ہوگئی کہ سب سے آگے آگے دوڑنے لگی، جس پر حلیمہ کی سہیلیاں بار بار انہیں پیچھے سے پکارتیں کہ حلیمہ رک جاؤ...... کچھ ہمارا بھی تو خیال کرلو......اور بار بار پوچھتیں کہ حلیمہ کیا یہ تمہاری وہی گدھی ہے......؟ حلیمہ جواب دیتیں کہ ہاں یہ وہی تو ہے......اس پر وہ کہتیں کہ وَاللّٰه اِنّ لَها لَشَأناً ...... یعنی ''بخدا آج تو اس کی شان ہی نرالی ہے......!''

اسی طرح گاؤں پہنچنے کے بعد ان کی کھیتی باڑی اور غلہ وخوراک وغیرہ......غرضیکہ ہر چیز میں نہایت تیزی کے ساتھ حیرت انگیز طور پر بہتری اور برکت کے آثار نمایاں ہوتے چلے گئے، خود حلیمہ کی صحت بھی بہت اچھی ہوگئی......جس پر وہ دونوں میاں بیوی انتہائی حیران بھی تھے اور بہت زیادہ خوش بھی، حتیٰ کہ ایک روز حلیمہ کے شوہر نے انہیں کہا: (تَعْلَمِي وَاللّٰهِ يَا حَلِيمَة ! لَقَد أَخَذتِ نَسَمَةً مُبَارَكَة......) یعنی: ''حلیمہ! یقین کرو، بخدا مجھے تو یوں لگتا ہے کہ تم یہ جو بچہ لائی ہو یہ انتہائی مبارک ہے......''! اس پر حلیمہ نے برجستہ جواب دیا: (وَاللّٰهِ اِنّي لَأَرجُو ذَلِكَ) یعنی: ''بخدا مجھے بھی ایسا ہی محسوس ہوتا ہے......''۔

اور یوں حلیمہ سعدیہ اور ان کے افرادِ خانہ کو اس ''دُرِ یتیم'' کی قدر و قیمت کا مکمل ادراک واحساس ہوا اور وہ اس کی بدولت فیوض و برکات کا اپنی کھلی آنکھوں سے مسلسل مشاہدہ بھی کرتے رہے اور خوب مستفید و مستفیض بھی ہوتے رہے......!

دو سال دیکھتے ہی دیکھتے گذر گئے......حلیمہ کا دل بالکل نہیں چاہتا تھا کہ یہ بچہ ان کی آغوش سے واپس چلا جائے، لیکن مدتِ رضاعت پوری ہو چکی تھی، لہٰذا با دلِ ناخواستہ وہ اسے اس

کی والدہ کے پاس مکہ شہر لے گئیں، بچے کی والدہ نے اپنے لختِ جگر کی اتنی اچھی صحت دیکھی تو انتہائی خوش ہوئیں، ماں کی یہ خوشی دیکھ کر حلیمہ نے موقع مناسب سمجھا اور ڈرتے ڈرتے کہا کہ ''آپ دیکھ رہی ہیں کہ گاؤں کی صاف ستھری فضاء میں بچے کی صحت کتنی عمدہ ہے، لیکن اب مجھے یہ فکر ستا رہی ہے کہ کہیں ایسا نہو کہ اب یہاں شہر میں اس کی صحت خراب ہو جائے......اس لئے میں چاہتی ہوں کہ......اگر آپ اجازت دیں تو میں بچے کو مزید کچھ عرصہ کیلئے واپس اپنے ہمراہ لے جاؤں......بی بی آمنہ دیکھ ہی چکی تھیں کہ بادیۂ بنی سعد میں رہتے ہوئے بچے کی صحت خوب عمدہ ہے اور وہاں کی آب وہوا اس کو خوب موافق آئی ہے، نیز انہوں نے اپنے لختِ جگر کیلئے حلیمہ کا جب یہ جذبہ اور پیار بھی دیکھا تو وہ مسکرائیں اور مزید کچھ عرصہ کیلئے بچے کو لے جانے کی اجازت دے دی۔

☆......حادثۂ شقِ صدر:

حلیمہ اس بچے (رسول اللہ ﷺ) کی واپسی پر بہت خوش تھیں، اور یوں بادیۂ بنی سعد میں مزید تین سال (یعنی کل پانچ سال) گذر گئے، لیکن ایک روز نہایت عجیب واقعہ پیش آیا جس کی وجہ سے حلیمہ انتہائی خوفزدہ اور پریشان ہوگئیں۔ ہوا یہ کہ یہ بچہ ایک روز جب گاؤں کے دوسرے ہم عمر بچوں کے ہمراہ کھیل کود میں مشغول تھا کہ اچانک وہاں کوئی اجنبی نمودار ہوا، اور اس نے بچے کو زمین پر لٹا کر اس کا سینہ چاک کر دیا......دوسرے بچوں نے جب یہ منظر دیکھا تو فوراً دوڑتے ہوئے حلیمہ کے گھر پہنچے اور بتایا کہ کسی نے محمد (ﷺ) کو قتل کر دیا ہے۔ حلیمہ انتہائی پریشانی کے عالم میں وہاں پہنچیں تو دیکھا کہ گھبراہٹ کی وجہ سے آپؐ کے چہرے کا رنگ قدرے بدلا ہوا ہے۔

درحقیقت وہ اجنبی شخص جبریل امین علیہ السلام تھے جو اللہ کے حکم سے وہاں آئے تھے،

انھوں نے رسول اللہ ﷺ کا سینہ چاک کر کے قلبِ مبارک باہر نکالا، اور اس میں سے سیاہ نقطے کی مانند جمے ہوئے خون کا ایک چھوٹا سا ٹکڑا نکال کر یہ کہتے ہوئے پھینک دیا کہ ''یہ شیطان کا حصہ ہے'' (یعنی اس حصے کو دل سے نکال کر پھینک دیا تاکہ شیطان کبھی آپؐ پر غالب نہ آ سکے) پھر آپؐ کے دل کو سونے کی طشتری میں رکھ کر آبِ زمزم سے دھویا، اس میں ایمان وحکمت کا جوہر بھرا، اور پھر اسے اسی طرح جوڑ کر سینے میں اس کے مقام پر رکھ دیا۔(۱) دراصل یہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی طرف سے اپنے حبیب ﷺ کیلئے ایک قسم کا روحانی آپریشن اور سامانِ عصمت تھا۔

اس حادثہ کی وجہ سے حلیمہ سعدیہ بہت زیادہ گھبرا گئیں، اور آپؐ کی سلامتی کو مدِ نظر رکھتے ہوئے چندروز بعد آپؐ کو مکہ شہر میں آپؐ کی والدہ ماجدہ کے پاس چھوڑ آئیں۔

☆ ......والدہ کی کفالت میں:

بادیۂ بنی سعد میں تقریباً پانچ سال گذارنے کے بعد آپ ﷺ اپنی والدہ کے سایۂ شفقت میں واپس پہنچ گئے۔ جب چھ سال کے ہوئے تو والدہ نے اپنے شوہرِ نامدار یعنی عبداللہ بن عبدالمطلب سے خلوص ووفاء کے اظہار کے طور پر مدینہ کا سفر کیا، اس سفر میں کمسن بیٹے (یعنی آپ ﷺ) کو بھی یہ سوچ کر ہمراہ لیا کہ بیٹے کو باپ کی شکل دیکھنا تو نصیب نہ ہوسکا...... کم از کم اب اسے باپ کی قبر کی زیارت ہی نصیب ہو جائے۔ اس سفر میں کنیز ام ایمن بھی ہمراہ تھیں، یہ کمسن بچہ اس طویل اور کٹھن سفر میں مناظرِ فطرت کا بغور مطالعہ ومشاہدہ کرتا رہا، اس مختصر قافلے نے مدینہ میں تقریباً ایک ماہ قیام کیا۔(۲)

(۱) ملاحظہ ہو حدیث: انّ رسول اللّٰہ ﷺ أتاہ جبریل و ھو یلعب مع الغلمان ، فصرعه فشقّ عن قلبهٖ فاستخرجه ...... (مسلم: ۲۴۰، کتاب الایمان)۔ (۲) یہ حاشیہ آئندہ صفحہ پر ملاحظہ ہو۔

☆......والدہ کی وفات:

آپ ﷺ کی والدہ بی بی آمنہ مدینہ میں تقریباً ایک ماہ قیام کے بعد جب مکہ کی طرف واپس روانہ ہوئیں تو راستے میں انتہائی تند و تیز اور گرم صحرائی ہواؤں نے آلیا، جس کی وجہ سے شدید بیمار پڑ گئیں، راستے میں علاج کا کوئی انتظام تھا اور نہ ہی راحت و آرام کا کوئی بندوبست...... چندروز کی اس علالت کے بعد آخر مدینہ اور مکہ درمیان ''اَبواء'' نامی مقام پر اس جہانِ فانی سے کوچ کر گئیں......! اور انہیں اسی مقام پر ہی دفن کر دیا گیا۔

کمسن بچے نے اپنی معصوم آنکھوں سے ماں کو یوں پردیس میں نزع اور موت کی کشمکش سے گذرتے دیکھا...... جس سے اس کا گدازِ قلب مزید بڑھ گیا۔

☆......دادا کی کفالت میں:

اُمِ ایمن جو اس سفر میں ہمراہ تھیں، پردیس میں بی بی آمنہ کی علالت اور پھر وفات کے بعد اس کمسن بچے کو ہمراہ لئے ہوئے واپس مکہ پہنچیں اور وہاں اسے اس کے دادا عبدالمطلب کے حوالے کر دیا...... یہ بچہ اس سفر کیلئے ماں کی انگلی تھامے ہوئے جب گھر سے روانہ ہوا تھا

بقیہ از حاشیہ صفحہ گذشتہ:

(۲) آپ ﷺ جب بعد میں مکہ سے ہجرت کر کے مدینہ پہنچے اور وہاں مستقل قیام کیا، تب ایک روز آپؐ جب بنونجار کے ایک محلے سے گذر رہے تھے آپؐ کی نگاہ اس مکان پر پڑی جہاں آپؐ نے بچپن میں اپنی والدہ ماجدہ کے ہمراہ سفرِ مدینہ کے موقع پر قیام کیا تھا، اتنا عرصہ گذر جانے کے باوجود آپؐ نے اس مکان کو پہچان لیا، اور پھر سن آٹھ ہجری میں فتحِ مکہ کی غرض سے مدینہ سے مکہ کی جانب سفر کے دوران راستے میں ابواء نامی مقام پر آپؐ اپنی والدہ کی قبر پر بھی گئے، اور وہاں خوب روئے، جیسا کہ حدیث کے الفاظ ہیں زارَ النّبِيّ ﷺ قبرَ أمِّهِ فَبَكَىٰ وَ أبكَىٰ مَن حَولَهُ ...... ''یعنی آپؐ نے اپنی والدہ کی قبر کی زیارت کی اور تب آپؐ خود بھی روئے اور دوسروں کو بھی رلایا......'' (مسلم: ۹۷۶، کتاب الجنائز)۔

تب سر پر باپ کا سایہ نہ تھا......اوراب اس طویل اورتھکا دینے والے سفر کے بعد جب واپس مکہ میں اپنے گھر پہنچا تو کیفیت یہ تھی کہ ماں کی ممتا سے بھی محروم ہو چکا تھا......!

یوں ہمارے پیارے رسول ﷺ اپنی پیاری ماں کی وفات کے بعد اب اپنے دادا محترم یعنی جناب عبدالمطلب کی کفالت میں آ گئے، اُس وقت آپؐ کی عمر مبارک چھ سال تین ماہ اور دس دن تھی۔(۱)

دادا نے جب اپنے اس یتیم پوتے کو اپنے دامنِ کفالت وتربیت میں لیا تو جی بھر کر اسے پیار دیا، اسے اپنی جان سے بھی زیادہ عزیز رکھا، اور اپنے بچوں سے بھی بڑھ کر اس کے ساتھ ہمیشہ لاڈ اور پیار کیا، وہ آپ ﷺ کو ہمیشہ اپنے ساتھ بٹھا کر کھانا کھلاتے، دن بھر آپ ﷺ کو اپنے ساتھ ہی رکھتے، اور رات کو جب آپ ﷺ سو جاتے تو وہ بار بار اٹھ کر آپ ﷺ کی خبر گیری کیا کرتے۔

عبدالمطلب چونکہ اپنے قبیلہ کے سردار ہونے کے علاوہ متولیٔ کعبہ بھی تھے اس لئے کعبۃ اللہ کے قریب ان کیلئے خاص مسند بچھائی جاتی تھی جس پر کبھی کسی کو بیٹھنے کی جرأت نہوتی، یہاں تک کہ ان کے اپنے بیٹے بھی جب وہاں آتے تو اس مسند کے آس پاس بیٹھ جاتے...... مگر آپ ﷺ کو عبدالمطلب ہمیشہ اس مسندِ خاص پر اپنے ساتھ ہی بٹھاتے، اگر کبھی کوئی آپ ﷺ کو وہاں سے اٹھانے کی کوشش کرتا تو عبدالمطلب یوں کہتے: دَعُــوا اِبنِي ! فَوَاللّٰهِ اِنَّ لَهٗ لَشَأناً...... یعنی: ''میرے بیٹے کو یہیں بیٹھا رہنے دو، کیونکہ اللہ کی قسم اس کی تو شان بڑی ہی نرالی ہے......''، اور ساتھ ہی فرطِ محبت سے آپ ﷺ کی پشت پر ہاتھ پھیرتے اور آپ ﷺ کے اس اندازِ شاہانہ اور استغناء کو دیکھ کر خوش ہوا کرتے۔

(۱) الفصول فی سیرۃ الرسول ﷺ، از: ابن کثیر، صفحہ: ۹۳۔

لیکن آپؐ دادا کی اس شفقت سے بھی جلد ہی محروم ہو گئے جب بیاسی سال کی عمر پا کر یہ شفیق ومہربان دادا بھی راہیٔ ملکِ عدم ہو گئے، اور مکہ مکرمہ میں محلّہ حجون میں دفن ہوئے۔

جب ان کا جنازہ اٹھا تو آپ ﷺ بھی ساتھ تھے، شدتِ غم اور فرطِ محبت سے اُس وقت آپؐ جنازے کے ہمراہ روتے جا رہے تھے......!

اُس وقت آپؐ کی عمر مبارک صرف آٹھ سال دو ماہ اور دس دن تھی۔(۱)

☆......ابوطالب کی کفالت میں:

رسول اللہ ﷺ کے دادا محترم عبدالمطلب نے وفات سے قبل وصیت کی تھی کہ ان کے بعد آپؐ کی کفالت وتربیت آپؐ کے چچا ابوطالب کے ذمہ ہوگی، چنانچہ ابوطالب نے اس عظیم ذمہ داری کو بہت ہی احسن طریقے سے تا دمِ آخر نبھایا، آپؐ سے وہ اس قدر محبت رکھتے تھے کہ آپؐ کو ہمیشہ اپنی اولاد سے بڑھکر چاہا اور اپنے بچوں پر مقدم رکھا، جب سوتے تو آپؐ کو ساتھ لے کر سوتے، اور جب باہر جاتے تو آپؐ کو ساتھ لے کر جاتے۔

یوں زندگی کے دن گذرتے رہے...... وقت کا پہیہ چلتا رہا...... اور آپؐ ابوطالب کی زیرِ سرپرستی بچپن اور کم سنی کی حدود سے گذرنے کے بعد اب لڑکپن کی عمر میں داخل ہو گئے اور اب کچھ ہوش سنبھالا تو محسوس کیا کہ چونکہ آپؐ کے مشفق ومحسن چچا قلیل المال اور کثیر العیال ہیں' لہٰذا تلاشِ معاش کے سلسلہ میں ان کا ہاتھ بٹانا چاہئے۔ چنانچہ اس جذبے کے تحت آپؐ نے اس دور میں بکریاں بھی چرائیں اور محنت ومشقت بھی کی۔(۲)

(۱) البدایۃ والنہایۃ لابن کثیر، وغیرہ۔

(۲) یہاں یہ تذکرہ بھی ہو جائے کہ ابوطالب کی معاشی تنگ دستی کی بڑی وجہ یہ تھی کہ وہ متولی کعبہ بھی تھے، حجاج کی خدمت' دیکھ بھال اور مہمان نوازی انہی کے ذمہ تھی، جسے اس دور کے رواج کے مطابق وہ اپنے لئے بڑا فخر سمجھتے تھے اور اس راہ میں بڑی فراخدلی کے ساتھ اپنا مال خرچ کیا کرتے تھے۔

مرحلۂ شباب:

☆......تجارت:

چونکہ مکہ اوراس کے مضافات میں زراعت کا کہیں کوئی وجود نہیں تھا' لہٰذا قریش کی معیشت کا تمامتر انحصار تجارت پر تھا۔بنو ہاشم کے جدامجد یعنی خود ہاشم کا بھی یہی ذریعۂ معاش تھا، اوراب ابوطالب کا بھی یہی پیشہ تھا۔

رسول اللہ ﷺ نے بچپن اور پھرلڑکپن کی منزلیں طے کرنے کے بعدنوجوانی کے مرحلے میں جب قدم رکھاتو آپؐ نے بھی تجارت کوہی اپناذریعۂ معاش بنایا،اوراس دورمیں اپنے سرپرست اورمشفق چچاابوطالب کے ہمراہ آپؐ نے متعددتجارتی سفربھی کئے۔ان دنوں تجارت کے حوالے سے چہارسوآپؐ کے حسنِ معاملہ' راست بازی اورامانت ودیانت کے چرچے ہونے لگے،اپنے اور پرائے' دوست ودشمن سبھی آپؐ کو''صادق وامین'' کے لقب سے پکارنے لگے......!!

☆......حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا سے نکاح:

خدیجہ بنت خویلدانتہائی شریف النفس اورصاحبِ حیثیت خاتون تھیں،مکہ میں ان کا خاص مقام ورتبہ تھااورقریش کےعوام وخواص سبھی انہیں نہایت عزت وعظمت کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔

حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کا سلسلۂ نسب پانچویں پشت میں رسول اللہ ﷺ کے خاندان سے جاملتا ہے،وہ بیوہ تھیں،اپنی شرافتِ نفس' پاکیزگیٔ اخلاق اورعفت وعصمت کی وجہ سے زمانۂ جاہلیت میں بھی لوگ انہیں''طاہرہ'' کےلقب سے پکارا کرتے تھے۔

حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کا کاروبار اس قدر وسیع پیمانے پر تھا کہ اہلِ مکہ کا جب کوئی تجارتی قافلہ روانہ ہوتا تو اس میں اکثریت حضرت خدیجہؓ کے مال واسباب سے لدے ہوئے اونٹوں کی ہوتی، اپنے کاروباری امور کی انجام دہی ونگرانی کی غرض سے حضرت خدیجہ مختلف اشخاص کی خدمات حاصل کیا کرتی تھیں۔

انہی دنوں حضرت خدیجہؓ کو جب رسول اللہ ﷺ کی راست بازی اور امانت ودیانت کی خبریں ملیں تو انہوں نے آپؐ کو یہ پیغام بھجوایا کہ آئندہ جو تجارتی قافلہ مکہ سے ملکِ شام کیلئے روانہ ہوگا اس کی نگرانی آپؐ کریں، ساتھ ہی معقول معاوضے کا بھی وعدہ کیا۔

آپ ﷺ نے اپنے سرپرست ومشفق چچا ابوطالب سے مشورے کے بعد اس پیشکش کو قبول فرمایا اور سفرِ شام کیلئے تیار ہوگئے۔

چنانچہ آپ ﷺ حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کا مالِ تجارت لے کر ملکِ شام کی طرف روانہ ہوئے، توفیقِ الٰہی سے اس سفر میں بہت زیادہ منافع ہوا۔ حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا نے ''میسرہ'' نامی اپنا ایک غلام بھی اس سفر میں آپؐ کے ہمراہ روانہ کیا تھا، اس نے واپس مکہ پہنچنے پر حضرت خدیجہؓ کے سامنے آنکھوں دیکھا حال بیان کیا، آپؐ کی راست بازی، معاملہ فہمی، پرہیز گاری، امانت ودیانت، فہم وفراست، حسنِ تعامل، ودیگر صفاتِ حمیدہ کا تذکرہ کیا، یہ سب کچھ حضرت خدیجہ کیلئے انتہائی فرحت ومسرت اور اطمینان کا باعث بنا۔

حضرت خدیجہؓ اس سے قبل دوبار بیوہ ہوچکی تھیں، ان کا پہلا نکاح عتیق مخزومی سے' اور پھر اس کی موت کے بعد دوسرا نکاح ہند تمیمی سے ہوا تھا۔

دوسری بار بھی جب وہ بیوہ ہوگئیں تو ان کے مقام ورتبے اور مال ودولت کی وجہ سے بڑے بڑے سردارانِ قریش متعدد بار انہیں پیغامِ نکاح بھجوا چکے تھے، لیکن حضرت خدیجہؓ اپنی

ذہانت وفہم وفراست کی وجہ سے اس حقیقت کوخوب جان چکی تھیں کہ ان میں سے کوئی بھی مخلص نہیں ہے، یہ سبھی لوگ لالچی اور محض مال و جمال کے بھوکے ہیں......اسی لئے وہ ایسے تمام پیغامات کورد کرچکی تھیں۔

ایسے میں رسول اللہ ﷺ جب حضرت خدیجہؓ کا مالِ تجارت لے کر گئے اوراس سفرمیں منافع بہت زیادہ ہوا...... اورپھر یہ کہ سفرسے واپسی پرآپؐ نے حضرت خدیجہؓ کواس تجارت کا حساب وکتاب پیش کیا......اورچپ چاپ چل دیئے......!

حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا بس سوچتی ہی رہ گئیں کہ کس قدر عجیب وغریب ہے یہ نوجوان ......کس قدرسچااورمخلص ہے یہ انسان......کس قدر سچی اورصاف ستھری ہے اس کی تجارت......کتنی معصومیت ہےاس کی ہرادامیں......دوسروں کی بنسبت منافع کس قدرزیادہ لایاہے......لیکن معاوضے کے معاملے میں کوئی تقاضانہیں......کوئی مطالبہ نہیں......کوئی بحث وتکرارنہیں......معاوضہ جوملابس چپ چاپ قبول کرلیا......!

حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کیلئے یہ سب کچھ انتہائی باعثِ حیرت تھا......ایک طرف مسلسل پیغامات بھیجنے والے بڑے بڑے سردارانِ قریش جوکہ دراصل حرص وطمع کے مارے ہوئے اورمال وزرکے پجاری تھے...... اوردوسری طرف سیدھاسادھا ،سچا ،مخلص اوراس قدرقناعت پسند،متوکل وقانع قسم کا یہ نوجوان......!

حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کوآپ ﷺ کی یہی ادابھا گئی ،اوروہ سمجھ گئیں کہ یہی توان کی وہ متاعِ گمشدہ ہے جس کی وہ مدت سے متلاشی تھیں......!

تب حضرت خدیجہؓ نے اپنے دل کی بات اپنی ایک خاص رازدار سہیلی نفیسہ بنت مُنَبِّہ سے کہی ،اورانہیں آپ ﷺ کی طرف پیغامِ نکاح لے کرجانے کوکہا۔نفیسہ نے یہ پیغام آپؐ

تک پہنچایا،جس پر آپ ﷺ نے اپنے چچاؤں خصوصاً جناب ابوطالب اور حضرت حمزہؓ سے مشورہ کیا،ان دونوں نے اس رشتے کی تائید کی،اور پھر یہ دونوں آپ ﷺ کی طرف سے اظہارِ رضامندی کے طور پر حضرت خدیجہؓ کے چچا عمرو بن اسد کے پاس پہنچے اور آپ ﷺ کی طرف سے رضامندی کی انہیں اطلاع دی،اور یوں آپ ﷺ اور حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا اس رشتۂ ازدواج میں منسلک ہوگئے،اور یہ مبارک ترین رشتہ حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کی وفات تک،یعنی مسلسل پچیس برس قائم رہا۔

رسول اللہ ﷺ کی یہ پہلی شادی تھی،جبکہ حضرت خدیجہؓ اس سے قبل دوبار بیوہ ہوچکی تھیں،اس شادی کے وقت آپ ﷺ کی عمر مبارک پچیس سال،جبکہ حضرت خدیجہؓ کی عمر چالیس سال تھی۔

بعض فضائلِ اُم المؤمنین حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا:

ام المؤمنین حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کے مقام ورتبے کا اندازہ اس بات سے بخوبی کیا جاسکتا ہے کہ ایک بار جبریل امین علیہ السلام جب رسول اللہ ﷺ کے پاس تشریف لائے تو فرمایا:(يَا رَسُولَ اللّه ! هٰذهٖ خديجة قَد أتَت ، مَعَهَا اِنَاء وَ طَعَام، فَاِذا أتَتكَ فَاقرَأ عَلَيهَا السَّلَامَ مِن رَبِّهَا وَمِنِّي، وَبَشِّرهَا بِبيت فِي الجَنَّة مِن قَصَب، لَاصَخَبَ فِيهِ وَلَا نَصَب) (۱)یعنی:(اے اللہ کے رسول!یہ خدیجہ چلی آرہی ہیں،ایک برتن اور کچھ کھانا لئے ہوئے...... جب وہ آپ کے پاس آئیں تو آپ انہیں ان کے رب کی طرف سے،نیز میری طرف سے سلام کہیں،اور انہیں جنت میں ایسے گھر کی خوشخبری بھی سنائیں جو ہیرے کا بنا ہوا ہے،اس گھر میں نہ کوئی شور وشغب ہوگا اور نہ

صحیح بخاری[۳۸۲۰ کتاب المناقب،باب تزویج النبی ﷺ خدیجۃ وفضلھا۔نیز[۷۴۹۷] کتاب التوحید۔

ہی کوئی تھکاوٹ)۔

حقیقت یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے ساتھ اس مبارک رشتۂ ازدواج میں منسلک ہوجانے کے بعد حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا پچیس برس تک مسلسل آپ ﷺ کیلئے خلوص ووفاء کا پیکر بنی رہیں، زندگی بھر آپ ؐ کی خدمت واطاعت' آپ ؐ کے ساتھ حسنِ سلوک اورعزت واحترام کی نادرمثال قائم کی۔جبکہ آپ ﷺ کو بھی حضرت خدیجہ ؓ سے بے پناہ محبت تھی،آپ ؐ نے ان کی زندگی میں اورکوئی نکاح نہیں کیا،ان کی وفات کے بعد آپ ؐ زندگی بھرانہیں یادکرتے رہے اورمختلف مواقع پرنہایت بیتابی کے ساتھ ان کا ذکرِخیرکرتے رہے۔

ایک موقع پرآپ ﷺ نے حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کا تذکرہ ان الفاظ میں فرمایا:

(...... آمَنَتْ بِي إذ كَفَرَ بِي النّاسُ، وَصَدَّقَتنِي اذ كَذَّبَنِي النّاسُ، وَ وَاسَتنِي بِمَالِهَا اذ حَرَمَنِي النّاسُ، وَرَزَقَنِي اللّهُ مِن أولَادِها اذ حَرَمَنِي أولَادَ النّاسِ......)(۱)

یعنی:''خدیجہ نے اس وقت مجھ پرایمان قبول کیاجب لوگوں نے میرے ساتھ کفرکیا،میری تصدیق کی جب لوگوں نے میراانکارکیا،اپنے مال کے ذریعے میری مددکی جب لوگوں نے مجھے محروم رکھا،نیزیہ کہ اللہ نے مجھے اولادبھی انہی سے عطاءفرمائی......!''

☆......**مختصرتذکرۂ اولادِ نبی ﷺ ازحضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا:**

آپ ﷺ کی تمام اولادبھی حضرت خدیجہ ؓ سے ہی تھی۔سوائے ابراہیم کے جوحضرت ماریہ قبطیہ ؓ سے تھے،جن کی پیدائش بہت بعدمیں مدینہ منورہ میں ہوئی،اوروہیں تقریباً ڈیڑھ

(۱)مجمع الزوائد[۹/۲۲۷]

سال کی عمر میں وفات بھی ہوئی)

جبکہ آپ ﷺ کی باقی تمام اولاد حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کے بطن سے ہی تھی۔یعنی :

قاسم،زینب،رقیہ،ام کلثوم،فاطمہ،اورعبداللہ،رضی اللہ عنہم اجمعین۔

دونوں بیٹے قاسم اورعبداللہ بچپن میں ہی وفات پا گئے،جس پر مشرکینِ مکہ باہم یوں کہنے لگے کہ محمد(ﷺ) کی کوئی اولادِ نرینہ تو ہے نہیں،صرف بیٹیاں ہی ہیں......لہٰذا ہمیں ان کے اس نئے دین کی مقبولیت اور ہردم بڑھتی ہوئی شہرت سے پریشان ہونے کی ضرورت ہی نہیں...... کیونکہ ان کے بعدان کی نسل کا خاتمہ ہوجائے گااورکوئی ان کا نام لیوانہیں رہیگا......اور یوں ان کا یہ دین بھی خود بخود ختم ہوجائے گا......!

اس پرسورۃ ''الکوثر'' نازل ہوئی،جس میں اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی جانب سے اپنے حبیب ﷺ کی دلجوئی وتسلی کی غرض سے یہ خبر دی گئی کہ ''ابتر'' یعنی ''بے نام ونشان'' آپؐ نہیں، بلکہ آپؐ کوطعنہ دینے والے یہ بدبخت خود بے نام ونشان ہوجائیں گے......!!

چنانچہ حقیقت یہی ہے کہ چودہ سوبتیس سال گذرجانے کے باوجودآج بھی دنیاکے کونے کونے میں آپؐ کے نام لیواموجود ہیں،جن کی آپؐ کے ساتھ والہانہ عقیدت ومحبت کا یہ عالم ہے کہ آپؐ کا نامِ نامی اوراسمِ گرامی سنتے ہی ان کے دل کی دھڑکنیں تیز ہونے لگتی ہیں...... جذبات بے قابوہونے لگتے ہیں ...... اور......فرطِ عقیدت کی وجہ سے ان کی آنکھوں سے بے اختیارآنسوبہنے لگتے ہیں...... آج بھی مشرق ومغرب ...... شمال اورجنوب...... دنیاکے ہرگوشے میں چہارسوپھیلی ہوئی ان بیشمارمساجدکےعظیم الشان اور بلندوبالا میناروں سے روزانہ پانچ بارمؤذن پکارتاہے......اشہدأن لاالٰہ الااللہ...... اشہدأن محمداًرسول اللہ...... اور یہ سلسلہ تو تاقیامت جاری رہے گا......!

جبکہ آپؐ کو بے نامی کا طعنہ دینے والے وہ دشمن آج خود بے نام ونشان ہیں......!!

☆ آپ ﷺ کی صاحبزادیوں میں سے بڑی صاحبزادی حضرت زینب رضی اللہ عنہا کی شادی آپ ﷺ کی بعثت سے قبل حضرت خدیجہؓ کی خواہش پر ابوالعاص بن الربیعؓ سے ہوئی جو کہ حضرت خدیجہ کی بہن ہالہ بنت خویلد کے بیٹے تھے۔ ابوالعاصؓ نے سن چھ ہجری میں اسلام قبول کیا اور ہجرت کی، ان کا ایک بیٹا علی تھا جو کمسنی میں فوت ہو گیا تھا (فتحِ مکہ کے یادگار ترین اور تاریخی موقع پر یہی کمسن لڑکا رسول اللہ ﷺ کے ہمراہ اونٹنی پر سوار تھا) جبکہ ان کی ایک بیٹی بھی تھی جس کا نام اُمامہ تھا، آپؐ اس کے ساتھ بہت زیادہ محبت وشفقت کا معاملہ فرمایا کرتے تھے (حتیٰ کہ بعض اوقات اسے گود میں اٹھائے ہوئے ہی نماز بھی پڑھ لیا کرتے تھے)۔

☆ دوسری صاحبزادی حضرت رقیہ رضی اللہ عنہا کی شادی بعثت سے قبل ابولہب کے بیٹے عتبہ سے' جبکہ تیسری صاحبزادی حضرت ام کلثوم رضی اللہ عنہا کی شادی ابولہب کے دوسرے بیٹے عتیبہ سے ہوئی تھی، اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی طرف سے حکم: ﴿وَأَنْذِرْ عَشِيرَتَكَ الْأَقْرَبِينَ﴾ (۱) (یعنی: ''آپؐ اپنے قریبی رشتے داروں کو [اللہ کے عذاب سے] ڈرایئے'') کے نزول کے بعد جب آپؐ نے کوہِ صفا پر بنوہاشم کو جمع کیا اور اللہ کا پیغام پہنچایا تو اس موقع پر ابولہب نے کہا: تَبّاً لَكَ ! أَمَا دَعَوتَنَا اِلّا لِهٰذا......؟ یعنی (نعوذ باللہ) اے محمد! تم ہلاک جاؤ، کیا تم نے ہمیں اسی لئے یہاں بلایا تھا......؟ (۲) ابولہب کی اس بیہودہ گوئی پر آپؐ انتہائی رنجیدہ ودل گرفتہ ہوئے، جس پر آپؐ کی تسلی ودلجوئی کیلئے سورۃ المسد ﴿تَبَّتْ يَدَا أَبِي لَهَب وَتَبَّ......﴾ نازل ہوئی (یعنی: ''ٹوٹ

(۱) الشعراء [۲۱۴] (۲) صحیح بخاری کتاب التفسیر، سورۃ المسد۔

جائیں ابولہب کے دونوں ہاتھ اور وہ خود بھی ہلاک ہوجائے......'')

اس پر ابولہب مشتعل ہوگیا اور اس نے اپنے دونوں بیٹوں عتبہ اور عتیبہ کو حکم دیا کہ وہ آپؐ کی صاحبزادیوں (حضرت رقیہؓ، وحضرت ام کلثومؓ) کو طلاق دے کر گھر سے نکال دیں، چنانچہ انہوں نے ایسا ہی کیا۔

کچھ عرصہ گذرنے کے بعد آپؐ نے اپنی صاحبزادی حضرت رقیہؓ کی شادی اپنے جلیل القدر صحابی حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ سے کردی، ان دونوں نے پہلے مکہ سے حبشہ کی جانب ہجرت کی، اور پھر چند سال بعد ایک غلط فہمی کے نتیجے میں حبشہ سے مکہ کی جانب واپسی ہوئی، اور پھر ہجرتِ مدینہ کا حکم نازل ہونے کے بعد مکہ سے مدینہ کی جانب ہجرت کی، سن دو ہجری میں عین غزوۂ بدر کے روز مدینہ میں ان کا انتقال ہوگیا۔(۱)

تب آپؐ نے اپنی دوسری صاحبزادی حضرت ام کلثومؓ کا نکاح حضرت عثمانؓ بن عفان سے کرادیا، اور اسی دوہرے شرف کی وجہ سے حضرت عثمانؓ ''ذوالنورین'' کے لقب سے معروف ہوئے۔

☆ سب سے چھوٹی صاحبزادی حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کی شادی آپ ﷺ نے حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ سے کی جو آپؐ کے عم زاد ہونے کے علاوہ مزید یہ کہ ابتداء سے ہی آپؐ ہی کی کفالت وسرپرستی میں بھی تھے، ان سے حضرات حسن وحسین رضی اللہ عنہما پیدا ہوئے۔

(۱) بعض مؤرخین کے بقول حضرت رقیہؓ کی مکہ سے خفیہ ہجرت اور حبشہ جیسے دور دراز مقام کی جانب بے بسی وکسمپرسی کے عالم میں روانگی کی وجہ سے ان کی والدہ حضرت خدیجہ انتہائی افسردہ ورنجیدہ رہنے لگیں، اور بالآخر یہی صدمہ ان کی بیماری اور پھر وفات کا سبب بنا...... جبکہ دوسری طرف ماں سے دوری اور پھر ماں کی وفات کی خبر حضرت رقیہؓ کی بیماری اور پھر وفات کا سبب بنی...... واللہ اعلم۔

آپ ﷺ کی تین صاحبزادیاں (زینب، رقیہ، ام کلثوم رضوان اللہ علیہن) عین جوانی کی عمر میں آپؐ کی حیات میں ہی اس جہانِ فانی سے کوچ کر گئیں، جبکہ چوتھی اور سب سے چھوٹی اور لاڈلی صاحبزادی حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کی وفات آپؐ کی رحلت کے چھ ماہ بعد اٹھائیس برس کی عمر میں ہوئی۔

☆......کعبہ کی تعمیرِ نو میں شرکت:

طوفانِ نوح [علیہ السلام] کے نتیجے میں کعبۃ اللہ کی عمارت کے نشانات مٹ جانے کے بعد اس کی تعمیرِ نو کا مقدس فریضہ حضرت ابراہیم علیہ السلام اور ان کے فرزند جلیل حضرت اسماعیل علیہ السلام نے انجام دیا تھا۔لیکن مرورِ زمانہ کے ساتھ ساتھ یہ عمارت کمزور اور مخدوش ہوتی چلی گئی۔خصوصاً رسول اللہ ﷺ کی عمر مبارک جب پینتیس برس تھی، یعنی آپؐ کی بعثتِ مبارکہ سے پانچ سال قبل مکہ مکرمہ میں ایک زبردست سیلاب آیا جس کے نتیجے میں کافی تباہی ہوئی، اسی سیلاب کی وجہ سے ہی کعبۃ اللہ کی عمارت مزید خستہ و بوسیدہ ہوگئی، حتیٰ کہ اس کے منہدم ہوجانے کا خطرہ محسوس ہونے لگا۔تب اکابرِ قریش نے غور و فکر اور باہم صلاح و مشورے کے بعد یہ فیصلہ کیا کہ قبل اس کے کہ کسی روز یہ عمارت اچانک گر جائے اور کسی نقصان کا باعث بنے ...... اسے خود ہی منہدم کر کے اس کی تعمیرِ نو کی جائے۔

چنانچہ اس منصوبے کے مطابق کعبہ کی قدیم عمارت کو منہدم کر کے اس کی جگہ نئی عمارت تعمیر کی گئی، تعمیرِ نو کے اس کام میں سردارانِ قریش کے ہمراہ رسول اللہ ﷺ نے بھی بنفسِ نفیس شرکت فرمائی، اس موقع پر آپؐ بھاری پتھر و دیگر سامانِ تعمیر خود اٹھاتے رہے، جس کی وجہ سے آپؐ کے مبارک کندھے زخمی ہو گئے۔

کعبہ مشرفہ کی اس تعمیرِ نو کا یہ کام جب مکمل ہوا تو حجرِ اسود کو اس کے مقام پر نصب کرنے کا مرحلہ آیا تو اس موقع پر سخت اختلاف کی نوبت آئی جس کے نتیجے میں بڑی ہی نازک صورتِ حال پیدا ہو گئی، تلواریں نیاموں سے باہر آ گئیں اور شدید جنگ کا خطرہ منڈلانے لگا...... کیونکہ ہر کسی کی یہ خواہش تھی کہ حجرِ اسود کو اٹھا کر اس کے مقام پر نصب کرنے کا یہ عظیم شرف اور اعزاز اسی کو نصیب ہو......!!

آخر باہمی مشاورت کے بعد یہ طے کیا گیا کہ کل صبح سب سے پہلے حرم شریف میں جو کوئی داخل ہو گا وہی اس بارے میں کچھ فیصلہ کرے گا اور اس کا فیصلہ سبھی کو قبول ہو گا۔

چنانچہ دوسرے روز علیٰ الصباح لوگوں نے یہ منظر دیکھا کہ سب سے پہلے رسول اللہ ﷺ حرم میں داخل ہو رہے ہیں...... آپؐ کو آتا دیکھ کر ان لوگوں کی خوشی کی انتہاء نہ رہی، اور وہ سب فرطِ مسرت سے یک زبان ہو کر پکار اٹھے: أتـاكـم الأمين ...... أتاكم الأمين ...... یعنی ''امین آ گئے ...... امین آ گئے ......''!!

آپ ﷺ نے اپنی چادر مبارک زمین پر بچھائی اور حجرِ اسود کو اٹھا کر اس پر رکھا، پھر تمام سردارانِ قریش سے کہا کہ سب مل کر اس چادر کو اٹھائیں، چنانچہ ان سب نے مل کر اس چادر کو اٹھایا اور کعبۃ اللہ تک پہنچایا، تب آپؐ نے خود اپنے دستِ مبارک سے حجرِ اسود کو اس کے مقام پر نصب فرما دیا...... یوں آپؐ کی بے مثال فہم و فراست اور حسنِ تدبیر کی وجہ سے اس عظیم شرف میں وہ سبھی شریک ہو گئے اور یوں وہ سب مسرور و مطمئن ہو گئے ...... جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان میں باہم بڑی جنگ اور خوں ریزی کا خطرہ ٹل گیا۔

بعثت:

رسول اللہ ﷺ کی عمر مبارک جب پینتیس برس سے تجاوز کرگئی تو طبیعت میں مزید سنجیدگی ومتانت کے آثار نمایاں ہونے لگے، آپؐ اکثر خاموش اور تفکر وتدبر میں محو رہتے، آپؐ کی طبیعت اس ماحول سے مسلسل بیزار رہنے لگی کہ جہاں عقیدہ وایمان اور اخلاق وکردار کے لحاظ سے چہار سو خرابیاں ہی خرابیاں پھیلی ہوئی تھیں، ایسے میں آپؐ کے مزاج میں گوشہ نشینی وخلوت گزینی کی طرف میلان ورجحان بڑھنے لگا، آپؐ کے کندھوں پر اہل وعیال کی ذمہ داریوں کا بوجھ تھا، دنیاوی وکاروباری امور بھی نپٹانا پڑتے تھے، لیکن اب آپؐ کی طبیعت ان تمام کاموں سے اچاٹ رہنے لگی، آخر نوبت یہاں تک پہنچی کہ آپؐ اکثر کئی دنوں کی خوراک اپنے ہمراہ لیتے جو کہ پانی اور ستو پر مشتمل ہوتی' اور مکہ شہر سے کچھ فاصلے پر جبل النور نامی پہاڑ کی بلند وبالا چوٹی پر واقع ''غارِ حراء'' میں جا بیٹھتے...... دنیا سے الگ تھلگ...... وہاں آپؐ اکیلے مسلسل کئی کئی دن قیام فرماتے، اللہ کی قدرت کے بارے میں غور وفکر میں منہمک ومستغرق رہتے، اس وقت آپؐ کو کسی خاص مقصودِ حقیقی کے بارے میں کچھ علم نہیں تھا، البتہ تلاشِ حق کی ایک جستجو تھی......ایک عجیب لگن تھی......جس نے بے چین کر رکھا تھا......!!

اسی کیفیت میں وقت گذرتا چلا گیا...... جیسے جیسے آفتابِ نبوت کے طلوع ہونے کا وقت قریب آتا گیا آپ ﷺ پر قدرت کے اسرار ورموز منکشف ہونے لگے، آپؐ کو اکثر خواب نظر آتے، اور خواب میں آپؐ جو کچھ دیکھتے جلد ہی حقیقت کی دنیا میں بھی وہی منظر سامنے آجاتا......خوابوں کا یہ سلسلہ تقریباً چھ ماہ تک جاری رہا۔

اسی کیفیت میں آپ ﷺ کی عمر مبارک جب چالیس سال ہوگئی تو ایک روز جب آپؐ حسبِ معمول غارِ حراء میں ذکر وفکر اور عبادت میں مشغول تھے کہ اچانک وہاں کوئی اجنبی شخص نمودار ہوا جو کہ درحقیقت امین الوحی حضرت جبریل علیہ السلام تھے۔

اس نو وارد یعنی جبریل امین نے آپؐ کے قریب آکر کہا: اِقْــرَأ یعنی: ''پڑھو''۔ آپؐ نے جواب دیا: مَــا أنَــا بِـقَـارِئ یعنی: ''میں تو پڑھا ہوا ہی نہیں ہوں''۔ اس پر جبریل نے دوبارہ کہا: اِقرَأ یعنی: ''پڑھو'' اور آپؐ نے وہی جواب دیا: مَـا أنَـا بِقَارِئ یعنی: ''میں تو پڑھا ہوا ہی نہیں ہوں''۔ تب جبریل علیہ السلام نے آپؐ کو گلے سے لگا کر قدرے بھینچا، اور پھر چھوڑ دیا، اس کے بعد تیسری بار کہا: ﴿اِقـرَأ بِـاسـمِ رَبِّكَ الَّذِي خَلَقَ ، خَلَقَ الاِنسَـانَ مِـن عَـلَـقٍ، اِقرَأ وَرَبُّكَ الأكرَمُ، الَّذِي عَلَّمَ بَالقَلَمِ، عَلَّمَ الاِنسَانَ مَـالَم يَعلَم﴾ یعنی: ''پڑھ اپنے رب کے نام سے جس نے پیدا کیا، جس نے انسان کو جمے ہوئے خون سے پیدا کیا، پڑھ، اور تیرا رب بڑا مہربان ہے، جس نے قلم کے ذریعے سکھایا، جس نے انسان کو وہ سکھایا جو وہ نہیں جانتا تھا''۔

یہ تھی سب سے پہلی وحی جو خالقِ کائنات کی طرف سے اپنے آخری نبی ﷺ کی جانب نازل کی گئی، تمام آسمانی کتابوں میں سب سے آخری وافضل کتاب کا یہ سب سے پہلے نازل ہونے والا حصہ تھا، جس میں انسان کو اس کے خالق ومالک کی طرف سے تحصیلِ علم کا حکم دیا گیا۔ اس سے دینِ اسلام میں علم کی اہمیت واضح ہوتی ہے، اور یہ حقیقت ثابت ہوتی ہے کہ دینِ اسلام علم ومعرفت اور حکمت وبصیرت کا دین ہے۔

(۱) سورۃ العلق [۱-۵]

بعثت کے وقت دینی واخلاقی ومعاشرتی حالات:

رسول اللہ ﷺ کی بعثت جن حالات میں ہوئی اُس وقت صورتِ حال کچھ ایسی تھی کہ انسانیت اندھیروں میں بھٹک رہی تھی، کفروشرک اور ہرقسم کی معصیت وضلالت عروج پرتھی، عقیدہ وایمان کا معاملہ ہو' یا اخلاق واقدار کی بات ہو' ہرلحاظ سے پستی وانحطاط کا وہ دورتھا، بت پرستی' توہم پرستی' ستارہ پرستی' اور ہرگمراہی اس معاشرے میں موجودتھی، معمولی باتوں پرلڑائی جھگڑا' قتل وغارتگری' فتنہ وفساداورخوں ریزی ان کا پسندیدہ ترین مشغلہ تھا، ہرطرف لوٹ کھسوٹ کا بازارگرم تھا، قاعدہ وقانون نام کی کسی چیز کا دوردورتک کوئی وجودنہیں تھا، ہر برائی اپنے عروج پرتھی، اور ہرلحاظ سے وہ لوگ پستی کی انتہاء کو پہنچے ہوئے تھے، کون سی برائی تھی جواس معاشرے میں موجودنہیں تھی......؟ اورسب سے بڑھ کررونگٹے کھڑے کردینے والی برائی اس معاشرے میں یہ تھی کہ وہ لوگ عار کے ڈرسے خوداپنے ہی ہاتھوں اپنی بیٹیوں کوزندہ درگورکردیا کرتے تھے، انسانیت سسک سسک کردم توڑرہی تھی، تڑپتی' سسکتی' دم توڑتی انسانیت کی مثال کسی تپتے ہوئے صحرا کی مانندتھی جوصدیوں سے ابرِ رحمت کا منتظرہو......!

ایسے میں خالقِ کائنات نے اپنا فضل وکرم فرمایا، اوراپنے نبی ﷺ کو پیاسی انسانیت کیلئے ابرِ رحمت بنا کربھیجا، جیسا کہ قرآن کریم میں ارشادہے: ﴿وَ مَـا أرسَـلـنَـاكَ اِلّا رَحمَةً لِّـلـعَـالَـمِينَ﴾ (۱) یعنی: (اے نبی! ہم نے آپ کوتمام دنیاوالوں کیلئے رحمت بنا کرہی بھیجاہے)

(۱) الأنبیاء[۱۰۷]

ہر طرف چھائی ہوئی ان ظلمتوں کے درمیان آپ ﷺ اللہ کی طرف سے مینارۂ نور، مشعلِ راہ اور روشن چراغ بن آ کر آئے۔ جیسا کہ ارشادِ ربانی ہے: ﴿...... وَ دَاعِیاً اِلَیٰ اللّٰہِ بِاِذْنِہٖ وَ سِرَاجاً مُّنِیراً﴾ (۱)

یعنی: (...... ہم نے آپ کو بھیجا ہے اللہ کے حکم سے اُس کی طرف بلانے والا، اور روشن چراغ بنا کر)

مقصد یہ کہ جس طرح چراغ سے اندھیرے دور ہو جاتے ہیں، اسی طرح اللہ نے آپ ﷺ کو کفر و شرک اور معصیت و ضلالت کی تاریکیاں دور کرنے والا بنا کر بھیجا۔

بعثت کے فوری بعد:

رسول اللہ ﷺ پہلی وحی کے نزول کے بعد خلافِ معمول جلد گھر لوٹ آئے اور آتے ہی لیٹ گئے، اور اپنی زوجہ محترمہ حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا سے فرمایا: زَمِّلُونِي ۔ زَمِّلُونِي یعنی "مجھے چادر اڑھادو، مجھے چادر اڑھادو"۔ جس پر حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا نے آپ ﷺ کو چادر اڑھادی۔

کچھ توقف کے بعد جب طبیعت قدرے سنبھلی تو آپؐ نے حضرت خدیجہؓ کے سامنے تمام صورتِ حال بیان کی، اور پھر اپنی پریشانی کا اظہار کرتے ہوئے فرمایا: قَد خَشِیتُ عَلَیٰ نَفْسِي یعنی "مجھے تو اپنی جان خطرے میں محسوس ہو رہی ہے"۔ تب حضرت خدیجہؓ نے آپ ﷺ کو تسلی دیتے ہوئے فرمایا: (كَلَّا، وَاللّٰهِ لَا يُخزِيكَ اللّٰهُ أبداً، اِنَّكَ لَتَصِلُ الرَّحِمَ، وَتَصدُقُ الحَدِيث، وَتَحمِلُ الكَلَّ، وَتكسِبُ المَعدُومَ، وَتَقرِي الضَّيفَ، وَتُعِينُ عَلَىٰ نَوَائِبِ الحَقِّ......) (۲)

(۱) الأحزاب [۴۶]
(۲) بخاری [۳] کتاب بدء الوحی ۔

ترجمہ: (''نہیں نہیں! اللہ کی قسم! اللہ آپ کو ہرگز اس کام میں رسوا نہیں کرے گا، کیونکہ آپ صلہ رحمی کرتے ہیں، سچ بولتے ہیں، مہمان نواز ہیں، محتاجوں اور غریبوں کی مدد کرتے ہیں، اور راہِ حق میں لوگوں کی مدد کرنے والے ہیں'') (۱)

حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا نے آپ ﷺ کو تسلی تو دی، اور اس یقین کا اظہار بھی کیا کہ جب آپؐ کا اخلاق اس قدر اچھا ہے تو پھر اللہ کی طرف سے یقیناً آپؐ کی حفاظت اور مدد و نصرت کا غیبی انتظام بھی ضرور ہوگا......!

لیکن ظاہر ہے کہ یہ بات خود ان کیلئے بھی بڑی تشویش کا باعث تھی۔ چنانچہ وہ مزید اطمینان اور تسلی کی غرض سے فوراً ہی آپؐ کو اپنے چچازاد بھائی ورقہ بن نوفل کے پاس لے گئیں جو ظہورِ اسلام سے قبل ہی بت پرستی سے بیزار ہو کر ایک عرصے تک تلاشِ حق میں سرگرداں رہے، اور پھر تلاش و جستجو کے بعد بالآخر اپنی دانست کے مطابق اس وقت کے صحیح دین یعنی ''نصرانیت'' کو قبول کر چکے تھے، اور اکثر انجیل بھی پڑھتے رہتے تھے، انتہائی عمر رسیدہ ہونے کی وجہ سے آنکھوں کی بینائی سے محروم ہو چکے تھے۔ حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا رسول اللہ ﷺ کو ہمراہ لئے ہوئے ورقہ کے پاس پہنچیں اور کہا کہ دیکھو یہ (رسول ﷺ) کیا کہتے ہیں......! اس پر ورقہ نے آپؐ کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے کہا کہ بولو بھتیجے کیا بات ہے؟ تب آپؐ نے تمام ماجرا بیان فرمایا۔ جسے سننے کے بعد ورقہ بن نوفل نے کہا: (هٰذا النّاموس الّذي أنزلَهُ اللّٰهُ عَلىٰ مُوسىٰ) یعنی ''یہ تو وہی ناموس ہے جو اللہ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی جانب نازل کیا تھا''۔ اس کے بعد مزید کہا: يَالَيتَنِي جَذَعاً ،

(۱) غور طلب بات ہے کہ بعثت سے قبل ہی آپ ﷺ کے اخلاق کی بلندی و عظمت کا یہ حال تھا تو بعثت کے بعد کیا کیفیت ہوگی......؟

لَیتَنِي أکُونُ حَیّاً اِذ یُخرِجُكَ قَومُكَ (۱) یعنی: ''کاش میں جوان ہوتا، کاش میں اُس وقت تک زندہ رہتا کہ جب آپؐ کی قوم آپؐ کو شہر سے نکال دے گی''۔ اس پر آپؐ نے حیرت وتعجب کے عالم میں دریافت فرمایا: أوَ مُخرِجِيَّ هُم؟ یعنی ''کیا یہ میری ہی قوم کے لوگ مجھے میرے شہر سے نکال باہر کریں گے؟''۔ ورقہ نے جواب میں کہا: نَعَم یعنی ''ہاں''۔ اور پھر مزید کہا: لَم یَأتِ رَجُلٌ بِمِثلِ مَا جِئتَ بِهٖ اِلَّا عُودِيَ یعنی ''جب بھی کسی نے ایسی تعلیم پیش کی کہ جیسی تعلیم آپؐ لے کر آئے ہیں، تو اس کے ساتھ ہمیشہ دشمنی ہی کی گئی ہے''۔

اور پھر محض چند روز بعد ہی ورقہ بن نوفل کی وفات ہوگئی۔

اس کے بعد جبریل امین بھی جلد دوبارہ نہیں آئے، بلکہ کچھ عرصہ گذر گیا، غالباً اس توقف میں حکمت یہ ہوگی کہ رسول اللہ ﷺ کی طبیعت پرسکون ہوجائے، اور آپؐ کا ذہن اس حقیقت کو قبول کرلے۔

اور پھر اس توقف کے بعد ایک روز جبریل علیہ السلام دوبارہ وحی لے کر آئے، اس بار وہ سورۃ المدّثر کی ابتدائی پانچ آیات لے کر آئے تھے: ﴿یَا أیُّهَا المُدَّثِر، قُم فَأنذِر، وَرَبَّكَ فَكَبِّر، وَثِیَابَكَ فَطَهِّر، وَالرُّجزَ فَاهجُر﴾ (۲) ترجمہ: (اے چادر اوڑھنے والے، اٹھ کھڑے ہوجاؤ، اور آگاہ کرو، اور اپنے رب کی بڑائی بیان کرو، اور اپنے کپڑوں کو پاک رکھو، اور ناپاکی سے دور رہو)

اس بارے میں رسول اللہ ﷺ نے خود یہ واقعہ بیان کرتے ہوئے فرمایا: (بَینَا أنَا أمشِي سَمِعتُ صَوتاً مِنَ السَّمَاءِ، فَرَفَعتُ بَصَرِي قِبَلَ السَّمَاءِ، فَاِذَا المَلَكُ

(۱) بخاری[۶۹۸۲] کتاب التعبیر۔ (۲) المدثر[۱-۵]

الّذِي جَاءَ نِي بِحِرَاء قَاعِدٌ عَلَىٰ كُرسِيٍّ بَينَ السَّمَاءِ وَالأرضِ، فَجَئِثتُ مِنهُ حَتّىٰ هَوَيتُ اِلَىٰ الأرضِ، فَجِئتُ أهْلِي ، فَقُلتُ : زَمِّلُونِي ، زَمِّلُونِي ، فَزَمَّلُونِي ، فَأنزلَ اللّهُ تَعَالىٰ : يَا أيُّهَا المُدَّثِر ، اِلَىٰ قوله : فَاهْجُر) (۱)

ترجمہ: (میں چلا جارہا تھا کہ اچانک میں نے آسمان کی طرف سے ایک آواز سنی، میں نے نگاہ اٹھا کر دیکھا تو وہ فرشتہ جو غارِحراء میں میرے پاس آیا تھا' میں نے دیکھا کہ وہی فرشتہ آسمان وزمین کے درمیان ایک کرسی پر بیٹھا ہوا ہے، میں گھبراہٹ کی وجہ سے زمین پر بیٹھ گیا، پھر گھر پہنچتے ہی میں نے اپنی اہلیہ سے کہا ''مجھے کوئی چادر اڑھادو، مجھے کوئی چادر اڑھادو'' جس پر انہوں نے مجھے چادر اڑھادی، تب اللہ تعالیٰ نے يَا أيُّهَا المُدَّثِر سے وَالرُّجزَ فَاهجُر تک آیات نازل فرمائیں)۔

☆☆☆

(۱) بخاری[۴۹۲۶] کتاب التفسیر، باب: والرجز فاہجر۔

الحمد للہ آج بتاریخ ۱۷/شوال ۱۴۳۲ھ، مطابق ۱۵/ستمبر ۲۰۱۱ء بروز جمعرات یہ باب مکمل ہوا۔

رَبَّنَا تَقَبَّل مِنَّا اِنّكَ أنتَ السَّمِيعُ العَلِيمُ ، وَتُب عَلَينَا اِنَّكَ أنتَ التَوَّابُ الرَّحِيمُ

مکی دور:

رسول اللہ ﷺ کی تیئس سالہ پیغمبرانہ زندگی اس قدر وسیع موضوع ہے اوراس کی اتنی جزئیات ہیں کہ ان میں سے ہرموضوع پر مستقل ضخیم کتابیں لکھی گئی ہیں، یہ سلسلہ ہر دور میں جاری رہااور آئندہ بھی تا قیامت جاری رہے گا۔

البتہ سہولت کی خاطر بطورِخلاصہ اس تیئس سالہ زندگی کو یوں تقسیم کیا جاسکتا ہے کہ ابتداء میں اسے مکی دوراور مدنی دور میں تقسیم کردیا جائے،اورپھران دونوں ادوار میں سے ہرایک کو مزید تین مختلف ادوار میں تقسیم کردیا جائے،اس سلسلہ میں تفصیل درجِ ذیل ہے:

☆...... پہلا دور؛ خفیہ دعوت وتبلیغ:

مکی زندگی کے تین مختلف ادوار میں سے پہلا دوروہ ہے جسے''خفیہ دعوت وتبلیغ'' کادور کہاجاتاہے،اورجوکہ تین سال کے عرصہ پرمحیط ہے۔

اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی طرف سے جب آپؐ کودینِ برحق کی تبلیغ کافریضہ سونپا گیاتواس حکمِ ربانی کی تعمیل میں آپؐ نے سب سے پہلے اپنے افرادِخانہ کو پیغامِ حق پہنچایا،جس کے نتیجے میں آپؐ کی زوجہ محترمہ ام المؤمنین حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا' آپؐ کے آزادکردہ غلام حضرت زیدبن حارثہ رضی اللہ عنہ' آپؐ کے چچازاد بھائی حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ نے (جوکہ آپؐ ہی کے زیرِکفالت تھے) آپؐ کی دعوت پرلبیک کہتے ہوئے اس پیغامِ حق کوقبول کیا۔

ان افرادِخانہ کے بعدآپؐ نے گھرسے باہران لوگوں کواللہ کے دین کی طرف دعوت دی

جن میں آپ ﷺ کو خیر وخوبی کی جھلک نظر آتی تھی، ان افراد میں آپؐ کے انتہائی قریبی رازداراور خاص ترین دوست اور بااعتماد ساتھی حضرت ابوبکرصدیق رضی اللہ عنہ قابلِ ذکر ہیں۔اسی طرح حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ، ودیگر متعدد ایسے حضرات تھے جوکہ بالکل ابتدائی دور میں ہی دعوتِ حق پر لبیک کہتے ہوئے مشرف باسلام ہوگئے۔

یہاں یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ یہ تمام حضرات وہ تھے کہ جن کا رسول اللہ ﷺ کے ساتھ بہت قدیم اور قریبی تعلق چلا آرہا تھا،جس کی وجہ سے یہ حضرات آپؐ کے اخلاق وکردار سے بخوبی واقف تھے،آپؐ کی زندگی کا کوئی گوشہ ان سے مخفی نہیں تھا......اس کے باوجود سب سے پہلے انہی حضرات کا آپؐ کی دعوت کوقبول کرنااور بلا چون وچرا آپؐ کی تصدیق کرنا آپؐ کی صداقت وحقانیت، نیز آپؐ کے اعلیٰ اخلاق اور پاکیزہ کردار کی مضبوط دلیل ہے۔

تین سال کے عرصے پرمحیط خفیہ دعوت وتبلیغ کا یہ دور یوں مکمل ہوا کہ گنے چنے چندافراد نے اس دینِ برحق کوقبول کیا،جس کی خبراگرچہ مشرکینِ مکہ کے کانوں تک جا پہنچی،تاہم انہوں نے اسے محض وقتی چیز سمجھتے ہوئے اس طرف کوئی خاص توجہ نہیں دی۔

☆......دوسرا دور؛ علانیہ دعوت وتبلیغ:

نبوت کے چھٹے سال کے آغاز میں جب یہ آیت نازل ہوئی:﴿وَأَنْذِرْ عَشِيرَتَكَ الْأَقْرَبِينَ﴾ (۱) یعنی: (آپ ڈرایئے اپنے خاندان والوں' قرابت داروں کو)

اس حکمِ ربانی کی تعمیل میں آپؐ نے اب علانیہ دعوت وتبلیغ کا آغاز فرمایا،اور یوں مکی زندگی کے دوسرے دور کا آغاز ہوا، جوکہ نبوت کے دسویں سال تک جاری رہا۔

(۱)الشعراء[۲۱۴]

چنانچہ ایک روز آپ ﷺ نے کوہِ صفا پر اپنے خاندان والوں یعنی بنوہاشم کو جمع کیا تاکہ ان کے سامنے دعوتِ حق پیش کرسکیں، لیکن اس موقع پر ابولہب نے حسبِ معمول الٹی سیدھی ہانکنی شروع کی، جس کی وجہ سے آپؐ اپنا مدعیٰ بیان نہ کرسکے۔

دوسرے روز آپؐ نے دوبارہ بنوہاشم کو جمع کیا اور مدعیٰ بیان کرنے سے پہلے ان سے اپنی تصدیق چاہی (۱) جس پر ان سب نے بیک زبان کہا: مَا جَرَّبنَا عَلَيكَ كَذِباً یعنی ''ہم نے آپ سے کبھی جھوٹ نہیں سنا''۔ تب آپؐ نے انہیں اللہ کا پیغام پہنچایا، اللہ کے دین کی طرف انہیں دعوت دی، صرف ایک اللہ کی عبادت کی تلقین فرمائی، بت پرستی اور ہر قسم کے شرک سے انہیں روکا، معاشرتی برائیوں سے باز رہنے کی تاکید فرمائی۔

اس کے بعد آپؐ نے ان حاضرینِ محفل سے دریافت فرمایا کہ اس کام میں تم میں سے کون میرا ساتھ دے گا......؟

حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ اس وقت کم سن تھے، اور اس محفل میں موجود تمام افرادِ بنوہاشم میں وہ سب سے چھوٹے تھے، مگر اس کے باوجود وہ اپنی جگہ سے اٹھے اور بآوازِ بلند' بلاتردد آپؐ کی حمایت اور اس کام میں بھرپور ساتھ دینے کا وعدہ کیا، جبکہ وہ اس سے بہت قبل ہی مشرف باسلام بھی ہوچکے تھے۔

آپؐ کے سرپرست اور مشفق ومہربان چچا ابوطالب نے اس موقع پر آپؐ کو اس سلسلے میں اپنی مکمل حمایت اور تائید کا یقین دلایا، البتہ ساتھ ہی یہ بھی کہا کہ: اِنّ نَفسِي لَاتُطَاوِعُنِي عَلىٰ فِرَاقِ دِينِ عَبدِ المُطّلِب یعنی ''میرا دل نہیں مانتا کہ میں عبدالمطلب کے دین

(۱) یعنی آپ ﷺ نے وہاں موجود بنوہاشم سے اپنے بارے میں دریافت فرمایا کہ میرے بارے میں تمہاری کیا رائے ہے؟ تم مجھے سچا سمجھتے ہو؟ یا یہ کہ تمہاری نظر میں میں جھوٹا انسان ہوں......؟

سے روگردانی کروں''۔

مقصد یہ کہ دینِ اسلام کی دعوت وتبلیغ اور نشر واشاعت کی جہاں تک بات ہے' اس سلسلے میں میں آپؐ کے شانہ بشانہ ہر تعاون اور مدد کیلئے مکمل طور پر تیار ہوں...... لیکن جہاں تک میرے اپنے دین کا معاملہ ہے تو میں اپنے آبائی دین کو نہیں چھوڑ سکتا......!!

رسول اللہ ﷺ نے اپنا سلسلۂ گفتگو جاری رکھا، اسی دوران جب آپؐ نے یہ ارشاد فرمایا: اِنِّي نَذِيرٌ لَكُم بَينَ يَدَيْ عَذَابٍ شَدِيدٍ یعنی ''میں تمہیں ڈراتا ہوں سخت عذاب سے''۔ یہ الفاظ سنتے ہی ابولہب بھڑک اٹھا، اور یوں ہرزہ سرائی کرنے لگا: تَبّاً لَكَ ، اَلِهٰذَا جَمَعتَنَا؟ یعنی (نعوذ باللہ) ''تو ہلاک ہو جائے، کیا تو نے ہم سب کو صرف اسی لئے یہاں جمع کیا ہے؟''۔

ابولہب کی زبانی یہ انتہائی سخت اور قبیح ترین الفاظ سن کر رسول اللہ ﷺ انتہائی رنجیدہ ہو گئے، جس پر آپؐ کی دلجوئی وتسلی کیلئے خالقِ ارض وسماء کی جانب سے سورۂ تبت یدا (یعنی سورۂ مسد) نازل کی گئی، جس میں اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کی طرف سے یہ کہا گیا کہ ہلاکت وبربادی تو خود ابولہب کیلئے ہے......!

انہی دنوں جب آیت ﴿فَاصدَع بِمَا تُؤمَرُ......﴾ (۱) یعنی ''آپ کو جو حکم دیا گیا ہے اسے آپ خوب صاف صاف بیان کر دیجئے......'' نازل ہوئی تو اس حکمِ ربانی کی تعمیل کرتے ہوئے اب آپ ﷺ نے اپنے سلسلۂ دعوت وتبلیغ کو مزید تیز کر دیا اور اس کام کو مزید وسعت دی، چنانچہ اب آپؐ نے اپنے قرابت داروں کے علاوہ مزید یہ کہ پورے شہرِ مکہ میں ہر جگہ اور ہر قبیلے کو پیغامِ حق پہنچانا شروع کر دیا، اب آپؐ جگہ جگہ گھومتے، مختلف

(۱) الحجر [۹۴]

قبائل اور خاندانوں کے مساکن میں تشریف لے جاتے، بازاروں، گلیوں، محلوں، میں جاتے، کوئی میلہ منعقد ہوتا...... یا کوئی محفل سجتی...... یا کسی بھی قسم کا کوئی اجتماع ہوتا...... آپؐ وہاں پہنچتے...... خصوصاً حج کے موقع پر بیرونِ مکہ سے بڑی تعداد میں جو لوگ حج کی غرض سے آتے، آپ ﷺ انہیں دینِ اسلام کی دعوت دیتے، اسی طرح مختلف علاقوں سے عربوں کے جو تجارتی قافلے مکہ آتے آپؐ ان سے ملاقاتیں کرتے، ان کے ٹھکانوں اور ان کی اقامت گاہوں میں جا کر انہیں پیغامِ حق سناتے اور دینِ برحق کی طرف دعوت دیتے......!

مشرکین کی طرف سے ایذاءرسانیوں کا سلسلہ:

اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اب مشرکینِ مکہ بھی طیش میں آ گئے...... طاغوتی قوتیں حرکت میں آ گئیں، اور اب انہوں نے سچائی کا راستہ روکنے اور آپؐ کو نیز آپؐ کے مٹھی بھر ساتھیوں کو طرح طرح کی اذیتیں پہنچانا شروع کیں، کسی کو شدید گرمی کے موسم میں میں آگ اگلتے ہوئے سورج کے نیچے تپتی ہوئی ریت پر لٹا کر سینے پر بڑا بھاری پتھر رکھ دیا جاتا، تاکہ اپنی جگہ سے حرکت نہ کر سکے...... کسی کو پاؤں میں رسیاں ڈال کر دن بھر مکہ کی پتھریلی اور گرم گلیوں میں گھسیٹا جاتا...... کسی کو انگاروں پر لٹایا جاتا...... اس دور میں جن حضرات پر ظلم و ستم کے پہاڑ توڑے گئے اور انتہائی وحشیانہ طریقے سے ان پر ہر قسم کا تشدد کیا گیا، ان میں خاص طور پر بلال بن رباح، یاسر اور ان کے بیٹے عمار، نیز عمار کی والدہ سمیہ، اسی طرح خباب بن الأرت، وغیرہ...... قابلِ ذکر ہیں، رضی اللہ عنہم اجمعین۔

اُس دور میں خود رسول اللہ ﷺ کو بے حد تکلیفیں پہنچائی گئیں، کبھی آپؐ کے راستے میں کانٹے بچھا دیئے جاتے، کبھی غلاظت کے ڈھیر ڈال دیئے جاتے، کبھی آپؐ کے قتل کی

سازش کی جاتی، نیز ایک بار جب آپ ﷺ بیت اللہ کے قریب نماز کے دوران اپنے رب کے سامنے حالتِ سجود میں تھے' تو چند بدبختوں نے اونٹ کی اوجڑی لاکر آپؐ کی پشت مبارک پرڈال دی، جس کے بوجھ اوروزن کی وجہ سے آپ ﷺ کافی دیر تک کوئی حرکت نہ کرسکے......جبکہ نجاست وغلاظت اور بدبو کی تکلیف اس کے علاوہ تھی......!!

☆......مزید یہ کہ آپ ﷺ کوان جسمانی اذیتوں اور تکلیفوں کے علاوہ ہر قسم کی ذہنی ونفسیاتی تکلیف پہنچانے میں بھی ان ظالموں اور بدبختوں نے کوئی کسر اٹھانہ رکھی...... چنانچہ کبھی آپؐ کو''دیوانہ'' کہا گیا، جیسا کہ قرآن کریم میں اسی طرف اشارہ ہے: ﴿وَقَالُوا يَا أَيُّهَا الَّذِي نُزِّلَ عَلَيهِ الذِكرُ اِنَّكَ لَمَجنُونٌ﴾ (١) ترجمہ: (انہوں نے کہا کہ اے وہ شخص جس پر قرآن نازل کیا گیا ہے' یقیناً تو تو کوئی دیوانہ ہے)

کبھی کہتے کہ یہ قرآن تو نعوذ باللہ اس شخص نے خود ہی لکھوالیا ہے اور اللہ کی طرف اس کی جھوٹی نسبت کردی ہے، جیسا کہ قرآن کریم میں ارشاد ہے: ﴿وَقَالُوا أَسَاطِيرُ الأَوَّلِينَ اكتَتَبَهَا فَهِيَ تُملَىٰ عَلَيهِ بُكرَةً وَّ أَصِيلًا﴾ (٢) ترجمہ: (اور یہ بھی کہا کہ یہ تو محض گذشتہ لوگوں کے افسانے ہیں' جو اس نے لکھا رکھے ہیں' بس وہی صبح وشام اس کے سامنے پڑھے جاتے ہیں)

اور کبھی بطورِ استہزاء وتمسخر یوں کہتے ہیں کہ یہ کیسا عجیب رسول ہے جو کھاتا پیتا اور بازاروں میں گھومتا پھرتا ہے......؟ چنانچہ قرآن کریم میں ارشاد ہے: ﴿وَقَالُوا مَا لِهٰذا الرَّسُولِ يَأكُلُ الطَّعَامَ وَيَمشِي فِي الأَسوَاقِ ......﴾ (٣) ترجمہ: (اور انہوں نے کہا کہ یہ کیسا رسول ہے؟ جو کھانا کھاتا ہے اور بازاروں میں چلتا پھرتا ہے؟)

(١) الحجر[٦] (٢) الفرقان[٥] (٣) الفرقان[٧]

نیز کبھی ''جادوگر'' اور کبھی ''جھوٹا'' کہا گیا، جیسا کہ قرآن کریم میں ارشاد ہے ﴿وَقَالَ الْكَافِرُونَ هٰذَا سَاحِرٌ كَذَّابٌ﴾ (۱) ترجمہ: (اور کہا کافروں نے کہ یہ تو بس جادوگر ہے جھوٹا ہے)

غورطلب بات ہے کہ وہی مشرکینِ مکہ جو آپ ﷺ کو بعثت ورسالت سے قبل ہمیشہ سے ''صادق وامین'' کے لقب سے پکارتے چلے آرہے تھے...... اب وہی لوگ یک بیک آپ کو ''جھوٹا'' کہنے لگے...... اور پھر خاص طور پر جبکہ ان میں سے اکثریت کے ساتھ آپ ؐ کا قرابت داری کا تعلق بھی تھا...... اپنوں ہی کی زبانی دل چھلنی کر دینے والی یہ باتیں...... یقیناً یہ چیز آپ ؐ کیلئے انتہائی صدمے اور نفسیاتی تکلیف کا باعث تھی۔

نیز یہ مشرکینِ مکہ بغض ونفرت کی شدت کی وجہ سے آپ ﷺ کو تیز نگاہوں اور کھا جانے والی نظروں سے دیکھا کرتے تھے، جس کا قرآن کریم میں یوں تذکرہ کیا گیا ہے: ﴿وَاِن يَّكَادُ الَّذِينَ كَفَرُوا لَيُزْلِقُونَكَ بِأَبْصَارِهِم لَمَّا سَمِعُوا الذِّكرَ وَ يَقُولُونَ اِنَّهٗ لَمَجْنُونٌ﴾ (۲) ترجمہ: (اور قریب ہے کہ کافر اپنی تیز نگاہوں سے آپ کو پھسلا دیں جب کبھی قرآن سنتے ہیں، اور کہہ دیتے ہیں کہ یہ تو ضرور دیوانہ ہے)

مزید یہ کہ آپ ﷺ کو دلی رنج اور نفسیاتی صدمہ پہنچانے کی غرض سے بدبخت ابولہب نے اپنے بیٹوں عتبہ اور عتیبہ کو حکم دیا کہ وہ دونوں اپنی بیویوں کو طلاق دے دیں، جو کہ آپ ؐ کی صاحبزادیاں یعنی حضرت رقیہ اور حضرت ام کلثوم (رضی اللہ عنہما) تھیں، جن کا نکاح آپ ؐ کی بعثت سے قبل ابولہب کے ان بیٹوں کے ساتھ ہوا تھا (۳)

(۱) ص [۴] (۲) القلم [۵۱]

(۳) البتہ متعدد مؤرخین کے بقول اُس وقت تک رخصتی کی نوبت نہیں آئی تھی، محض نکاح ہوا تھا، واللہ اعلم۔

ہجرتِ حبشہ:

رسول اللہ ﷺ کی بعثتِ مبارکہ کے بعد پانچواں سال چل رہا تھا، علانیہ تبلیغ کے اس سلسلے کو دوسال کا عرصہ گذر چکا تھا، کفار ومشرکین کی طرف سے بدسلوکیوں اورایذاء رسانیوں کا سلسلہ بھی بدستور عروج پر تھا، تب آپؐ نے اپنے جاں نثار صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کو مشورہ دیا کہ وہ ملکِ حبشہ کی جانب ہجرت کر جائیں' کیونکہ وہاں ایک نہایت عادل وانصاف پسند بادشاہ کی حکمرانی ہے۔

چنانچہ آپ ﷺ کے اس مشورے پر عمل کرتے ہوئے صحابہ کرام کی ایک مختصر جماعت جو کہ بارہ مردوں اور چار عورتوں پر مشتمل تھی' مکہ مکرمہ سے ملکِ حبشہ کی جانب ہجرت کر گئی، ان میں حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ بمع اپنی اہلیہ حضرت رقیہؓ بنتِ رسول ﷺ بھی شامل تھے۔ کچھ ہی عرصے کے بعد تراسی مردوں اوراٹھارہ عورتوں پر مشتمل دوسرا قافلہ روانہ ہوا جس میں حضرت جعفر بن ابی طالب رضی اللہ عنہ بھی شامل تھے، نیز ان کی اہلیہ حضرت اسماء بنت عمیسؓ بھی ان کے ہمراہ تھیں۔(۱)

مشرکینِ مکہ نے انہیں گرفتار کرنے کی غرض سے دور تک ان کا تعاقب کیا، لیکن وہ تیز رفتاری کے ساتھ جدہ سے بحری راستے سے سفر کرتے ہوئے ان کی دسترس سے باہر نکال گئے، اور پھر بخیر وعافیت ملکِ حبشہ پہنچنے کے بعد وہاں مشرکینِ مکہ کے مظالم سے دور......اب چین اور سکون کی زندگی بسر کرنے لگے......!!

(۱) بعد میں سن آٹھ ہجری میں رومیوں کے خلاف غزوۂ موتہ کے موقع پر حضرت جعفرؓ کی شہادت کے بعد حضرت اسماءؓ بنت عمیس حضرت ابوبکر صدیقؓ کے نکاح میں' اور پھر ان کی وفات کے بعد حضرت علیؓ کے نکاح میں آئیں۔

اُدھر مشرکینِ مکہ کو جب یہ خبر ملی کہ مسلمان اب ان کی پہنچ سے دور ملکِ حبشہ میں آرام اور چین کی زندگی بسر کر رہے ہیں......تو ان کینہ پروروں نے کئی دن پیچ وتاب کھانے کے بعد آخر یہ فیصلہ کیا کہ ایک وفد ملکِ حبشہ کی جانب روانہ کیا جائے، جو وہاں کے بادشاہ نجاشی سے ملاقات کر کے اسے اس بات پر آمادہ کرے کہ مسلمانوں کو دوبارہ ان کے حوالے کر دیا جائے۔

آخر اس منصوبے کے تحت مشرکینِ مکہ کا ایک وفد ملکِ حبشہ جا پہنچا، اور بادشاہ سے ملاقات سے قبل اس کے درباریوں اور مشیروں سے متعدد ملاقاتیں کیں، ان کے ساتھ تعارف اور دوستی کے رشتے استوار کئے، اور پھر بطورِ رشوت قیمتی تحائف اور نذرانے پیش کئے ...... یوں شاہی دربار میں پیش ہونے اور وہاں اپنی آمد کا مقصد بیان کرنے سے قبل ہی ان مکاروں نے بادشاہ کے ان وزیروں' مشیروں کو اپنی مٹھی میں کر لیا......!!

آخر ایک روز شاہی دربار میں پیش ہوئے، وہاں بھی بھاری نذرانے اور قیمتی تحائف پیش کرنے کے بعد اپنا مدعیٰ بیان کرتے ہوئے یوں گویا ہوئے:

''اے بادشاہ! ہمارے شہر کے چند سر پھرے اور فتنہ پرداز قسم کے لوگ اپنے آبائی دین سے برگشتہ ہو کر آپ کے ملک میں آ بسے ہیں۔اے بادشاہ !اگر انہوں نے اپنے آباء واجداد کا دین چھوڑ کر آپ کا دین ہی اپنا لیا ہوتا تب بھی غنیمت تھا......مگر انہوں نے تو ایک ایسا عجیب وغریب نیا دین ایجاد کر لیا ہے جسے سمجھنے سے ہم اور آپ دونوں ہی قاصر ہیں...... اے بادشاہ! جس طرح انہوں نے ہمارے شہر مکہ میں فتنہ پھیلایا ہے' یقیناً اسی طرح اب یہ آپ کے ملک میں بھی فتنہ اور خرابی ہی پھیلائیں گے۔لہٰذا ہمارے بزرگوں اور دانشمندوں نے ہمیں آپ کی خدمت میں بھیجا ہے، تاکہ آپ انہیں ہمارے حوالے کر دیں......اور ہم

انہیں اپنے ہمراہ واپس مکہ لے جاسکیں......''

بادشاہ نے ان کی یہ بات سننے کے بعد اپنے درباریوں اور مشیروں کی جانب استفہامیہ انداز میں دیکھا، گویا وہ ان کی رائے جاننا چاہتا ہو......اور تب......رشوت بول اٹھی......سبھی درباریوں نے پرزور انداز میں مشرکینِ مکہ کی تائید اور ان کے مطالبے کی حمایت کی، اور اپنے بادشاہ کو مسلمانوں کی طرف سے مزید بددل کرنے کیلئے تاکیدی انداز میں کہا کہ جو اپنے آباؤاجداد کے دین کے ساتھ غداری کر سکتے ہیں......ان سے خیر کی کیا توقع کی جاسکتی ہے......؟

مشرکینِ مکہ اور پھر ان کے بعد اپنے ان درباریوں کی گفتگو سننے کے بعد بادشاہ نے کہا: ''انصاف کا تقاضا یہ ہے کہ پہلے ان مسلمانوں کی بات بھی سن لوں' اور اس کے بعد ان کے بارے میں کوئی فیصلہ صادر کروں......''

چنانچہ مسلمانوں کو وہاں دربار میں طلب کیا گیا، بادشاہ نے ان سے دریافت کیا کہ ''یہ کون سا دین ہے کہ جس کی خاطر تم نے اپنے آباؤاجداد کے دین کو چھوڑ دیا ہے......اور پھر یہ کہ ہمارا دین بھی نہیں اپنایا......؟''

بادشاہ کی طرف سے اس سوال کے جواب میں ان حضرات صحابۂ کرام میں سے حضرت جعفر بن ابی طالبؓ کھڑے ہوئے اور یوں گفتگو کا آغاز کیا:

"أيّهَا المَلِك! كُنّا قوماً أهلَ جَاهِلِيّة ، نَعْبُدُ الأصنَام ، وَ نَأتِي الفَوَاحِش ، وَ نَأكُلُ المَيتَة ، وَ نَقْطَعُ الأرحَام ، وَ نُسِيءُ الجِوَار ، وَ يَأكُلُ القَوِيُّ مِنّا الضّعِيف ، فَكُنّا عَلىٰ ذلِكَ ، حَتّىٰ بَعَثَ اللّهُ اِلَينَا رَسُولاً مِنّا ، نعرِفُ نَسَبَهُ وَ صِدقَهُ وَ أمَانَتَهُ وَ عِفَافَهُ ، فَدَعَانَا اِلىٰ اللّهِ لِنُوَحِّدَهُ وَ نَعبُدَهُ ،

وَنَخْلَعَ مَا كُنّا نَعبُدُ نَحنُ وَ آبَاؤنَا مِن دُونِهِ مِنَ الحِجَارَةِ وَالأَوثَان ...... وَأَمَرَنَا بِصِدقِ الحَدِيث ، وَ أَدَاءِ الأَمَانَة ، وَ صِلَةِ الرّحِم ، وَ حُسنِ الجِوَار، وَ الكَفِّ عَنِ المَحَارِمِ وَ الدِّمَاء ، وَ نَهَانَا عَنِ الفَوَاحِشِ ، وَ قَولِ الزُّور ، وَ أكلِ مَالِ اليَتِيم ، وَ قَذفِ المُحصَنَات ...... فَصَدّقنَاهُ وَ آمَنّا بِهٖ ...... فَعَدَا عَلَينَا قَومُنَا ، فَعَذّبُونَا ، وَ فَتَنُونَا عَن دِينِنَا ، لِيَرُدُّونَا اِلىٰ عِبَادَةِ الأَوثَانِ مِن دُونِ اللّه...... فَلَمّا قَهَرُونَا ، وَ ظَلَمُونَا ، وَ حَالُوا بَينَنَا وَ بَينَ دِينِنَا ، خَرَجنَا اِلىٰ بِلَادكَ ، وَ اختَرنَاكَ عَلىٰ مَن سِوَاكَ ، وَ رَغِبنَا فِي جِوَارِكَ ، وَ رَجَونَا أن لَا نُظلَمَ عِندَكَ أيُّهَا المَلِك‘‘ ۔

ترجمہ:’’اے بادشاہ ! ہم جاہل تھے،ہم بتوں کی پوجا کیا کرتے تھے،بدکاری کیا کرتے تھے،ہم مردار کھاتے تھے، پڑوسیوں کے ساتھ برا سلوک کیا کرتے تھے،ہم میں سے جو طاقتور تھا وہ کمزور کو کھا جاتا تھا،ہم اسی کیفیت میں زندگی بسر کر رہے تھے کہ اس دوران اللہ نے ہم میں سے ایک ایسی ہستی کو نبی بنا کر ہماری جانب مبعوث فرمایا کہ جس کے حسب نسب ٗ نجابت وشرافت ٗ امانت ودیانت ٗ نیز اس کی پاکیزہ زندگی سے ہم سب خوب واقف تھے،اس نے ہمیں ایک اللہ کی عبادت کی طرف دعوت دی،اور اللہ کے سوا جن بتوں کی ہم اور ہمارے باپ دادا پوجا کرتے چلے آرہے تھے ...... ان کی پوجا سے باز رہنے کی تاکید کی ،اس نے ہمیں راست بازی ٗ امانت داری ٗ صلہ رحمی ٗ اور پڑوسیوں کے ساتھ حسنِ سلوک کا سبق سکھایا،خونریزی ٗ بے حیائی ٗ دروغ گوئی ٗ یتیموں کا مال ہڑپ کر جانے ٗ اور پاکدامن عورتوں پر بہتان لگانے سے ہمیں منع کیا،پس ہم نے اس کی تصدیق کی اور اس پر ایمان قبول کیا،جس پر ہماری قوم ہمارے درپے آزار ہوگئی،ہمیں ہر طرح ستایا ٗ

پریشان کیا' اورہمیں اپنے دین سے برگشتہ کرنے کی ہرممکن کوشش کی، جب ان کاظلم وستم حد سے تجاوز کرگیا تو اے بادشاہ ہم نے اپنے وطنِ عزیز کوخیر باد کہا، اور پناہ کی تلاش میں ہم آپ کے ملک میں چلے آئے، یہ امید لئے ہوئے کہ یہاں ہمارے ساتھ انصاف کیا جائے گا اور یہ کہ یہاں ہمارے ساتھ کوئی ظلم وزیادتی نہیں ہوگی......''۔

یہ تھا اس نبیٔ اُمّی کے مکتب کا فیض...... کہ ایک صحرانشیں...... جس نے دنیا کی کسی درسگاہ میں کوئی تعلیم حاصل نہیں کی...... جس کے پاس کوئی ڈگری نہیں...... جسے دنیا کے کسی شاہی دربار میں جانے کا کبھی اتفاق ہی نہیں ہوا...... شاہی درباروں کے آداب سے یکسر ناواقف...... سفارتی آداب سے مکمل بےخبر...... مگر بادشاہ کے دریافت کرنے پر جو جواب دیا...... وہ کس قدر جامع' پُرمغز' مدلل' اور اثرانگیز تھا...... یقیناً یہ معلّمِ انسانیت رسول اکرم ﷺ کی پاکیزہ تربیت ہی کا نتیجہ تھا......!!

اس کے بعد نجاشی نے حضرت جعفر رضی اللہ عنہ سے کہا ''تمہارے نبی کی جانب اللہ کی طرف سے جو کلام نازل کیا گیا ہے' کیا اس میں سے کچھ تم مجھے سنا سکتے ہو؟ اس پر حضرت جعفرؓ نے سورۂ مریم کی ابتدائی چند آیات تلاوت کیں، جنہیں سن کر نجاشی زاروقطار رونے لگا، اس کی آنکھوں سے آنسو رواں ہوگئے جو اس کے رخساروں پر بہنے لگے...... تب بے اختیار وہ بول اٹھا: اِنّ ھٰذا وَالّذي جَاءَ بِهٖ عِيسَىٰ لَيَخرُجُ مِن مِشكَاةٍ وَاحِدَةٍ یعنی ''بیشک یہ کلام اور وہ کلام جو کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام لائے ہیں' دونوں ایک ہی چراغ سے نکلے ہوئے نور ہیں''۔

نجاشی حضرت جعفرؓ کی تقریر سے اور پھر ان کی زبانی سورۂ مریم کی تلاوت سے اس قدر متأثر ہوا کہ اس نے ان مسلمانوں کو مشرکینِ مکہ کے حوالے کرنے سے صاف انکار کردیا، اور پھر

مشرکینِ مکہ کے وفد کو مخاطب کرتے ہوئے یوں کہنے لگا کہ ''اللہ نے مجھے یہ سلطنت رشوت لے کر عنایت نہیں کی ...... پھر میں کسی سے رشوت کیوں لوں......؟ اور وفد کو واپس لوٹ جانے کا حکم دیا۔(۱)

جب یہ وفد ناکام و نامراد مکہ واپس پہنچا اور اپنی ناکامی و وذلت کی داستان سردارانِ قریش کے گوش گذار کی تو وہ غصے کے مارے دانت پیس کر رہ گئے......!!

حضرت حمزہ' نیز حضرت عمر رضی اللہ عنہما کا قبولِ اسلام:

انہی دنوں' یعنی جب آفتابِ نبوت کو مکہ شہر پر اپنی روشن کرنیں بکھیرتے ہوئے چھٹا سال چل رہا تھا' ایک بڑی خوشگوار تبدیلی یہ آئی کہ حضرت حمزہ بن عبدالمطلب رضی اللہ عنہ مشرف باسلام ہو گئے، مکہ میں یہ انتہائی شریف النفس اور بہت ہی صاحبِ وجاہت سمجھے جاتے تھے' معاشرے میں ان کا بڑا مقام و رتبہ تھا اور انہیں انتہائی قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا، رسول اللہ ﷺ کے چچا تھے، خاندانِ بنو ہاشم کے چشم و چراغ تھے......

اور پھر صرف تین دن بعد ہی حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ بھی بالکل اچانک ہی مسلمان ہو گئے، حالانکہ اس سے قبل وہ دینِ اسلام کے شدید مخالف اور مسلمانوں کے سخت دشمن

(۱) چنانچہ یہ تمام مسلمان اس کے بعد بدستور حبشہ میں ہی رہے، اور پھر نبوت کے تیرہویں سال جب ہجرتِ مدینہ کے نتیجے میں رسول ﷺ و دیگر تمام مسلمان مستقل طور پر مدینہ منتقل ہو گئے تب یہ مہاجرینِ حبشہ بھی وہاں سے مدینہ پہنچ گئے۔ البتہ حبشہ میں قیام کے دوران ایک بار کسی نے یہ غلط خبر اڑا دی کہ تمام مشرکینِ مکہ اسلام قبول کر چکے ہیں، جس پر متعدد حضرات جن میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نیز ان کی اہلیہ حضرت رقیہؓ بنت رسول بھی شامل تھیں حبشہ سے مکہ واپس آ گئے، لیکن یہاں آنے کے بعد معلوم ہوا کہ یہ اطلاع غلط تھی، چنانچہ یہاں پہنچنے کے بعد انہیں ازسرِ نو مشرکینِ مکہ کی طرف سے اذیتوں اور مصیبتوں کا سامنا کرنا پڑا......اور پھر جب ہجرتِ مدینہ کا حکم نازل ہوا تب ان حضرات نے دوبارہ ہجرت کی، یعنی پہلے مکہ سے حبشہ کی جانب، اور پھر مکہ سے مدینہ کی جانب۔

تھے، ہمیشہ مسلمانوں کے درپے آزار رہتے تھے، انتہائی بہادر، دلیر اور تندرست وتوانا قسم کے انسان تھے، مکہ میں ان کا بہت زیادہ رعب اور دبدبہ تھا، بڑے بڑے بہادر اور جوان ان کے نام سے لرزتے تھے...... جیسا کہ مشہور صحابیٔ رسولؐ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ عمرؓ کا قبولِ اسلام ہم مسلمانوں کیلئے عزت کا ذریعہ اور فتح ونصرت کا پیش خیمہ تھا، ہم مسلمانوں نے عمرؓ کے قبولِ اسلام کے بعد پہلی بار علی الاعلان اور کھلے عام بیت اللہ کا طواف کیا اور وہاں نماز ادا کی، اس سے قبل ہمیں کبھی یہ جرأت نہوئی تھی (۱)

ترغیب وترہیب کا سلسلہ:

مشرکینِ مکہ کے وفد کی حبشہ سے ناکام واپسی ...... اور پھر اس کے فوری بعد حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ، اور پھر حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کا قبولِ اسلام ...... یہ پے درپے ایسے واقعات تھے جن سے مشرکینِ مکہ انتہائی افسردہ وپژمردہ ہوگئے اور ان کے حوصلے پست پڑنے لگے...... لہٰذا پیغمبرِ اسلام اور مسلمانوں کے خلاف اپنی تمامتر نفرت وعداوت کے باوجود اب انہوں مسلمانوں کے ساتھ مصالحتی رویہ اپنانے کا فیصلہ کیا اور اس سلسلے میں گفت وشنید کی غرض سے انہوں نے متعدد بار رسول اللہ ﷺ سے، نیز ابوطالب سے ملاقاتیں کیں، جو کہ آپؐ کے چچا بھی تھے اور سرپرست بھی۔

☆ ...... چنانچہ اسی سلسلے میں مشرکینِ مکہ نے اپنے ایک مشہور سردار عتبہ کو آپؐ کے ساتھ

(۱) ما زلنا أعزّة منذ أسلم عمر (صحيح البخاري، باب اسلام عمر) ولقد رأيتنا ما نستطيع أن نصلّي الىٰ البيت حتىٰ أسلم عمر (طبقات ابن سعد۳/۲۷) انّ اسلامه كان نصراً (المعجم الكبير للطبراني۹/۱۸۱) دین کے معاملے میں حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کی اسی بے مثال جرأت وشجاعت کی وجہ سے ہی رسول اللہ ﷺ نے انہیں ''فاروق'' کا لقب عطاء فرمایا تھا۔

گفت وشنید کی غرض سے بھیجا، جس نے آپ کو مخاطب کرتے ہوئے کہا: ''اے بھتیجے! آپ نے پوری قوم کو مصیبت میں مبتلا کر رکھا ہے، آپ نے ہماری جماعت کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا ہے...... ان سرگرمیوں سے اگر آپ کا مقصود مال ودولت سمیٹنا ہے، تو ہم سارے عرب کے خزانے آپ کے قدموں میں ڈھیر کر دیں گے...... اگر آپ کو عزت اور نام ونمود کی طلب ہے تو ہم آپ کو اپنا سردار مان لیں گے، اگر حکومت کی تمنا ہے تو ہم آپ کو پورے ملکِ عرب کا حکمران تسلیم کر لیں گے...... اور اگر آپ پر کسی جن بھوت یا آسیب کا اثر ہے...... تب بھی ہمیں بتائیے...... ہم آپ کیلئے کسی قابل ترین جھاڑ پھونک کرنے والے کا انتظام کر دیں گے......!

رسول اللہ ﷺ نے دورانِ گفتگو کسی موقع پر اسے روک ٹوک نہیں کی...... اس کی بات کو کاٹا نہیں...... بلکہ نہایت تحمل اور توجہ سے اس کی پوری گفتگو سنی، جب وہ اپنی بات مکمل کر چکا تب آپؐ نے اس سے دریافت فرمایا: ''کیا تم اپنی بات کہہ چکے؟'' اس نے جواب دیا: ''ہاں''، تب آپؐ یوں گویا ہوئے:

''نہ میں مال ودولت جمع کرنا چاہتا ہوں، نہ سرداری اور بادشاہت کی تمنا ہے، نہ میں بیمار ہوں اور نہ آسیب زدہ...... جس قدر باتیں تم نے کہی ہیں ان میں سے کوئی ایک بھی مجھ میں نہیں ہے...... مجھ کو تو بس اللہ نے رسول بنا کر بھیجا ہے، اپنی کتاب مجھ پر نازل فرمائی ہے، اور مجھے یہ حکم دیا ہے کہ میں تمہیں اس کے عذاب سے ڈراؤں''۔

اور پھر آپ ﷺ نے اس کے سامنے سورہ حٰم السجدہ کی تلاوت شروع کی...... ﴿حٰمٓ ، تَنزِيلٌ مِّنَ الرَّحمٰنِ الرَّحِيمِ ، كِتَابٌ فُصِّلَت آيَاتُهُ قُرآناً عَرَبِيّاً لِقَومٍ يَّعلَمُونَ ، بَشِيراً وَّ نَذِيراً فأعرَضَ أكثَرُهُم فَهُم لَا يَسمَعُونَ......﴾ آپؐ یہ

سورت پڑھتے گئے......اورعتبہ انتہائی انہماک کے ساتھ ......حیران وپریشان ......
اورمبہوت ہوکراللہ کا کلام سنتارہا......آپؐ کی طرف ٹکٹکی باندھے دیکھتارہا......اورقرآن کی
حلاوت اس کے رگ وپے میں اترتی چلی گئی......آخرآپ ﷺ جب اس آیت پر پہنچے:

﴿فَاِنْ أَعْرَضُوا فَقُلْ أَنْذَرْتُكُمْ صَاعِقَةً مِّثْلَ صَاعِقَةِ عَادٍ وَّ ثَمُودَ......﴾

یعنی:''اگراب بھی یہ روگردانی کریں تو کہہ دیجئے کہ میں تمہیں ڈراتا ہوں اس کڑک سے
جوعاداورثمود کی کڑک جیسی ہوگی''(۱)

یہ آیت سن کرعتبہ کے ہوش وحواس جواب دینے لگے......اوربے ساختہ اس نے اٹھ کرآپؐ
کے ہونٹوں پراپنے ہاتھ رکھ دیئے......اوریوں التجاءکرنے لگا:

''بس کرو......بھتیجے......میں تمہیں اللہ کی قسم دے کرکہتا ہوں ......میں تمہیں قرابت داری
کا واسطہ دے کرکہتا ہوں کہ......اب بس کرو......''

اس کے بعدوہ سرجھکائے ہوئے بوجھل قدموں کے ساتھ وہاں سے چل دیا،اوراس کے
ساتھی سردارانِ قریش جواس کی آمد کے منتظر تھے......جنہوں نے اسے بھیجا تھا......وہ اس
کا یہ بدلا ہوااندازدیکھ کرپریشان ہوگئے اورکہنے لگے کہ''لو......یہ تو...... بدل گیا......''
اورپھرعتبہ نے ان کے قریب پہنچ کرانہیں کہا کہ:''اس شخص (یعنی محمدﷺ) کواس کے حال
پرچھوڑدو......بس......اسی میں ہم سب کیلئے بہتری ہے''۔(۲)

☆......اسی طرح ایک بارسردارانِ قریش نے''کچھ لو،کچھ دو'' کا اصول اپناتے ہوئے
رسول اللہﷺ کو یہ پیشکش کی کہ''آپ ہمارے معبودوں کی مخالفت چھوڑدیجئے،ہم آپ

(۱)یعنی ایسی خوفناک کڑک ہوگی کہ جیسی کڑک سے قومِ عاداورقومِ ثمود کو ہلاک کیا گیا تھا۔
(۲)تفصیل کیلئے ملاحظہ ہوتفسیرابن کثیر،سورہ حم السجدہ،نیز دیگر کتبِ تفسیروحدیث وتاریخ۔

کے دین کی مخالفت چھوڑ دیتے ہیں، نیز یہ کہ ایک سال آپ ہمارا دین اختیار کرلیا کریں، اور پھر ایک سال ہم آپ کا دین اختیار کرلیا کریں گے، یوں مل جل کر رہ لیتے ہیں''

ان کی اس لغو وبیہودہ پیشکش کے جواب میں ''سورۃ الکافرون'' نازل ہوئی جس میں یہ وضاحت وصراحت کردی گئی کہ ایسا ممکن نہیں......!!

☆......اسی طرح ایک بار سردارانِ قریش عمارہ بن مغیرہ نامی ایک نہایت خوبرو نوجوان کو لئے ہوئے آپ ﷺ کے سرپرست اور چچا یعنی ابوطالب کے پاس پہنچے اور انتہائی احمقانہ قسم کی پیشکش کرتے ہوئے کہا: ''اے ابوطالب! آپ اس خوبرو نوجوان کو اپنا فرزند بنا لیجئے......اور اپنے بھتیجے محمد کو ہمارے حوالے کردیجئے''

اس پر ابوطالب نے جواب دیا: ''واہ......کیا خوب مشورہ ہے......کہ میں اپنے فرزند کو تو تمہارے حوالے کردوں......تاکہ تم اسے ہلاک کرڈالو......اور تمہارے لڑکے کی پرورش میں اپنے ذمے لےلوں؟''

ابوطالب کی زبانی یہ جواب سن کر وہ لوگ کھسیانے ہوکر وہاں سے چلتے بنے۔

یوں جب ان کی تمام تر عیاریاں بے کار و بے سود ثابت ہوئیں......تو آخر وہ جھنجھلا اٹھے......اور تنگ آکر ایک روز وہ باقاعدہ وفد کی شکل میں ابوطالب کے پاس پہنچے، جب سخت گرمی پڑرہی تھی جھلسا دینے والی لو کے جھکڑ چل رہے تھے، سورج سروں پر آگ برسا رہا تھا، گرمی کی شدت کی وجہ سے ہر کوئی اپنے گھر میں دبکا بیٹھا ہوا تھا...... ایسے میں یہ لوگ خلافِ معمول' اچانک اور بے وقت ابوطالب کے پاس جا پہنچے، مزید یہ کہ ان کے تیور بھی کافی بدلے ہوئے تھے......انداز......اور لب ولہجہ بھی بدلا ہوا تھا......

یہ سب کچھ دیکھتے ہی ابوطالب نے معاملے کی نزاکت کو فوراً ہی بھانپ لیا، اور ان سے یوں

اچانک اور بے وقت آمد کی وجہ دریافت کی۔

جس پر انہوں نے کہا کہ: ''اے ابوطالب! ہمارے صبر کا پیمانہ اب لبریز ہو چکا ہے......ہم اپنے بتوں اور بزرگوں کے خلاف اس طرح اس نئے دین کی نشر واشاعت کو کسی صورت گوارا نہیں کر سکتے......اب یا آپ اپنے بھتیجے کو لگام دے دیجئے...... ورنہ ہم نے ٹھان لی ہے کہ......ہم دونوں فریقوں میں سے کوئی ایک ضرور ہلاک ہو جائے گا''۔

اس دھمکی نے ابوطالب کو پریشان کر دیا، کیونکہ انہیں اس بات کا خوب احساس وادراک تھا کہ قریش اپنی بات کے خوب پکے ہوتے ہیں، جو ٹھان لیتے ہیں وہ ضرور کر گذرتے ہیں......!

لہٰذا ابوطالب نے آپ ﷺ کو بلوایا، آپؐ سوچ میں پڑ گئے کہ اتنی تپتی ہوئی دوپہر میں چچا نے بلوایا ہے...... نہ جانے کیا معاملہ ہے......؟ آپؐ چچا کے پاس پہنچے تو انہوں نے اپنے لاڈلے بھتیجے کو مخاطب کرتے ہوئے بڑے ہی دردانگیز لہجے میں کہا: ''بھتیجے! میرے کندھوں پر اتنا بوجھ نہ ڈالو...... جسے میں برداشت نہ کر سکوں''

اپنے مشفق ومہربان چچا کی زبانی یہ بات سن کر آپؐ کو یہ خیال گذرا کہ شاید اب میرے چچا میری مدد وحمایت سے دستبردار ہونا چاہتے ہیں......۔

یہ سوچ کر آپؐ نے جواب دیا: ''اے میرے چچا! اگر یہ لوگ میرے دائیں ہاتھ پر سورج اور بائیں ہاتھ پر چاند بھی لاکر رکھ دیں......تب بھی میں اس کام کو نہیں چھوڑ سکتا...... یہاں تک کہ اللہ خود اس کام کو پورا کر دے...... یا میں خود اس کوشش میں ہلاک ہو جاؤں......''

آخری جملہ کہتے کہتے آپؐ کی آنکھوں میں آنسو آ گئے، اور آپؐ وہاں سے اٹھ کر جانے لگے، ابھی آپؐ وہاں سے چلے ہی تھے کہ......لاڈلے بھتیجے کا یہ حال ابوطالب سے دیکھا نہ گیا،

بھتیجے کی آنکھوں میں آنسو......ابوطالب کے دل پرتو بس چھریاں ہی چل گئیں......اور بے اختیار پکاراٹھے......''بھتیجے! یہاں آؤ......میرے پاس......'' چچا کی اس پکار پر آپ ﷺ کے بڑھتے ہوئے قدم اسی جگہ رک گئے، اور آپؐ واپس پلٹے، چچا کے پاس پہنچے تو انہوں نے شفقت بھری نگاہ ڈالتے ہوئے کہا: ''بھتیجے! جو جی میں آئے کرو......میں تمہارا ساتھ ہرگز نہ چھوڑوں گا''۔

مقاطعہ (سوشل بائیکاٹ):

آخر جب نہ ترغیب سے کام بنا اور نہ ہی ترہیب کسی کام آئی، نہ لالچ نے کوئی اثر دکھایا اور نہ ہی دھمکی سے کوئی فائدہ ہوا......تو مشرکینِ مکہ نے انتہائی سنگدلی وسفاکی کا مظاہرہ کرتے ہوئے یہ فیصلہ کیا کہ رسول اللہ ﷺ کے خاندان سے مکمل طور پر معاشرتی مقاطعہ کرلیا جائے، یعنی پورے شہر مکہ میں کوئی ان کے ساتھ سماجی' یا تجارتی' یا اور کسی بھی قسم کا کوئی تعلق نہ رکھے، اور اس ظالمانہ مقاطعہ کی وجہ یہ بیان کی گئی کہ محمد (ﷺ) اور ان کے ساتھیوں نے آباؤاجداد کے دین سے غداری کی ہے۔

یہ مقاطعہ تین سال مسلسل جاری رہا، اس تمام عرصے میں آپؐ اپنے خاندان سمیت شعب ابی طالب میں محصور رہے، یہ دور مسلمانوں پر بہت سخت گذرا، اس دوران انہوں نے بڑی تکلیفیں اٹھائیں، ایسی نوبت بھی آئی کہ بھوک مٹانے کیلئے وہ درختوں کے خشک پتے کھاتے رہے......اور خشک چمڑے کا ٹکڑا پانی میں بھگوکر باری باری سب چوستے رہے...... ان کے معصوم بچے بھوک اور پیاس کی شدت سے روتے اور بلکتے رہے......!!

اسی کیفیت میں مکمل تین سال گذر گئے ......آخر......نبوت کے دسویں سال کے آغاز میں ماہِ محرم میں اشارۂ الٰہی سے دیمک اس صحیفے کو کھا گئی جس پر یہ معاہدہ تحریر تھا، تب قریش میں

سے ہی ایک شخص مطعم بن عدی نے اس صحیفے کے باقی ماندہ حصے کو بھی پھاڑ کر پھینک دیا...... اور یوں اس ظالمانہ مقاطعے کا اختتام ہو گیا۔

عام الحزن (غم کا سال):

نبوت کے دسویں سال رسول اللہ ﷺ اور آپؐ کے اہلِ خاندان کو شعبِ ابی طالب سے نکلے ہوئے ابھی بمشکل چند ماہ ہی گذرے تھے کہ آپؐ کے سرپرست اور مشفق و مہربان چچا ابو طالب کا انتقال ہو گیا، یقیناً آپؐ کیلئے یہ بہت بڑا صدمہ تھا(۱)

اور پھر اس کے کچھ عرصے بعد ہی آپؐ کی زوجہ مطہرہ ام المؤمنین حضرت خدیجہ بنت خویلد رضی اللہ عنہا بھی داغِ مفارقت دے گئیں۔

پے در پے یہ دونوں صدمے آپؐ کیلئے انتہائی رنج والم کا باعث بنے، گھر سے باہر مخالفین ومفسدین کے مقابلے میں ہمیشہ مضبوط چٹان کی مانند ڈٹے رہنے والے مشفق ومہربان چچا اب اس دنیا میں نہیں رہے......گھر کے اندر ہمیشہ تسلی دینے والی رفیقۂ حیات یعنی حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا بھی نہیں رہیں...... جو کہ گذشتہ پچیس سال سے مسلسل آپؐ کیلئے خلوص ووفاء کا پیکر بنی ہوئی تھیں......اور جو آپؐ کے بچوں کی والدہ بھی تھیں......(۲)

لہٰذا اب آپ ﷺ کا نہ گھر سے باہر دل لگتا تھا......اور نہ ہی گھر کے اندر......!

نیز یہ کہ ابو طالب کی وفات کے بعد کفار ومشرکین کے حوصلے بھی خوب بڑھ گئے، کیونکہ آپؐ

(۱) ایک تو چچا کی وفات کا صدمہ ......چچا بھی ایسے کہ جو زندگی بھر پشت پناہی وہمدردی کرتے رہے...... اور پھر مزید صدمہ اس لئے کہ چچا کی وفات اپنے آبائی دین یعنی ''شرک'' پر ہوئی۔

(۲) سوائے ابراہیم کے جن کی ولادت بہت بعد میں مدینہ میں حضرت ماریہ قبطیہؓ سے ہوئی اور پھر تقریباً ڈیڑھ سال کی عمر میں انتقال ہو گیا۔

کے معاملے میں انہیں پورے شہرِمکہ میں بس ابوطالب ہی کالحاظ تھا......اب یہ چیز بھی ختم ہوگئی......لہٰذا اب آپؐ کی مشکلات میں بھی بہت زیادہ اضافہ ہوگیا......!

یہی وہ مشکل ترین حالات تھے جن کی وجہ سے آپ ﷺ کی حیاتِ طیبہ کے اس دورکوتاریخ میں ''عام الحزن''،یعنی''غم کاسال'' کے نام سے یادکیاجاتاہے۔

مکی زندگی کا تیسرا دور:

مکہ سے باہر دعوت وتبلیغ اورسفرِ طائف:

مشرکینِ مکہ کی طرف سے مسلسل بدسلوکی' اورایذاء رسانی کے اس لامتناہی سلسلے سے تنگ آکرآخرنبوت کے دسویں سال ماہِ شوال میں رسول اللہ ﷺ نے شہرِطائف کارُخ کرنے اوروہاں کے باشندوں کوپیغامِ حق پہنچانے کافیصلہ فرمایا،طائف مکہ مکرمہ سے تقریباً ساٹھ میل (سوکلومیٹر) کے فاصلے پرواقع پہاڑی علاقہ ہے،جہاں بلندوبالا پہاڑ بکثرت پائے جاتے ہیں،راستہ انتہائی مشکل' خطرناک اوردشوارگذارہے،آپؐ نے یہ طویل مسافت پیدل اپنے قدموں پرچل کرطے کی،راستے میں متعددقبائل کے مساکن سے گذرہوا،آپؐ نے ان سبھی کودینِ اسلام کی دعوت دی،لیکن ان میں سے کسی نے بھی اس پیغامِ حق کوقبول نہ کیا۔

آخریہ دشوارگذاراورانتہائی خطرناک پہاڑی راستہ پیدل طے کرتے ہوئے آپؐ طائف شہرجاپہنچے' جواس وقت مشہورقبائل ہوازن' نیز بنوثقیف کامسکن تھا،وہاں آپؐ نے مسلسل دس روزقیام فرمایا،اس دوران آپؐ نے پہلے ان کے سرکردہ افرادکو' اورپھران سے مایوس ہوجانے کے بعدہرخاص وعام کواللہ کے دین کی طرف دعوت دی......مگران بدبختوں نے

آپؐ کی اس دعوت کوقبول کرنے کی بجائے حددرجہ بے مروتی اورسنگدلی کا مظاہرہ کیا، نیز آپؐ کی شان میں گستاخی اور بدسلوکی کی انتہاء کردی......شہرکے آوارہ اوراوباش قسم کے نوجوانوں کو پیچھے لگادیا......جومسلسل آپؐ کاتعاقب کرتے رہے......آپؐ پرآوازے کستے رہے......بیہودہ گوئی کرتے رہے......اسی پر بس نہیں...... بلکہ مسلسل پتھر برساتے رہے، یہاں تک کہ آپؐ کے پاؤں مبارک لہولہان ہوگئے اور جوتے خون سے بھر گئے......اس حالت میں آپؐ نے وہاں سے مکہ کی جانب واپسی کا سفرشروع کیا،تقریباً تین میل کی مسافت طے کرنے کے بعدآپؐ جب ایک باغ میں سے گذررہے تھے تو وہاں کچھ ستانے کی غرض سے انگورکی بیل کے نیچے سائے میں آپؐ نے توقف فرمایا...... عجب بیچارگی تھی......اس قدرطویل سفرکی مشقت......اورپھر یہ کہ کوئی اپنی ذاتی غرض نہیں تھی...... بلکہ محض اللہ کا پیغام پہنچانا مقصود تھا......مگر......انجام کیا ہوا......؟ یہی سب کچھ سوچ کرآپؐ اُس وقت انتہائی صدمے کی کیفیت میں تھے......بےبسی وبیچارگی کی انتہاء ہوگئی تھی......اسی کسمپرسی وبیچارگی کی کیفیت میں آپؐ اپنے خالق ومالک سے لولگائے ہوئے اس کے سامنے آہ وفریاداورالحاح وزاری میں مشغول ہوگئے......اورتب آپؐ کے دل سے وہ آہ نکلی جس نے زبان تک پہنچتے پہنچتے عجیب وغریب کلمات کاروپ دھارلیا......ایک ایسی دعاء آپؐ کی زبان پرجاری ہوگئی جس کاایک ایک کلمہ اپنے اندرایک سمندرسمیٹے ہوئے ہے...... جس کے ایک ایک لفظ میں عجب تأثیر ہے،کسی اورموقع پرآپ ﷺ سے ایسی عجیب وغریب دعاء منقول نہیں ہے......:

اَللّٰهُمّ اِلَيكَ أشكُوا ضَعفَ قُوّتِي وَ قِلّةَ حِيلَتِي وَ هَوَانِي عَلَىٰ النّاسِ، أنتَ أرحَمُ الرّاحِمِينَ وَ أنتَ رَبُّ المُستَضعَفِينَ، وَ أنتَ رَبّي، اِلَىٰ مَن تَكِلُنِي ؟

اِلَىٰ بَعِيدٍ يَتَجَهَّمُنِي؟ أو اِلَىٰ عَدُوٍّ مَلَّكتَهٗ أمرِي؟ اِن لَم يَكُن بِكَ غَضَبٌ عَلَيَّ فَلَا أُبَالِي ، غَيرَ أنّ عَافِيَتَكَ هِيَ أوسَعُ لِي ، أعُوذُ بِنُورِ وَجهِكَ الّذِي أشرَقَت لَهُ الظُّلُمَاتُ ، وَ صَلَحَ عَلَيهِ أمرُ الدُّنيَا وَ الآخِرَةِ ، مِن أن يَحِلَّ عَلَيّ غَضَبُكَ ، أو يَنزِلَ بِي سَخَطُكَ ، لَكَ العُتبَىٰ حَتّىٰ تَرضَىٰ ، وَ لَا حَولَ وَلَا قُوّةَ اِلّا بِكَ ۔ (۱) (۲)

ترجمہ:''اے اللہ! میں تجھی سے شکایت کرتا ہوں اپنی قوت کے ضعف اور کمی کی ،اور اپنی تدبیر کی ناکامی کی ،اور لوگوں کی نظروں میں اپنی خفت و بے توقیری کی ،اور تو سب رحم کرنے والوں سے زیادہ رحم کرنے والا ہے،اور تو ہی کمزوروں کی پرورش کرنے والا ہے،تو ہی میرا رب ہے، پھر تو مجھے کس کے سپرد کر رہا ہے؟ کسی غیر آدمی کے جو مجھ سے درشتی سے پیش آئے؟ یا کسی دشمن کے جو میرے ساتھ جو چاہے کرے؟ اگر تو مجھ سے ناراض نہو...... تو پھر مجھے ان سب چیزوں کی کوئی فکر نہیں، ہاں البتہ تیری دی ہوئی عافیت میرے لئے زیادہ بہتر ہے، میں تیرے مبارک نور کی پناہ طلب کرتا ہوں کہ جس سے تمام اندھیرے روشن ہوجاتے ہیں ،اور جس کی بناء پر دنیا وآخرت کے تمام کام درست ہوجاتے ہیں' اس بات سے کہ مجھ پر تیرا غضب نازل ہو، یا تیری ناراضگی مجھے آگھیرے، میرا کام بس یہی ہے کہ تجھے راضی کرنے اور منانے میں ہی لگا رہوں جب تک کہ تو راضی نہو جائے ......اور نہیں

(۱)الطبرانی فی الدعاء[۱/۳۱۵] السیرۃ النبویۃ لابن ہشام[۲/۲۶۸]

(۲)بعد میں کسی موقع پر جب ام المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے آپ ﷺ سے دریافت کیا تھا کہ یارسول اللہ کیا آپ کی زندگی میں اُحد کے دن سے بھی زیادہ مشکل کوئی دن گذرا ہے؟ اس پر آپؐ نے جواب دیا تھا کہ ہاں میری زندگی کا سب سے مشکل ترین دن''عقبہ'' کا دن تھا...... ملاحظہ ہو حدیث: کان أشد مالقیت منهم یوم العقبة...... (متفق علیہ)اس حدیث میں''عقبہ'' سے مراد طائف کی پہاڑی گھاٹیاں ہیں۔

ہے کوئی سہارا اور نہ ہی کوئی وسیلہ سوائے تیرے''۔

یہ باغ دراصل ربیعہ کے بیٹوں عتبہ اور شیبہ کی ملکیت تھا، اس وقت وہ دونوں کچھ فاصلے پر وہاں موجود تھے اور مسلسل رسول اللہ ﷺ کی نقل وحرکت کا مشاہدہ کر رہے تھے، آپؐ کی یہ حالت دیکھ کر...... اور پھر آپؐ کی اس عجیب وغریب دعاء کے یہ دل سوز کلمات سننے کے بعد...... ان کے دل میں کچھ رحم کے جذبات بیدار ہونے لگے، تب انہوں نے انگوروں کا ایک گچھا اپنے خادم کو دیتے ہوئے کہا کہ یہ انگور اس شخص (یعنی رسول اللہ ﷺ) کو دے آؤ، اس خادم کا نام عدّاس تھا، جو کہ نصرانی تھا اور اللہ کے نبی حضرت یونس علیہ السلام کے شہر ''نینویٰ'' کا باشندہ تھا، چنانچہ وہ انگوروں کا گچھا لئے ہوئے آپؐ کے قریب پہنچا اور انگور پیش کئے، آپؐ نے انگوروں کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے ''بسم اللہ'' کہا، جس پر وہ خادم انتہائی حیران ہوا، اور کہنے لگا کہ یہاں کے باشندے تو یہ الفاظ (یعنی بسم اللہ) نہیں کہتے......؟ اس پر آپؐ نے اس سے دریافت فرمایا کہ ''تم کہاں کے رہنے والے ہو؟'' اس نے جواب دیا ''میں نینویٰ کا رہنے والا ہوں'' آپؐ نے فرمایا ''اس کا مطلب ہے تم یونس بن متیٰ کے علاقے سے تعلق رکھتے ہو'' اس پر وہ مزید حیران ہوا، اور کہنے لگا '' آپ کو یونس بن متیٰ کے بارے میں علم کیسے ہوا؟'' آپؐ نے فرمایا ''یونس میرے بھائی تھے، میری ہی طرح وہ بھی اللہ کے نبی تھے''، آپؐ کی زبانی یہ بات سن کر عداس نے دیوانہ وار آپؐ کے ہاتھ پاؤں چومنا شروع کر دیئے...... اُدھر اس کے دونوں آقا عتبہ وشیبہ یہ منظر دیکھ کر آپس میں کہنے لگے ''لو...... یہ تو اب گیا کام سے''۔

اور جب عداس رسول اللہ ﷺ کے پاس سے واپس اپنے ان آقاؤں کے قریب پہنچا تو انہوں نے اس سے پوچھا کہ ''تم یہ کیا کر رہے تھے؟ اس شخص کے ہاتھ پاؤں کیوں اس

طرح چوم رہے تھے؟'' عدّ اس نے جواب دیا: ''اس وقت تمام روئے زمین پر ان سے بہتر کوئی اور شخص نہیں ہے...... انہوں نے مجھے ایک ایسی بات بتائی ہے جو کہ صرف اللہ کا کوئی نبی ہی بتا سکتا ہے''۔ اپنے غلام کی زبانی یہ بات سن کر ان دونوں نے اسے جھڑک دیا...... اور پھر قدرے توقف کے بعد اسے مخاطب کرتے ہوئے کہنے لگے ''تمہارا دین اس شخص کے دین سے بہتر ہے...... تم کہیں اس کی باتوں میں آکر اپنا دین نہ چھوڑ بیٹھنا''۔

اُس باغ میں اس مختصر سی راحت کے بعد آپ ﷺ وہاں سے آگے سوئے منزل یعنی مکہ مکرمہ کی جانب روانہ ہوگئے، راستے میں قرن الثعالب نامی مقام پر (۱) جب آپ ؐ پہنچے تو وہاں جبریل امین علیہ السلام نازل ہوئے اور فرمایا: اِنّ اللّٰہ قَد سَمِعَ قَولَ قَومِكَ لَكَ وَ مَا رَدُّوا عَلَيكَ یعنی ''اللہ تعالیٰ نے آپ کی قوم کا رویہ دیکھ لیا ہے اور آپ کی باتوں کا جو کچھ انہوں نے جواب دیا ہے' وہ بھی سن لیا ہے''۔

اور پھر مزید فرمایا: وَ قَد بَعَثَ اللّٰهُ اِلَيكَ مَلَكَ الجِبَالِ لِتَأمُرَهٗ بِمَا شِئتَ فِيهِم یعنی ''اللہ نے میرے ہمراہ آپ کیلئے پہاڑوں کے فرشتے کو بھی بھیجا ہے تا کہ ان اہلِ طائف کے بارے میں آپ اسے جو چاہیں حکم دیں''۔

تب ملک الجبال یعنی پہاڑوں کے فرشتے نے خود آگے بڑھ کر سلام کیا اور کہا: اِن شِئتَ أن أُطبِقَ عَلَيهِم الأخشَبَينِ لَفَعَلتُ یعنی ''اگر آپ حکم دیں تو میں ابھی ان دونوں پہاڑوں کو آپس میں ملا دوں'' (تا کہ یہ اہلِ طائف دونوں پہاڑوں کے درمیان کچلے جائیں اور یوں ان کا خاتمہ ہو جائے)

(۱) یہ مقام طائف سے مکہ جاتے وقت راستے میں آتا ہے اور آجکل ''قرن المنازل'' کے نام سے معروف ہے، ریاض، دمام، نیز خلیجی ممالک سے حج وعمرہ کیلئے زمینی راستے سے مکہ مکرمہ جانے والوں کیلئے ''میقات'' یہی مقام ہے۔

لیکن اس موقع پر پہاڑوں کے فرشتے کی طرف سے اس پیش کش کے جواب میں نبیٔ رحمت ﷺ کی زبان مبارک سے اپنے ان بدترین دشمنوں اور بدخواہوں کیلئے جوالفاظ نکلے...... عفوودرگذر کے باب میں انسانی تاریخ شاید کوئی ایسی مثال کبھی پیش نہیں کر سکے گی......

آپؐ نے اس فرشتے کو مخاطب کرتے ہوئے اپنے ان دشمنوں کے بارے میں فرمایا: بَل أرجُو أن یُخرِجَ اللّٰهُ عَزّ وَ جَلّ مِن أصلَابِهم مَن یَعبُدُ اللّٰهَ وَحدَهٗ لَا یُشرِك بِهٖ شَیئاً یعنی ''انہیں ہلاک نہ کرو، کیونکہ مجھے اللہ سے امید ہے کہ وہ ان کی آئندہ نسلوں میں ایسے لوگ پیدا فرمائے گا جو صرف اللہ کی عبادت کریں گے اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہیں ٹھہرائیں گے''۔(۱) (۲)

اس کے بعد رسول اللہ ﷺ نے مکہ کی جانب اپنا سفر جاری رکھا، جب آپؐ ''وادیٔ نخلہ''

(۱) صحیح بخاری[۳۲۳۱] کتاب بدء الخلق، باب: اذا قال أحدکم آمین...... نیز صحیح مسلم، باب ما لقی النبی ﷺ من أذیٰ المشرکین والمنافقین۔

(۲) پہاڑوں کے فرشتے کی طرف سے ان اہلِ طائف کو دونوں پہاڑوں کے درمیان یوں کچل کر ہلاک کر ڈالنے کی اس پیش کش کے جواب میں رسول اللہ ﷺ کی طرف سے یہ جواب ''رحمت وہمدردی'' کے باب میں اگرچہ رہتی دنیا تک تمام دنیائے انسانیت کیلئے ایک روشن مثال ہے......لیکن ہم برصغیر اور خصوصاً پاکستان سے تعلق رکھنے والوں کو اس موقع پر بطورِ خاص اس اہم ترین تاریخی حقیقت کا استحضار بھی کرنا چاہئے کہ برصغیر میں سب سے پہلے دینِ اسلام کی شمع لے کر جو کم سن سپہ سالار پہنچا...... وہ عظیم فاتح جس نے صرف سترہ برس کی عمر میں سندھ فتح کیا......یعنی محمد بن قاسم الثقفی رحمہ اللہ......اس کا تعلق بنوثقیف سے تھا، اور اہلِ طائف سب ثقفی ہی تھے۔اگرچہ بعد میں بعض انتظامی امور کے پیشِ نظر محمد بن قاسم کے والد نیز چچا (حجاج بن یوسف ثقفی) ودیگر متعدد اہلِ خاندان طائف سے بصرہ (عراق) منتقل ہوگئے تھے اور پھر فتح سندھ کے موقع پر محمد بن قاسم نے مکران، بلوچستان، سندھ اور ملتان کی جانب پیش قدمی کا سلسلہ بصرہ سے ہی شروع کیا تھا......لیکن اصل میں تو اس کا وطن طائف تھا، لہٰذا اگر اہلِ طائف ہلاک کر دیئے جاتے تو محمد بن قاسم بھی اس دنیا میں نہ آتا...... وللہ فی خلقہٖ شؤون۔

نامی مقام پر تھے، اتفاقاً اسی وقت وہاں سے ''جنوں'' کی ایک جماعت کا گذر ہوا، اس وقت آپؐ تلاوتِ قرآن میں مشغول تھے، جنوں نے آپؐ سے قرآن سنا تو اسی جگہ رک گئے اور دیر تک قرآن سنتے رہے......اور پھر اسلام بھی قبول کیا......سورۃ الجن کی ابتدائی آیات، نیز سورۂ احقاف کی آیات ۲۹ تا ۳۱ میں اسی واقعہ کی طرف اشارہ ہے۔(۱)

اور پھر نبوت کے دسویں سال ماہِ ذوالقعدہ میں آپ ﷺ واپس مکہ پہنچ گئے، جہاں موسمِ حج کے آغاز کے ساتھ ہی، حج کی غرض سے دوردراز کے علاقوں سے آنے والے مختلف قبائل نیز متعدد شخصیات کو آپؐ نے دینِ اسلام کی طرف دعوت دی، جس پر ان کی طرف سے ملا جلا ردِعمل سامنے آیا......!!

❁❁❁

(۱) قل أوحی الیّ أنه استمع نفرمن الجنّ فقالوا انا سمعنا قرآناً عجبا...... (الجن؛۱)
واذصرفنااليك نفراً من الجنّ يستمعون القرآن......(الأحقاف ؛ ۲۹۔۳۱)

اسراء ومعراج:

نبوت کے بارہویں سال ماہِ رجب میں وہ انتہائی عجیب وغریب واقعہ پیش آیا جوکہ ''اسراء ومعراج'' کے نام سے معروف ہے، اور جوکہ درحقیقت خالقِ کائنات کی طرف سے اپنے حبیب ﷺ کیلئے ایک ایسا اعزاز اور شرف تھا کہ جو تمام انبیائے کرام علیہم السلام کی مقدس وبرگزیدہ ترین جماعت میں سے صرف آپؐ ہی کو عطاء کیا گیا...... کسی اور نبی کے حصے میں یہ سعادت نہ آسکی۔

یہ واقعہ اپنی ابتداء سے انتہاء تک عجیب وغریب اور انتہائی محیرالعقول قسم کی باتوں پر مشتمل ہے، جس کا مختصر تذکرہ کچھ اس طرح کیا جاسکتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کو اللہ کے حکم سے بیت المقدس اور پھر ملأ اعلیٰ یعنی آسمانوں کی سیر کرائی گئی، جہاں آپؐ نے بہت کچھ دیکھا، جنت اور وہاں کی نعمتوں کا، نیز جہنم اور وہاں کے عذاب کا مشاہدہ کیا، مختلف آسمانوں پر مختلف انبیائے کرام علیہم السلام سے ملاقات بھی ہوئی، یہ تمامتر مسافت رات کے ایک مختصر سے حصے میں طے کر لی گئی اور آپؐ راتوں رات واپس مکہ مکرمہ بھی پہنچ گئے...... **بیشک اللہ ہر چیز پر قادر ہے......!!**

یہ سفر دو حصوں پر مشتمل تھا، پہلا حصہ زمینی سفر، یعنی مکہ مکرمہ سے بیت المقدس تک کا سفر، جس کا تذکرہ سورۃ الاسراء/ بنی اسرائیل کی پہلی آیت میں ہے(۱) سفر کے اس حصے کو ''اسراء'' کہا جاتا ہے، یہ سفر ''بُراق'' نامی جانور پر سوار ہو کر طے کیا گیا، جس کی تیز رفتاری کا یہ عالم تھا کہ جہاں نگاہ پہنچتی تھی وہاں اس کے قدم پہنچتے تھے۔

(۱) سُبحَانَ الّذي أسرىٰ بعَبدِهٖ لَيلاً مِنَ المَسجِدِ الحَرَامِ اِلىٰ المَسجِدِ الأقصىٰ ......

اس کے بعد آپ ﷺ کو جبریل امین کی معیت میں بیت المقدس سے آسمانوں تک لے جایا گیا، سفر کے اس حصے کو ''معراج'' کہا جاتا ہے، اس کا تذکرہ سورۃ النجم کی ابتدائی آیات میں ہے(۱)

اس موقع پر آپؐ کو تمام آسمانوں سے گذارنے کے بعد آخر ''سدرۃ المنتہیٰ'' تک' اور پھر اس سے بھی آگے لے جا کر قربِ الٰہی اور شرفِ ہمکلامی سے نوازا گیا، اور تب اسی موقع پر نماز کا تحفہ دیا گیا، جس سے نماز کی فضیلت واہمیت ثابت ہوتی ہے، کیونکہ باقی تمام عبادات کی فرضیت تو زمین پر ہوئی' جبکہ نماز کی فرضیت معراج کے موقع پر آسمانوں پر ہوئی، نیز یہ کہ باقی تمام عبادات کی فرضیت بذریعۂ وحی فرشتے کے توسط سے ہوئی، جبکہ نماز کی فرضیت براہِ راست ہوئی۔(۲)

اس یادگار سفرِ معراج کے موقع پر آپ ﷺ نے جنت اور جہنم کے مختلف مناظر کا مشاہدہ بھی کیا، مثلاً:

☆......بہت سے ایسے لوگوں کو دیکھا جو اپنے بہت موٹے پیٹ کی وجہ سے اپنی جگہ سے حرکت نہیں کر سکتے تھے، ان کی یہ حالت دیکھ کر آپؐ نے جبریل امین سے دریافت فرمایا کہ یہ کون لوگ ہیں؟ جبریل نے جواب دیا کہ یہ ''سود خور'' ہیں۔

☆......یتیموں کا مال کھانے والوں کو اس حال میں دیکھا کہ وہ اپنے منہ میں آگ بھر رہے

(۱) وَالنَّجْمِ اِذا هَوىٰ ، مَا ضَلَّ صَاحِبُكُم وَ مَا غَوَىٰ ......

(۲) یہاں یہ بات قابلِ غور ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی تسلی کیلئے معراج کا اور آسمانوں پر بلا کر مہمان نوازی کا انتظام کیا گیا...... اسی موقع پر آپؐ کی امت کیلئے نماز کا تحفہ عطاء کیا گیا...... اس کا مطلب یہ ہوا کہ ''نماز'' مؤمن کی معراج' نیز اللہ سے ملاقات ومناجات ہے، نماز میں بندے کیلئے اللہ کی طرف سے تسلی واطمینان کا سامان ہے، اور بے چین دل کیلئے سکون کا انتظام ہے۔

ہیں۔(۱)

☆......زانیوں کواس حالت میں دیکھا کہ وہ پاکیزہ اورتازہ گوشت چھوڑکرسڑاہوامتعفن اوربدبودارگوشت کھارہے ہیں۔

☆......غیبت اورچغلی کرنے والوں کودیکھا کہ ان کے لمبے لمبے پیتل اورتانبے کے ناخن ہیں، جن سے وہ اپنے چہروں اورسینوں کومسلسل بری طرح نوچ رہے ہیں۔

☆......مشرکینِ مکہ کاردِعمل:

رسول اللہ ﷺ راتوں رات جب اللہ کی قدرت سے بیت المقدس اورپھرآسمانوں کے اس سفرکے بعدواپس مکہ مکرمہ پہنچے اورمکہ والوں کواس سفرکے بارے میں مطلع فرمایاتواہلِ ایمان نے تصدیق کی، اوراسی نسبت سے خاص طورپرحضرت ابوبکررضی اللہ عنہ ہمیشہ کیلئے تاریخ میں ''صدیق'' کے لقب سے معروف ہوگئے۔(۲)

جبکہ مشرکینِ مکہ نے آپؐ کی زبانی اس سفرکی روداد سننے کے بعدآپؐ کابری طرح مذاق اڑایا، تماشابنایا، اورتمسخرواستہزاء کابازارگرم کردیا......اورپھربالآخرغوروفکرکے بعدیہ فیصلہ کیاکہ کیوں نہ محمد(ﷺ) کی سچائی جاننے کی غرض سے ان کاامتحان لیاجائے ...... آپؐ کواس سے قبل کبھی بیت المقدس یامسجدِاقصیٰ دیکھنے کااتفاق نہیں ہواتھا، جبکہ خودمشرکینِ مکہ میں بکثرت ایسے لوگ موجودتھے جن کی بسلسلۂ تجارت ملکِ شام اوربیت المقدس کی طرف آمدورفت رہتی تھی اوروہ بارہامسجدِاقصیٰ کانظارہ بھی کرچکے تھے، لہٰذااب ہم

(۱)جیساکہ قرآن کریم میں ارشادہے: اِنّ الّذِینَ یَأکُلُونَ أموَالَ الیَتَامیٰ ظُلماً اِنّمَا یَأکُلُونَ فِي بُطُونِھِم نَاراً وَسَیَصلَونَ سَعِیراً (النساء:۱۰) ترجمہ:''وہ لوگ جویتیموں کامال ناحق کھاتے ہیں بیشک وہ اپنے پیٹوں میں آگ بھررہے ہیں، اورعنقریب وہ خودبھی آگ ہی میں جاپہنچیں گے''۔یعنی اس آیت کی عملی تفسیرکارسول اللہ ﷺ کومشاہدہ کرادیاگیا۔ (۲) مصنف عبدالرزاق[۵/۳۲۸]

مشاورت کے بعد انہوں نے آپؐ سے مخاطب ہوتے ہوئے یہ تقاضا کیا: صِفْ لَنَا المَسْجِدَ یعنی مسجدِ اقصیٰ کے بارے میں ہمیں کچھ بتائیے......جس پر آپؐ انہیں مسجد اقصیٰ کے بارے میں بتاتے رہے، ان کے سوالات کے جوابات دیتے رہے......مگر بعض سوالات انہوں نے ایسے کئے جن کے جواب میں آپؐ کو کچھ تردد ہونے لگا، کیونکہ ظاہر ہے کہ آپؐ نے بیت المقدس اور مسجدِ اقصیٰ میں اپنے اس مختصر ترین قیام کے دوران وہاں کی ہر چیز کا بغور مشاہدہ تو نہیں کیا تھا......مزید یہ کہ یہ بات تو آپؐ کے وہم وگمان میں بھی نہیں تھی کہ اس بارے میں مشرکینِ مکہ کے ساتھ سوال وجواب کی نوبت آئے گی۔

چنانچہ اب ان کے مسلسل سوالات کے نتیجے میں آپؐ کو جب کچھ تردد ہونے لگا......تو اللہ کی قدرت سے بطورِ معجزہ کیفیت یہ ہوگئی کہ آپؐ کیلئے پردے ہٹا دیئے گئے اور مسافتیں سمیٹ دی گئیں، اور آپؐ کو یوں محسوس ہونے لگا گویا مسجد اقصیٰ بالکل آپؐ کی آنکھوں کے سامنے ہی موجود ہے(۱) اور تب آپؐ نہایت روانی کے ساتھ اور بلا کسی تردد کے ان کے ہر سوال کا جواب دینے لگے......اس پر وہ لوگ آپس میں سرگوشیاں کرتے ہوئے آپؐ کے بارے میں یوں کہنے لگے: أمّا النّعتُ فقَد أصابَ ...... یعنی ''مسجدِ اقصیٰ کی اوصاف وعلامات تو بالکل درست بیان کی ہیں''۔

یوں مشرکینِ مکہ نے رسول اللہ ﷺ کی اس سچائی کو جان بھی لیا......اور پھر خوب جانچ بھی لیا......مگر اس کے باوجود اس سچائی کو قبول نہیں کیا۔

(۱) جیسا کہ حدیث کے الفاظ ہیں: فَجِيئَ بِالمَسجِدِ حَتّیٰ وُضِعَ، فَنَعَتُّ المَسجِدَ وَ أنَا أنظُرُ اِلَيهِ یعنی گویا کہ مسجد میرے سامنے ہی لا کر رکھ دی گئی اور میں یوں انہیں مسجد کے اوصاف وعلامات بتاتا رہا گویا میں اپنی آنکھوں سے مسجد کا نظارہ کر رہا ہوں......(النسائی فی السنن الکبریٰ: ۱۰/ ۱۴۸)

سفرِ اسراء ومعراج میں حکمتیں:

☆......رسول اللہ ﷺ کیلئے تسلی وغمخواری کا انتظام:

اس یادگار، اہم ترین، نیز انتہائی محیر العقول قسم کے سفر یعنی ''اسراء ومعراج'' سے قبل مسلسل کچھ عرصہ تک پے در پے ایسی مشکلات وصعوبات کا ایک سلسلہ چلتا رہا جو رسول اللہ ﷺ کیلئے حد درجہ ذہنی وجسمانی صدمات اور پریشانیوں کا سبب بنتا رہا، مثلاً آپؐ کے مشفق ومہربان چچا اور سرپرست ابوطالب کی وفات......اور پھر کچھ عرصے بعد ہی آپؐ کی وفا شعار رفیقۂ حیات ام المؤمنین حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کا انتقال......جس کے نتیجے میں کیفیت یہ ہوئی کہ نہ باہر آپؐ کو سکون ملتا تھا......اور نہ ہی گھر کے اندر دل لگتا تھا۔

نیز یہ کہ ابوطالب کے بعد کفار ومشرکین کی طرف سے ایذاء رسانیوں کا سلسلہ بھی مزید شدت اختیار کر گیا......جس کے نتیجے میں آپؐ نے طائف کا رُخ کیا، مگر وہاں اہلِ طائف کی طرف سے انتہائی ظلم وجفاء اور پرلے درجے کی بدسلوکی کا سامنا کرنا پڑا......اور پھر اس کیفیت میں طائف سے مکہ واپسی پر مشرکینِ مکہ کی طرف سے مزید استہزاء وتمسخر اور طعن وتشنیع کا ایک لامتناہی سلسلہ چل نکلا۔

یہ ایک ہلکی سی تصویر ہے اس انتہائی تکلیف دہ اور آلام ومصائب سے بھرپور دور کی جس سے اُن دنوں آپ ﷺ کو گذرنا پڑ رہا تھا۔

ایسے میں خالقِ ارض وسماء کی طرف سے اپنے حبیب ﷺ کیلئے تسلی وغمخواری کا انتظام کیا گیا، ملاقات کا ایک سلسلہ ہوا، آسمانوں پر بلایا گیا، کہ اے ہمارے حبیبؐ! اگر یہ تمام زمین آپؐ پر تنگ کر دی گئی تو کیا ہوا؟ ہم نے تو آپؐ کیلئے آسمانوں کے دروازے کھول دیئے

ہیں......ابوطالب جیسامحسن ومددگار......اورخدیجہؓ جیسی ہمدردوفاشعارشخصیات اگرنہیں رہیں تو کیاہوا...... ہم تو موجود ہیں آپؐ کی تسلی وغمخواری کیلئے...... طائف والوں نے آپؐ کی میزبانی وخبرگیری کی بجائے اگرآپؐ کے ساتھ بدسلوکی کی ہے ......آپؐ پر پتھر برسائے ہیں......اورآپؐ کادل دکھایاہےتو کیاہوا......؟ ہم جوموجود ہیں آسمانوں پران سے بہت بہتر میزبانی کیلئے۔

لہٰذااس سفرِ معراج کے ذریعے جہاں ایک جانب رسول اللہ ﷺ کوعظیم ترین شرف اور بے مثال اعزاز سے نوازنامقصودتھا...... وہیں اس کے ساتھ ساتھ خالقِ ارض وسماء کی جانب سے اپنے حبیب ﷺ کیلئے مسلسل دکھوں اور پریشانیوں کے بعداب تسلی وغمخواری کاانتظام بھی مقصودتھا۔

☆......آئندہ پیش آنیوالے مراحل کیلئے تیاری:

رسول اللہ ﷺ کی حیاتِ مبارکہ اگرچہ اب تک مسلسل مشقتوں اورآزمائشوں سے بھرپورتھی،لیکن اب آئندہ عنقریب اس سے بھی بڑھ کرمزیدایسادورآنے والاتھاجس کیلئے اللہ سبحانہ وتعالیٰ پرمزید پختہ ایمان ویقین ازحدضروری تھا،مثلاً ہجرتِ مدینہ، وہاں نئے ماحول میں نئے مسائل کاسامنا،اورپھرکفارومشرکین کے خلاف غزوات کی ابتداء...... وغیرہ......غرضیکہ دینِ اسلام کی روشنی جواب تک مکہ شہرکی چاردیواریوں تک محدودتھی،اب وقت آگیاتھاکہ یہ روشنی مکہ شہرسے باہرنکلے اورتمام دنیا''لاالٰہ الااللہ'' کے نورسے جگمگا اٹھے...... بالفاظِ دیگراب مشکل ترین اورفیصلہ کن مرحلہ قریب تھا......اورظاہرہے کہ اس کیلئے یقیناًبہت بڑی عزیمت اورپختہ یقین ناگزیرتھا۔

جس طرح حضرت موسیٰ علیہ السلام کواللہ سبحانہ وتعالیٰ کی طرف سے جب فرعون جیسے سرکش،

انتہائی ظالم وجابراورمغروروِمتکبرانسان کے پاس جانے اوراسے اللہ کا پیغام پہنچانے کاحکم دیا گیاتوپہلے انہیں اللہ کی قدرت کا کچھ مشاہدہ کرایا گیا،جیسا کہ قرآن کریم میں ارشادہے: ﴿وَمَا تِلْكَ بِيَمِينِكَ يَا مُوسَىٰ﴾ (۱) یعنی ''اے موسیٰ آپ کے ہاتھ میں یہ کیاہے؟'' اورپھران کے ہاتھ میں موجوداس لاٹھی کوزمین پرڈالنے کاحکم دیا گیا،اورتب وہ لاٹھی بڑالہراتاہواسانپ بن گئی،اورجب اللہ کےحکم سےموسیٰ علیہ السلام نےاس سانپ کواپنے ہاتھ سے پکڑاتواب وہ سانپ دوبارہ لاٹھی بن گیا۔اوراسی طرح دوسری نشانی بھی دکھائی گئی کہ اپناہاتھ بغل میں ڈالنے کے بعدجب باہرنکالاتووہ خوب چمکنے لگا...... اوراس کے بعداللہ کی طرف سےارشادہوا:﴿لِنُرِيَكَ مِن آيَاتِنَا الْكُبْرَىٰ﴾ (۲)یعنی ''اے موسیٰ ہم آپ کواپنی بڑی بڑی نشانیاں دکھاناچاہتے ہیں''اورپھریہ حکم دیا گیا:﴿اِذهَبْ اِلَىٰ فِرعَونَ اِنَّهُ طَغَىٰ﴾ (۳)یعنی ''اب آپ فرعون کی طرف جایئے'اس نےتوبڑی سرکشی مچارکھی ہے''۔مقصدیہ کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی جانب سےحضرت موسیٰ علیہ السلام کوایک بہت بڑی ذمہ داری سونپے جانے سےقبل اللہ کی قدرت کامشاہدہ کرایا گیاتاکہ اس طرح اللہ پران کایقین وایمان مزیدپختہ ہوجائےاوراس فریضے کی راہ میں آئندہ آنے والی مشکلات کاسامناکرتےوقت کسی قسم کی گھبراہٹ یاترددکاشکارہونے کی بجائےوہ خوب ثابت قدم رہیں۔

بعینہٖ اسی طرح ہم دیکھتے ہیں کہ قرآن کریم میں سفرِ معراج کے تذکرہ کے ضمن میں ارشادہے:﴿لِنُرِيَهُ مِن آيَاتِنَا﴾ (۴)یعنی ''تاکہ ہم اسےاپنی قدرت کے کچھ نمونے دکھادیں''اس آیت میں خوداللہ سبحانہ وتعالیٰ کی طرف سےاس یادگارسفرکامقصدیہی بیان

(۱) طٰہٰ[۲۳] (۲) طٰہٰ[۲۴] (۳)النازعات[۱۷] (۴)الاسراء/بنی اسرائیل[۱]

کیا گیا ہے کہ اللہ کی طرف سے اپنے حبیب ﷺ کو اپنی کی قدرت کے کچھ نمونوں کا مشاہدہ ونظارہ کرانا مقصود تھا۔

اسی طرح قرآن کریم میں دوسرے مقام پر ارشاد ہے: ﴿لَقَدْ رَأَىٰ مِنْ آيَاتِ رَبِّهِ الْكُبْرَىٰ﴾ (۱) ترجمہ: ''یقیناً اس نے اپنے رب کی بڑی بڑی نشانیوں میں سے کچھ نشانیاں دیکھ لیں''، یعنی رسول اللہ ﷺ کو اس سفرِ معراج کے موقع پر اللہ کی قدرت کی بہت سی بڑی بڑی نشانیوں کا مشاہدہ ونظارہ کرا دیا گیا۔

اور ظاہر ہے کہ اس مشاہدے سے مقصود یہی تھا کہ اللہ پر یقین وایمان مزید پختہ ومستحکم ہو جائے ...... یعنی دعوتِ دین کے سلسلہ میں اب آئندہ پیش آنے والے مزید مشکل، اہم ترین اور فیصلہ کن مراحل کیلئے تیاری مقصود تھی۔

سفرِ اسراء ومعراج میں امت کیلئے سبق اور پیغام:

☆ ...... اللہ سے لو لگانے کی ضرورت:

سفرِ معراج سے قبل مسلسل ایسے حالات چل رہے تھے جو رسول اللہ ﷺ کیلئے بڑی پریشانی اور ذہنی صدمات کا باعث تھے، مثلاً ابوطالب کی وفات، اس کے بعد جلد ہی حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کا انتقال، اسی دوران مشرکینِ مکہ کی طرف سے ایذاء رسانی کے معاملے میں شدت وتیزی، اور پھر اہلِ طائف کی طرف سے انتہائی بدسلوکی وسنگدلی کا مظاہرہ ...... ایسی جاں گداز صورتِ حال میں آپؐ نے طائف سے واپسی پر دورانِ سفر ایک مقام پر رک کر نہایت خشوع وخضوع کے ساتھ اللہ سے دعاء ومناجات اور آہ وفریاد کا سلسلہ شروع کیا ...... آپؐ کی اس دعاء کی قبولیت کیلئے آسمانوں کے دروازے کھول دیئے گئے، مزید یہ

(۱) النجم [۱۸]

کہ اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کی جانب سے اپنے حبیب ﷺ کی دلجوئی وتسکینِ قلب کی خاطر عالمِ بالا کی سیر یعنی ''سفرِ اسراء ومعراج'' کا انتظام بھی کیا گیا۔

یقیناً اس میں ہمارے لئے یہ نہایت اہم سبق ہے کہ انسان کو ہمیشہ ہی اپنے خالق و مالک کے ساتھ اپنا تعلق اور رشتہ مضبوط و مستحکم رکھنا چاہئے، بالخصوص پریشانی اور مصیبت کے وقت تو اللہ کی مکمل اطاعت وفرمانبرداری کے ساتھ ساتھ اس سے دعاء ومناجات' آہ وفریاد اور اس سے لولگانے کا بہت زیادہ اہتمام کرنا چاہئے۔

☆......نماز کی پابندی کی ضرورت:

اسراء ومعراج کے اس یادگار واہم ترین موقع پر اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کی جانب سے اپنے حبیب ﷺ کو ''نماز'' کا تحفہ عطاء کیا گیا، تمام اسلامی عبادات میں سب سے پہلے نماز کی فرضیت ہوئی، نماز کی فرضیت معراج کے موقع پر آسمانوں پر ہوئی، جبکہ باقی تمام عبادات کی فرضیت زمین پر ہوئی کہ جبریل امین علیہ السلام کسی عبادت کی فرضیت کی خبر لے کر آئے، اور پھر یہ کہ نماز کی فرضیت فرشتے کے توسط کے بغیر اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کی جانب سے براہِ راست ہوئی، آخرت میں سب سے پہلے نماز ہی کے بارے میں سوال ہوگا، رسول اللہ ﷺ نے آخری وقت میں بالکل آخری وصیت نماز ہی کے بارے میں فرمائی......ان تمام باتوں سے دینِ اسلام میں نماز کی بہت بڑی اہمیت واضح وثابت ہوتی ہے۔

اس کے علاوہ یہ کہ رسول اللہ ﷺ کو پریشانیوں کے اُس دور میں بالآخر آسمانوں کا یہ سفر کرایا گیا، تسلی کا انتظام کیا گیا...... ہم بھی تو اللہ ہی کے بندے ہیں...... اور ہم بھی تو رسول اللہ ﷺ کے امتی ہیں......ہمیں بھی تو پریشانیاں ستاتی ہیں......کون ہے اس دنیا میں جسے کوئی بھی پریشانی نہ ہو......دنیا کی اس زندگی میں دکھ اور سکھ' خوشی اور غم' دھوپ اور چھاؤں'

نشیب اورفراز...... روشنی اوراندھیرا...... یہ سب کچھ تو ہرایک کے ساتھ لگا ہوا ہے...... ہرانسان کی یہی کہانی ہے......یہی قانونِ قدرت ہے......جس کے سامنے امیر وفقیر' چھوٹے بڑے' خادم ومخدوم' حاکم ومحکوم' سبھی بے بس اور لاچار ہیں......!

لہٰذا پریشانی اور صدمے کے وقت ہم کیا کریں......؟ ہم کہاں جائیں......؟ کس کے سامنے اپنا دکھڑا بیان کریں......؟ اور کس سے فریاد کریں......؟

اس اہم ترین سوال کا جواب یہی ہے کہ اللہ کی طرف سے جب اپنے حبیب ﷺ کیلئے مشکلات کے اُس دور میں اور صدمات کے اُس بھنور میں بذریعہ ''معراج'' تسلی وتسکین کا سامان کیا گیا......اسی رات اسی موقع پر ہی اپنے حبیب ﷺ کی امت کیلئے' یعنی ہمارے لئے بھی اسی تسلی وتسکین کا انتظام کردیا گیا...... یعنی ہمارے لئے ''نماز'' کا تحفہ عطاء کیا گیا...... یہ ''نماز'' ہمارے لئے معراج ہے...... یہ نماز ہمارے لئے اللہ سے ملاقات ہے...... یہ نماز اللہ سے دعاء ومناجات ہے...... یہ نماز اللہ اور بندے کے درمیان وابستگی وتعلق کا وسیلہ وذریعہ ہے...... یہ نماز اللہ کے سامنے اپنی بندگی ومحتاجی کا عملی اقرار واظہار ہے...... یہ نماز ٹوٹے ہوئے دل کی فریاد ہے......اس نماز میں ٹوٹے ہوئے دل کیلئے تسلی کا انتظام' اور بے قرار روح کیلئے تسکین کا سامان ہے......!

لہٰذا واقعہ ''اسراء ومعراج'' سے سبق حاصل کرتے ہوئے' ہمیں نماز کی مکمل پابندی کا خوب اہتمام کرنا چاہئے۔

☆......مسجد سے رشتہ جوڑنے کی ضرورت:

رسول اللہ ﷺ کو اللہ کے حکم سے اس سفرِ اسراء ومعراج پر مسجد سے لے جایا گیا۔یعنی عالمِ بالا کے اس سفر کی ابتداء اور اس ''روحانی پرواز'' کا آغاز مسجد سے ہوا' نہ کہ کسی اور مقام سے

یقیناً اس سے ''روحانی پرواز'' اور ''باطنی ارتقاء'' کیلئے مسجد کی اہمیت ثابت ہوتی ہے۔

لہٰذا مسلمان کیلئے یہ بات انتہائی ضروری ہے کہ وہ اپنی روزمرہ کی زندگی میں مسجد کے ساتھ اپنا رشتہ خوب جوڑ کر رکھے، یہی معنیٰ ومفہوم اس حدیث کا بھی ہے جس میں اس بات کا تذکرہ ہے کہ قیامت کے روز جب تمام کائنات میں کہیں کوئی سایہ نہیں ہوگا' اس روز سات قسم کے انسانوں کو اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کی طرف سے بطورِ خاص اپنے عرش کے نیچے سائے میں جگہ عنایت کی جائیگی، انہی میں سے ایک قسم کے لوگ وہ ہوں گے جن کا دنیا کی زندگی میں مسجد کے ساتھ ایسا مضبوط تعلق تھا کہ گویا ان کا دل بس مسجد کے ساتھ ہی جڑ کر رہ گیا تھا......!! (۱)

☆......''اخلاقی بلندی'' کیلئے فکر وجستجو کی ضرورت:

رسول اللہ ﷺ کو اس سفرِ اسراء ومعراج کے موقع پر ''بلندیوں'' پر لے جایا گیا اور ''عالمِ بالا'' کا مشاہدہ کرایا گیا۔

لہٰذا آپؐ کے امتی ہونے کی حیثیت سے ہماری بھی یہی کوشش وخواہش ہونی چاہئے کہ ہمیں بھی ''بلندی'' نصیب ہو، اور ''پستی'' سے ہم محفوظ ومأمون رہیں۔ اور اس مقصد کیلئے ہم اللہ اور رسول ﷺ کی اطاعت وفرمانبرداری کا اہتمام کریں، نیز ''بلند'' اخلاق وعادات اور ''اعلیٰ'' کردار اپنائیں...... بری عادات اور گھٹیا حرکات سے اپنا دامن بچائے رکھیں...... کیونکہ ایمان' عملِ صالح' نیز اعلیٰ اخلاق وکردار دراصل ''بلندی'' ہے، جبکہ اس کے برعکس برے کام کرنا اور بری عادات اپنانا ''پستی'' اور ''گراوٹ'' ہے......لہٰذا جب ہمارے نبیؐ

(۱) ملاحظہ ہو حدیث: سَبْعَةٌ يُظِلُّهُمُ اللّٰهُ فِي ظِلِّهِ يَومَ لَا ظِلَّ اِلَّا ظِلُّهُ ...... رَجُلٌ قَلْبُهٗ مُعَلَّقٌ فِي المَسَاجِدِ (بخاری [۶۲۹] باب من جلس فی المسجد ینتظر الصلاۃ وفضل المساجد۔

کو اس سفر کے موقع پر ''بلندیوں'' پر لے جایا گیا، تو پھر امتی کی حیثیت سے ہمیں یہ بات ہرگز زیب نہیں دیتی کہ ہم ''پستی'' اور ''گراوٹ'' میں مبتلا رہیں۔

ارشادِ ربانی: ﴿لَقَد خَلَقْنَا الِانسَانَ فِي أَحْسَنِ تَقوِيم ، ثُمّ رَدَدْنَاهُ أسفَلَ سَافِلِينَ ، اِلّا الّذينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصّالِحَاتِ فَلَهُم أجرٌ غَيرُ مَمنُونٍ﴾ کا یہی معنیٰ ومفہوم ہے۔ یعنی ''ہم نے انسان کو پیدا کیا بہترین صورت میں، پھر اسے نیچوں سے نیچا کر دیا، لیکن وہ لوگ جو ایمان لائے اور نیک عمل کرتے رہے' ان کیلئے اجر ہے کبھی نہ ختم ہونے والا''۔(۱)

ان آیات میں ''اسفل سافلین'' سے مراد عقیدہ وایمان کی خرابی اور بدعملی کے ساتھ ساتھ اخلاق وکردار کا گھٹیا پن اور گراوٹ بھی ہے جس کی وجہ سے جہنم میں ان کا ٹھکانہ سب سے نیچے ہوگا۔

☆......نوافل کی فضیلت:

حضرت ابو ہریرۃ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے حضرت بلال رضی اللہ عنہ کو مخاطب کرتے ہوئے ارشاد فرمایا: (يَا بِلَال! حَدِّثنِي بِأرجَىٰ عَمَلٍ عَمِلتَهٗ عِندَكَ فِي الِاسلَام ، فَاِنّي سَمِعتُ اللّيلَةَ خَشفَ نَعلَيكَ بَينَ يَدَيَّ فِي الجَنَّةِ) یعنی: ''اے بلال! قبولِ اسلام کے بعد آپ نے جو بہترین عمل انجام دیا ہے مجھے اس کے بارے میں بتائیے؟ کیونکہ آج رات میں نے آپ کی جوتیوں کی آواز جنت میں سنی ہے''۔

اس پر حضرت بلال رضی اللہ عنہ نے جواب دیا: مَا عَمِلتُ عَمَلاً فِي الِاسلَامِ أرجَى

---

(۱) سورۃ التین [۴-۵-۶]

عِندِي مَنفَعَةً ، مِن أنّي لَا أتَطَهَّرُ طُهُوراً تَامّاً فِي سَاعَةٍ مِن لَيلٍ وَلَا نَهَارٍ ، اِلَّا صَلَّيتُ بِذٰلِكَ الطُّهرِ مَا كَتَبَ اللّٰهُ لِي أن أُصَلِّي) (۱) یعنی: ''مسلمان ہونے کے بعد میرا وہ عمل جو میری نظر میں سب سے زیادہ مفید اور بہترین ہے' وہ یہ کہ رات یا دن کے کسی بھی حصے میں جب بھی میں خوب اچھی طرح وضوء کرتا ہوں' تو اس وضوء کے بعد اللہ مجھے جس قدر بھی توفیق عطاء فرمادے' میں کچھ نماز ضرور پڑھتا ہوں''۔

یعنی حضرت بلال رضی اللہ عنہ اپنا یہ معمول بیان فرمارہے ہیں کہ رات ہو یا دن' جب بھی میں وضوء کرتا ہوں تو حسبِ توفیق کچھ نہ کچھ نوافل ضرور پڑھ لیتا ہوں۔

یہی وہ عمل ہے جس کی بناء پر حضرت بلال رضی اللہ عنہ کو اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کی بارگاہ میں اس قدر بلند اور عظیم مقام ورتبہ نصیب ہوا کہ رسول اللہ ﷺ نے معراج کے موقع پر جنت میں حضرت بلال رضی اللہ عنہ کے قدموں کی آہٹ محسوس فرمائی۔

یقیناً اس سے نوافل کی فضیلت واہمیت ثابت ہوتی ہے، لہٰذا حسبِ توفیق نوافل کی ادائیگی کا ضرور اہتمام کیا جانا چاہیئے۔

☆......**ذکر اللہ کی فضیلت:**

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: (لَقِيتُ اِبرَاهِيمَ لَيلَةَ أُسرِيَ بِي ، فَقَالَ : يَا مُحَمّد! أقرِئ أُمَّتَكَ مِنِّي السّلَامَ ، وَأخبِرهُم أنّ الجَنَّةَ طَيِّبَةُ التُّربَةَ ، عَذبَةُ المَاءِ ، وَ أنَّهَا قِيعَانٌ ، وَ أنَّ غِرَاسَهَا : سُبحَانَ اللّٰهِ وَ الحَمدُ لِلّٰهِ ، وَ لَا اِلٰهَ اِلّا اللّٰهُ ، وَ اللّٰهُ أكبَرُ) (۲)
ترجمہ: ''شبِ معراج کے موقع پر میری ملاقات ابراہیم [علیہ السلام] سے ہوئی، تب انہوں

(۱) مسلم [۲۴۵۸] (۲) مشکاۃ المصابیح [۲/۴۹۳]

نے مجھے مخاطب کرتے ہوئے فرمایا: ''اے محمد! اپنی امت کو میرا سلام کہئے گا، نیز انہیں میرا یہ پیغام بھی پہنچا دیجئے گا کہ جنت کی مٹی تو نہایت خوشگوار ہے، وہاں کا پانی خوب میٹھا ہے، وہاں کی زمین ہموار ہے، اور اس کی گھاس ''سُبْحَانَ اللّٰہِ وَ الحَمْدُ لِلّٰہِ ، وَلا اِلٰہَ اِلّا اللّٰہُ ، وَ اللّٰہُ أکبَرُ'' ہے۔

یعنی ''جنت'' تو بہت ہی عمدہ مقام ہے اور وہاں کے مناظر انتہائی دلکش اور جاذبِ نظر ہیں......لہٰذا ہر مسلمان کو خوب ذوق وشوق اور ہمت کے ساتھ جنت کے حصول کیلئے کوشش وجستجو کرنی چاہئے، اور اس مقصد کیلئے یہ بات بھی معلوم ہونی چاہئے کہ وہاں کی لہلہاتی کھیتیوں اور سرسبز وشاداب باغوں میں پہنچنے کیلئے طریقہ یہ ہے کہ ''سُبْحَانَ اللّٰہِ وَ الحَمْدُ لِلّٰہِ ، وَ لَا اِلٰہَ اِلّا اللّٰہُ ، وَ اللّٰہُ أکبَرُ'' کا خوب ورد کرتے رہنا چاہئے۔

یقیناً اس سے ''ذکر اللہ'' کی بہت زیادہ اہمیت وفضیلت ثابت ہوتی ہے۔

معراج کے بعد:

سفرِ اسراء ومعراج سے واپسی کے بعد رسول اللہ ﷺ مزید ذوق وشوق اور ہمت وجذبے کے ساتھ خلقِ خدا کو پیغامِ حق پہنچانے میں مشغول ومنہمک ہوگئے۔ البتہ اب آپؐ کی زیادہ توجہ قریش کی بجائے ان قبائل کی طرف تھی جو مکہ شہر سے باہر مضافاتی علاقوں میں آباد تھے، مثلاً بنو عامر' غسان اور کندہ وغیرہ، نیز مذہبی' تجارتی ومعاشی امور کی خاطر بیرونِ مکہ سے آنے والے افراد یا قبائلی وفود وغیرہ......چنانچہ ان دنوں آپؐ نے اس سلسلے میں مختلف وفود اور شخصیات سے ملاقاتیں کیں۔

☆......انہی دنوں مدینہ (جس کا نام اس دور میں یثرب تھا) سے تعلق رکھنے والے ''سوید

بن الصامت'' نامی ایک مشہور شاعر اور دانشور کی مکہ آمد ہوئی، یہ صاحب شعر و شاعری کے علاوہ مزید یہ کہ عوام وخواص کی مختلف محافل وتقریبات میں اپنے مخصوص دلنشیں انداز میں ''کلامِ لقمان حکیم'' سنایا کرتے تھے، جس کی وجہ سے لوگ ان سے بہت متأثر تھے، اور اسی بناء پر عوام وخواص میں ان کی اچھی خاصی شہرت اور مقبولیت تھی...... نیز یہ کہ اپنے خاندان اور حسب ونسب کے لحاظ سے بھی کافی معزز سمجھے جاتے تھے۔

ان کی آمد کے موقع پر مشرکینِ مکہ کو یہ سوچ کر بڑی تشویش ہوئی کہ کہیں یہ صاحب رسول اللہ ﷺ سے متأثر ہوکر مسلمان نہ ہوجائیں، کیونکہ ان کے مخصوص انداز کی وجہ سے لوگ تو پہلے ہی ان سے بہت متأثر ہیں...... اور اگر یہ مسلمان ہوگئے...... تو پھر یہ ہر جگہ...... ہر محفل میں ''کلامِ لقمان'' کی بجائے ''قرآن'' سنایا کریں گے...... تب ہمارا کیا بنے گا؟ یہ بات سوچ کر مشرکینِ مکہ نے ہر ممکن کوشش کی کہ رسول اللہ ﷺ سے ان کی ملاقات نہ ہو سکے...... لیکن اس کے باوجود ملاقات ہوگئی، اس ملاقات کے موقع پر آپ ؐ نے انہیں دینِ اسلام کے بارے میں اور قرآن کے بارے میں بتایا، جس پر یہ کہنے لگے کہ میرے پاس تو خود بہت عمدہ کلام ہے...... یعنی کلامِ لقمان...... اور پھر آپ ؐ کو یہ کلام سنایا، اس پر آپ ؐ نے فرمایا ''یقیناً یہ بہت عمدہ کلام ہے'' لیکن میرے پاس تو ''کلام اللہ'' ہے، جو کہ تمہارے پاس موجود اس ''کلامِ لقمان'' سے بہت بہتر ہے...... اور پھر آپ ؐ نے قرآن کریم کی چند آیات تلاوت فرمائیں، جس پر یہ صاحب انتہائی متأثر ہوئے، اور کہا کہ واقعی یہ کسی انسان کا کلام نہیں ہوسکتا...... بیشک یہ تو اللہ ہی کا کلام ہے......!

چنانچہ سوید بن الصامت آپ ؐ کی دعوت پر لبیک کہتے ہوئے مسلمان ہوگئے، لیکن اس کے بعد انہیں رسول اللہ ﷺ کی صحبت ومعیت میں رہنے کا موقع نہیں مل سکا اور جلد ہی اپنے شہر

مدینہ کی جانب واپس روانہ ہوگئے، جہاں واپسی کے چندروز بعد ہی اوس وخزرج کے مابین ایک جنگ کے دوران ان کی وفات ہوگئی۔

☆......اسی طرح انہی دنوں حجاز اور یمن کے درمیان واقع ''تہامہ'' نامی علاقے سے تعلق رکھنے والے مشہور ومعروف اور طاقتور قبیلے ''الدوس'' کے سردار ''طفیل بن عمرو الدوسی'' کی مکہ آمد ہوئی، مشرکینِ مکہ نے ان کا نہایت گرمجوشی کے ساتھ استقبال کیا اور خوب آؤ بھگت کی، اس کے بعد انہیں رسول اللہ ﷺ سے خوب خوفزدہ کرتے ہوئے خبردار کیا کہ (نعوذ باللہ) اس شخص کا جادو اس قدر طاقتور ہے کہ اس کی تأثیر سے بچنا انتہائی مشکل ہے، لہٰذا تم اس شخص سے بہت دور رہنا...... اور خاص طور پر یہ کوشش کرنا کہ اس کی کوئی بات تمہارے کانوں تک نہ پہنچنے پائے، ورنہ تمہارے لئے بڑی مشکل کھڑی ہو جائیگی، تمہاری یہ شان وشوکت اور سرداری بھی جاتی رہے گی...... نیز رسول اللہ ﷺ کے بارے میں اسے مزید خبردار کرتے ہوئے یہ بھی بتایا کہ وہ اکثر بیت اللہ کے قریب ہی نظر آیا کرتے ہیں۔

چنانچہ مشرکینِ مکہ کی نصیحت پر عمل کرتے ہوئے احتیاطی تدبیر کے طور پر بیت اللہ کی طرف روانگی کے وقت طفیل نے اپنے کانوں میں روئی ٹھونس لی، تاکہ اگر وہاں رسول اللہ ﷺ موجود ہوئے تو ان کی کوئی بات ان کے کانوں تک نہ پہنچ سکے......اور جب یہ بیت اللہ کے قریب پہنچے اور طواف شروع کیا تو وہاں ان کی نظر رسول اللہ ﷺ پر پڑی جو اس وقت وہاں قرآن کریم کی تلاوت میں مشغول تھے، کسی طرح آپؐ کی کچھ آواز ان کے کانوں میں پڑ گئی اور جو کچھ ان کے کانوں نے سنا اس سے یہ بہت متأثر ہونے لگے اور اس میں انہیں انتہائی حلاوت اور کشش محسوس ہونے لگی......تب انہوں نے مزید خوب اچھی طرح روئی اپنے کانوں میں ٹھونسی......تاکہ ''سحر زدہ'' نہ ہوجائیں......لیکن بے اختیار ان کا دل اس انتہائی

مؤثر و دلنشیں کلام کو دوبارہ سننے کیلئے بیقرار ہونے لگا......آخرانہوں نے دل ہی دل میں خود کو ملامت کرتے ہوئے سوچا کہ میں کوئی معمولی یا نکما انسان تو نہیں ہوں...... میں تو اپنے اتنے بڑے اور اس قدر طاقتور قبیلے کا سردار ہوں......تو پھر اس شخص کے کلام سے اتنا خوف کس لئے......؟ میں کوئی ناسمجھ بچہ تو نہیں ہوں...... میں عقلمند ہوں...... دانشمند ہوں...... اچھے اور برے کی مجھے خوب تمیز ہے...... اور میں تو نہایت فصیح و بلیغ ادیب اور پہنچا ہوا شاعر اور خطیب بھی ہوں...... مجھے درست اور غلط کلام کی خوب پہچان ہے......تو پھر یہ اتنا خوف آخر کس لئے......؟ مجھے اس شخص کا کلام سن لینا چاہئے ...... اور تب میں خود فیصلہ کرلوں گا کہ اس کا کلام صحیح ہے یا غلط......اچھا ہے یا برا......اور پھر بالآخر انہوں نے اپنے کانوں سے وہ روئی نکال پھینکی......اور انتہائی دلچسپی کے ساتھ رسول اللہ ﷺ کی تلاوتِ قرآن کی طرف متوجہ ہوگئے......اور پھر کچھ دیر بعد جب رسول اللہ ﷺ وہاں سے اپنے گھر کی جانب روانہ ہوئے تو یہ بھی پیچھے ہولئے ...... اور آپؐ کے گھر پہنچ کر اپنا تعارف کرایا......آمد کا مقصد بیان کیا......اور پھر مشرف باسلام ہوگئے......!

اور پھر مکہ سے واپس اپنے قبیلے میں پہنچنے کے بعد نہایت سرگرمی اور زوروشور کے ساتھ دینِ اسلام کی تبلیغ شروع کردی، جس کے نتیجے میں رفتہ رفتہ تمام قبیلہ مسلمان ہوگیا...... اور اس سلسلے میں ایک خاص قابلِ ذکر بات یہ کہ رسول اللہ ﷺ کے انتہائی جلیل القدر صحابی اور آپؐ کی احادیثِ مبارکہ کے ایک بہت بڑے ذخیرے کے راوی حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کا تعلق بھی اسی قبیلے سے تھا، وہ بھی انہی دنوں اپنے قبیلے کے سردار یعنی طفیل بن عمرو الدوسی رضی اللہ عنہ کی تبلیغی کوششوں اور دعوتی سرگرمیوں کے نتیجے میں ہی مسلمان ہوئے تھے۔

نئی منزل کی امید:

رسول اللہ ﷺ گذشتہ گیارہ برس سے مسلسل مکہ میں گلی گلی اور کوچہ کوچہ گھوم کر شب وروز پیغامِ حق پہنچانے میں مشغول تھے......مگر......اب اتنا طویل عرصہ گذر جانے کے بعد آپ ﷺ کو مکہ کی بجائے بہت دور ایک جگہ سے امید کی کرنیں پھوٹتی ہوئی نظر آنے لگیں، اور اب ٹھنڈی ہوا کے جھونکے وہاں سے آتے ہوئے محسوس ہونے لگے......!

آپؐ کو خواب میں آپؐ کے ''دارالہجرۃ'' کا مشاہدہ کرایا گیا، آپؐ نے خواب میں ایک ایسی جگہ دیکھی جہاں نخلستان یعنی کھجوروں کے باغ بکثرت تھے، ظاہر ہے کہ انبیائے کرام علیہم السلام کے خواب سچے ہوا کرتے ہیں، لہٰذا آپؐ یہ اشارہ سمجھ گئے کہ مجھے میرا ''دارالہجرۃ'' دکھایا گیا ہے۔

چنانچہ آپؐ کا ذہن کبھی ''تہامہ'' کی جانب جاتا...... اور پھر کبھی آپؐ کو اپنا وہ سفر یاد آتا جو آپؐ نے بہت بچپن میں......صرف چھ سال کی عمر میں......اپنی والدہ کے ہمراہ کیا تھا...... یعنی ''سفرِ مدینہ''......جب آپؐ خوب غور وفکر کرتے تو بچپن کی ان بھولی بسری یادوں کے درمیان ......آپؐ کے تصور میں مدینہ (جو اُس وقت ''یثرب'' تھا) کا جو نقشہ ابھر کر سامنے آتا......وہ کچھ ایسا ہی تھا...... کہ ہر طرف پھیلے ہوئے بکثرت کھجوروں کے باغ......اور تب مدینہ کیلئے آپؐ کا شوق مزید بڑھ جاتا۔

اسی دوران نبوت کے گیارہویں سال ایامِ حج کے دوران ایک رات آپ ﷺ منیٰ میں بیرونِ مکہ سے آئے ہوئے حجاج کی اقامت گاہوں میں گھوم پھر کر دعوتِ دین اور پیغامِ حق پہنچانے میں مشغول تھے، اس موقع پر آپؐ کے ہمراہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ، نیز

حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ بھی ہمراہ تھے، تب وہاں آپ ﷺ کی ملاقات چھ افراد سے ہوئی جو کہ ''یثرب'' یعنی مدینہ کے باشندے تھے، آپؐ نے انہیں اپنی نبوت نیز دینِ اسلام کے بارے میں بتایا، اور پھر انہیں یہ دینِ برحق قبول کرنے کی دعوت دی۔

آپ ﷺ کی زبانِ مبارک سے یہ سب کچھ سننے کے بعد یہ لوگ گہری سوچ میں پڑ گئے، باہم سرگوشی کے انداز میں یوں کہنے لگے ''کہیں یہی وہ آخری نبی نہوں کہ جن سے ہمیں ہمارے یہودی پڑوسی ڈراتے رہتے ہیں''۔

دراصل مدینہ اور مکہ کے ماحول میں ایک بہت بڑا فرق یہ تھا کہ مکہ کے باشندے اگرچہ معمارِ کعبہ اور اپنے جدِ امجد یعنی حضرت ابراہیم علیہ السلام کے نام سے تو واقف تھے، لیکن آسمانی ادیان' نبوت' یا اسی طرح آسمانی والہامی کتب کا ان کے یہاں قطعاً کوئی تصور نہیں تھا، یہی وجہ تھی کہ وہ رسول اللہ ﷺ کی شدید ترین مخالفت پر کمربستہ تھے اور آپؐ کی بات قبول کرنے پر کسی صورت آمادہ نہیں تھے۔

جبکہ اس کے برعکس مدینہ میں یہود کی بڑی تعداد تھی جو کہ نسل درنسل صدیوں سے وہاں آباد تھے، اور وہ نہ صرف یہ کہ وہاں کے اصل باشندوں یعنی عربوں کو نبوت اور گذشتہ انبیائے کرام علیہم السلام کے بارے میں بتاتے رہتے تھے' بلکہ مزید یہ کہ وہ اپنی برتری اور ان کی کمتری جتانے کی غرض سے انہیں یہ کہہ کر خوف زدہ بھی کرتے رہتے تھے کہ اب آخری نبی کے ظہور کا وقت آچکا ہے...... ان کا ظہور اب کسی بھی وقت متوقع ہے...... نیز یہ کہ جب وہ ظاہر ہو جائیں گے تو ہم ان کے ساتھ مل کر تم لوگوں کو خوب مارا پیٹا کریں گے، اور چونکہ وہ اللہ کے نبی ہوں گے اس لئے اللہ کی طرف سے ان کیلئے نصرت و تائید بھی ضروری ہوگی...... لہٰذا ہمیشہ ہم غالب و فاتح ہوا کریں گے اور تم مغلوب و مقہور......!

یہود کی طرف سے اس قسم کی باتیں وقتاً فوقتاً سنتے رہنے کی وجہ سے مدینہ کے ان عرب باشندوں کے ذہنوں میں ''نبوت'' اور ''انبیاء'' کا تصور موجود تھا، اور یہ ان کیلئے کوئی نئی یا عجیب وغریب بات نہیں تھی کہ جسے رسول اللہ ﷺ کی زبانی وہ سنتے ہی یکسر ٹھکرا دیتے یا رد کر دیتے، لہٰذا مشرکینِ مکہ کے برعکس انہوں نے یہ بات سن کر کوئی جارحانہ رویہ اختیار نہیں کیا، اور نہ ہی کسی خاص حیرت یا تعجب کا اظہار کیا۔

اس کے علاوہ یہ کہ سالہا سال سے مدینہ میں ان کی کیفیت یہ چلی آرہی تھی کہ یہ باہم جنگ وجدال میں مشغول تھے، ایک دوسرے کے خلاف برسرِ پیکار تھے، اوس وخزرج کے مابین تباہ کن جنگوں کے اس لامتناہی سلسلے نے انہیں برباد کر رکھا تھا، اپنے تمامتر وسائل جنگ کی آگ میں جھونک دینے کے باعث معاشی طور پر یہ کنگال ہو چکے تھے، اوپر سے یہودی انہیں وقتاً فوقتاً مزید بڑی خطیر رقم بطورِ قرض دیتے، اور پھر سود در سود کا سلسلہ چلتا رہتا، جس کی وجہ سے یہ مزید کنگال...... جبکہ یہودی مزید خوشحال ہوتے چلے جاتے...... اگر کبھی اوس وخزرج میں صلح کے امکانات نظر آنے لگتے تو یہ یہودی اپنی عیاری ومکاری اور خفیہ سازشوں کے ذریعے فتنے کی اس آگ کو دوبارہ بھڑکا دیتے۔

یہ ایسی خوفناک صورتِ حال تھی کہ جس کی وجہ سے مدینہ کے یہ عرب قبائل انتہائی اضطراب اور بے چینی میں مبتلا تھے، لڑتے لڑتے اب وہ تنگ آچکے تھے، اور ان کی شدید خواہش تھی کہ کسی طرح اس خوفناک جنگ سے اب انہیں نجات نصیب ہو سکے کہ جس نے انہیں تباہ وبرباد کر کے رکھ دیا ہے......!

یہی وجہ تھی کہ ایسی پریشان کن صورتِ حال میں جب انہوں نے حج کے موقع پر رسول اللہ ﷺ کی زبانی دینِ اسلام کے بارے میں سنا...... تو وہ گہری سوچ میں ڈوب گئے، اور باہم

سرگوشیاں کرنے لگے کہ ''ہم تو پہلے ہی بری طرح برباد ہیں...... اگر یہود کو رسول اللہ ﷺ کے ظہور کی خبر ہوگئی تو پھر ایسا نہو کہ وہ ہم سے پہلے ہی مسلمان ہوجائیں، اور یوں آپ ﷺ کو وہ اپنے ساتھ ملالیں...... اگر ایسا ہوا تو اس کا یقینی نتیجہ یہ ہوگا کہ ہماری تباہی و بربادی کے ایک نئے سلسلے کا آغاز ہوجائے گا...... جبکہ اگر یہود سے قبل ہم مسلمان ہوجائیں، تو شاید اس طرح اس دینِ برحق کی برکت سے ہمیں باہم قتل وخونریزی کے اس عذاب سے نجات نصیب ہوجائے اور ہمارے حالات دوبارہ سدھر جائیں۔

چنانچہ وہ کچھ دیر آپس میں اسی بارے میں تبادلۂ خیال اور سرگوشیاں کرتے رہے...... اور پھر جلد ہی باہمی صلاح ومشورے کے اس سلسلے کے بعد انہوں نے قبولِ اسلام کیلئے اپنی آمادگی کا اظہار کیا، اور رسول اللہ ﷺ کے دستِ مبارک پر بیعت کرتے ہوئے مشرف باسلام ہوگئے۔

اور یوں مناسکِ حج سے فراغت کے بعد یہ چھ افراد پہلی بار ''توحید'' کا نور اپنے ہمراہ لئے ہوئے مکہ سے مدینہ کی جانب روانہ ہوگئے۔

بیعتِ عقبہ اُولیٰ:

دوسرے سال یعنی نبوت کے بارہویں سال موسمِ حج کے موقع پر مدینہ سے حجاجِ بیت اللہ کا جو قافلہ آیا' اس میں بارہ افراد ایسے تھے جنہوں نے مکہ میں رسول اللہ ﷺ سے خفیہ ملاقات کا منصوبہ بنا رکھا تھا، ان میں سے پانچ افراد انہی چھ میں سے ہی تھے جن کی گذشتہ سال آپؐ سے ملاقات ہوئی تھی اور تب وہ آپؐ کی دعوت پر لبیک کہتے ہوئے مشرف باسلام ہوگئے تھے، جبکہ ان کے علاوہ سات نئے افراد تھے، یوں ان کی کل تعداد بارہ تھی۔

ایامِ حج کے دوران پہلے سے طے شدہ منصوبے کے مطابق ایک اندھیری رات میں منیٰ میں عقبہ کے مقام پر انہوں نے رسول اللہ ﷺ سے ملاقات کی اور آپؐ کے دستِ مبارک پر بیعت کی، ایامِ حج کے بعد یہ لوگ واپس مدینہ چلے گئے، روانگی سے قبل انہوں نے رسول اللہ ﷺ کے سامنے اس خواہش کا اظہار کیا کہ ان کی دینی تعلیم وتربیت کی غرض سے مسلمانوں میں سے اگر کوئی ان کے ہمراہ مدینہ جا سکے تو بہت اچھی بات ہوگی......اس پر آپ ﷺ نے نوجوان صحابی حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ کو ان کے ہمراہ روانہ فرما دیا۔ جو کہ آپؐ کے پہلے سفیر کی حیثیت سے‘ نیز پہلے معلم کے طور پر مدینہ پہنچے، اور پھر ان کی مسلسل جدوجہد اور سعیٔ پیہم کے نتیجے میں بہت جلد وہاں مدینہ کے ہر گھر میں اور ہر گلی کوچے میں دینِ اسلام اور پیغمبرِ اسلام کا چرچا ہونے لگا......گھر گھر توحید کی شمع روشن ہونے لگی، اور یوں مدینہ شہر ''لا الٰہ الا اللہ'' کے نور سے جگمگانے لگا۔

بیعتِ عقبہ ثانیہ:

اگلے ہی سال یعنی نبوت کے تیرہویں سال مدینہ سے آئے ہوئے حجاجِ بیت اللہ کے درمیان پچھتر ایسے افراد تھے(۱) جنہوں نے اپنی آمد سے قبل ہی رسول اللہ ﷺ کے ساتھ منیٰ میں خفیہ ملاقات طے کر رکھی تھی، اور یہ پیغام بھی بھجوایا تھا کہ اب آپؐ مکہ چھوڑ کر ہمارے پاس مدینہ تشریف لے آیئے۔

چنانچہ ایک اندھیری رات جب آپ ﷺ طے شدہ منصوبے کے مطابق عقبہ میں ان سے ملاقات کی غرض سے مکہ سے منیٰ کی طرف روانہ ہونے لگے تو آپ ﷺ کے چچا حضرت

(۱)۷۳ مرد اور دو عورتیں؛ نُسیبہ بنت کعب اور اسماء بنت عمرو۔

عباسؓ نے ساتھ جانے پر اصرار کیا، حالانکہ وہ اُس وقت تک مسلمان نہیں ہوئے تھے، اپنے پرانے دین پر ہی قائم تھے، لیکن اپنے بھتیجے (یعنی رسول اللہ ﷺ) کے ساتھ محبت وشفقت کا یہ عالم تھا کہ انہوں نے اس بات کو گوارا نہیں کیا کہ اس قدر خطرہ مول لیتے ہوئے ان کا بھتیجا تنہا وہاں جائے...... ایک تو راستے میں قدم قدم پر مشرکینِ مکہ کی طرف سے خطرہ...... اوراس کے علاوہ مزید یہ کہ انہیں کچھ اندازہ ہو چکا تھا کہ اس ملاقات میں آپؐ شاید اب مستقل طور پر مکہ سے مدینہ منتقل ہوجانے کے بارے میں ان لوگوں کے ساتھ کچھ گفت وشنید کریں گے اوراس سلسلے میں کچھ اہم معاملات طے کئے جائیں گے......!

چونکہ یہ انتہائی نازک معاملہ تھا...... لہٰذا حضرت عباسؓ کی یہ خواہش تھی کہ اس اہم اورحساس ترین معاملے پر گفت وشنید کے موقع پر وہ بھی موجود ہوں اور فریقین کے مابین اس بارے میں جو کچھ بھی طے ہو وہ ان کی موجودگی میں ہو، تاکہ ان کا پیارا بھتیجا کسی مشکل میں نہ پھنس جائے......!

اپنے چچا کے اصرار کو دیکھتے ہوئے آپؐ انہیں ہمراہ لے جانے پر آمادہ ہوگئے، اور یوں یہ دونوں حضرات اندھیری رات میں...... چھپتے چھپاتے...... مکہ سے منیٰ جا پہنچے، جہاں مدینہ سے آئے ہوئے ان افراد کے ساتھ ملاقات ہوئی اور گفت وشنید کا آغاز ہوا۔

اس موقع پر ان افراد نے آپؐ کے دستِ مبارک پر قبولِ اسلام کی بیعت کی، اوراس کے بعد آپؐ کو مستقل طور پر مدینہ چلے آنے کی باقاعدہ دعوت دی......!

یہی وہ اہم ترین موقع تھا جس کی نزاکت کے پیشِ نظر آپؐ کے چچا حضرت عباس رضی اللہ عنہ ساتھ چلنے پر مصر تھے، چنانچہ اس مرحلے پر دونوں طرف سے خوب قول وقرار کا سلسلہ ہوا اور تکلف کو ایک جانب رکھتے ہوئے خوب صاف صاف باتیں ہوئیں...... تاکہ فریقین میں

سے کسی کے ذہن میں کوئی ابہام یا کوئی اندیشہ باقی نہ رہے۔

دورانِ گفتگو ایک موقع پر حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے یہاں تک فرمایا کہ اگر تم ہمارے بھتیجے کو اپنے شہر چلے آنے کی دعوت دینے کے بعد پھر وہاں خاطر خواہ طریقے سے ان کی حفاظت نہ کر سکے......تو......بہتر ہوگا کہ ابھی سے بتا دو...... کیونکہ ہم ان کی حفاظت کرتے چلے آئے ہیں......اور آئندہ بھی کرتے رہیں گے......!!

اس پر مدینہ کے ان باشندوں نے کہا کہ اللہ کی قسم ہم زندگی بھر خود اپنی جان و مال، اپنی عزت وآبرو نیز اپنے اہل وعیال سے بڑھ کر رسول اللہ ﷺ کی حفاظت کریں گے، اور اس مقصد کیلئے کسی بڑی سے بڑی قربانی سے دریغ نہیں کریں گے۔

تب اس موقع پر انہی میں سے ایک شخص مزید یوں گویا ہوا: ''ہماری اس ملاقات میں جب صاف گوئی اس حد تک پہنچ چکی ہے تو پھر میں بھی ایک اندیشے کا اظہار کر ہی دوں ......کہ مختلف عرب قبائل کے ساتھ ہمارے مختلف قسم کے معاہدات ہیں، نیز خود مدینہ شہر کے اندر موجود یہود کے ساتھ کئے گئے ہمارے معاہدات کا ایک سلسلہ چلا آ رہا ہے......لیکن اب ہمارے قبولِ اسلام اور پھر آپؐ کے ساتھ اس معاہدے کے بعد وہ تمام معاہدات کالعدم تصور کئے جائیں گے ...... اور یوں اے اللہ کے رسول ! آپ کی جانب دوستی کا ہاتھ بڑھانے اور آپ کو اپنے شہر میں پناہ دینے کی وجہ سے گویا ہم پورے عرب میں تنہا رہ جائیں گے......ہمیں قریشِ مکہ و دیگر تمام عرب قبائل کی دشمنی......حتیٰ کہ خود اپنے شہر مدینہ کے اندر موجود قبائلِ یہود کی دشمنی ومخالفت کا سامنا کرنا پڑے گا...... اور آئندہ چل کر جب اللہ کی طرف سے آپ کو فتح ونصرت اور غلبہ عطاء کیا جائے گا، تب اگر آپ اپنے شہر مکہ کی محبت' نیز اپنی قوم کے ساتھ فطری محبت وکشش کی وجہ سے ہمیں چھوڑ کر واپس مکہ چلے آئے......

تب ہم بیچ بھنور میں تنِ تنہا رہ جائیں گے......اور تب ہمارا کیا بنے گا......؟؟''

رسول اللہ ﷺ نے اس شخص کی یہ گفتگو نہایت توجہ اور تحمل سے سنی، اور پھر ان سب کو مخاطب کرتے ہوئے یہ یادگار الفاظ ارشاد فرمائے: ''میرا جینا اور میرا مرنا اب صرف تمہارے ساتھ ہی ہوگا''۔

اور یوں اس موقع پر حضرت عباس رضی اللہ عنہ کی موجودگی میں مدینہ کے ان باشندوں نے رسول اللہ ﷺ کے دستِ مبارک پر بیعت کی۔ یہ یادگار بیعت تاریخ میں ہمیشہ کیلئے ''بیعتِ عقبہ ثانیہ'' کے نام سے مشہور ہوگئی۔

☆بیعتِ عقبہ ''اولیٰ'' اور ''ثانیہ'' میں فرق یہ تھا کہ پہلی بیعت کے موقع پر صرف ان چیزوں کی بیعت لی گئی تھی کہ جن کا تعلق ''عقیدہ وایمان'' اور ''اخلاقیات'' سے تھا، مثلاً یہ کہ ''اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہیں ٹھہرائیں گے...... چوری نہیں کریں گے......زنا سے بچتے رہیں گے......'' وغیرہ۔

جبکہ دوسری بیعت کے موقع پر ان مذکورہ باتوں کے علاوہ مزید اس چیز کی بیعت بھی لی گئی تھی کہ رسول اللہ ﷺ کی مدینہ منتقلی کی صورت میں آپؐ کی حفاظت اور آپؐ کی طرف سے مدافعت وحمایت کی خاطر وہ کسی قربانی سے دریغ نہیں کریں گے...... بڑی سے بڑی جنگ لڑنے ......اور سردھڑ کی بازی لگادینے کیلئے ہمہ وقت مستعد وآمادہ رہیں گے......آپؐ کی حفاظت کی خاطر تن، من، دھن سب ہی کچھ قربان کردیں گے۔

یا اس حقیقت کو یوں سمجھ لیا جائے کہ پہلی بیعت کے موقع پر بیعت کے الفاظ بعینہٖ وہی تھے جو کہ ''بیعت النساء'' کے نام سے معروف ہیں اور جن کا تذکرہ سورہ الممتحنہ کی اس آیت میں ہے: ﴿يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ إِذَا جَاءَكَ الْمُؤْمِنَاتُ يُبَايِعْنَكَ عَلَىٰ أَن لَّا يُشْرِكْنَ

بِـالـلّـهِ شَيْـئـاً وَّ لَا يَسْـرِقـنَ وَلَا يَـزنِيـنَ وَ لَا يَقْتُلنَ أولادَهُنّ وَلَا يأتِينَ بِبُهْتَـانٍ يّـفتَـرِيـنَـهٗ بَيـنَ أيـدِيهِـنَّ وَ أرجُـلِهِنَّ ولَا يَعصِينَكَ فِى معرُوفٍ فَبَايِعهُنّ واستَغفِر لَهُنَّ اللّهَ اِنّ اللّهَ غَفُورٌ رَحِيم﴾ (۱)

مقصد یہ کہ آپ ﷺ عورتوں سے جب کبھی بیعت لیا کرتے تو اس وقت الفاظ یہی ہوا کرتے تھے جو اس آیت میں مذکور ہیں، اور جن کا تعلق فقط عقیدہ وایمان اور اخلاقیات سے ہے، دینِ اسلام یا پیغمبرِ اسلام کی حفاظت کی خاطر جنگ یا قتال کا اس میں کوئی تذکرہ نہیں ہے۔

جبکہ دوسری بیعت کے موقع پر دینِ اسلام نیز پیغمبرِ اسلام کی حفاظت کی خاطر ہر قسم کی جنگ لڑنے یا قربانی دینے پر آمادہ رہنے کی بیعت بھی لی گئی۔ کیونکہ بدلی ہوئی صورتِ حال میں اب وقت کا تقاضا یہی تھا۔

❁❁❁

(۱) سورۃ الممتحنہ آیت: ۱۲۔

الحمد للہ آج بتاریخ ۴/ ذوالقعدہ ۱۴۳۳ھ، مطابق ۲۰/ ستمبر ۲۰۱۲ء بروز جمعرات یہ باب مکمل ہوا۔

رَبَّنَا تَقَبَّل مِنَّا اِنّكَ أنتَ السَّمِيعُ العَلِيمُ ، وَتُب عَلَينَا اِنَّكَ أنتَ التَوَّابُ الرَّحِيمُ

ہجرتِ مدینہ

نبوت کے تیرہویں سال حج کے مہینے میں ''بیعتِ عقبہ ثانیہ'' کے کچھ عرصے بعد رسول اللہ ﷺ نے اپنے جاں نثار صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کو مکہ سے نئی منزل یعنی مدینہ کی جانب ہجرت کا حکم دیا، اورتب تقریباً دو ماہ کے اندر اندر تمام صحابۂ کرام ہجرت کر گئے، اور مکہ میں صرف اکا دُکا مجبور ومحبوس افراد ہی باقی رہ گئے۔

وطن کی سرزمین میں یقیناً بڑی کشش ہوتی ہے اور وطن کی محبت بہت مضبوط ہوا کرتی ہے......مگر اللہ اور اس کے رسولؐ کے حکم کے مقابلے میں ہر کشش، ہر تعلق، اور ہر محبت ہیچ ہے۔رسول اللہ ﷺ کے جان نثار صحابۂ کرام کا یہی عقیدہ وایمان تھا......اسی کے مطابق ان کا عمل بھی تھا......اور یہی ان کا کردار بھی تھا......!

چنانچہ رسول اللہ ﷺ کی طرف سے ہجرت کے اس حکم کی تعمیل میں وہ اپنا وطن، اپنا شہر، اپنی سرزمین، اپنا مال واسباب، اپنا کاروبار، اپنا گھربار، اپنی زمیں جائیداد......سبھی کچھ چھوڑ کر...... خالی ہاتھ روانہ ہوگئے...... اور اس مقصد کیلئے انہوں نے ایسی تکلیفیں اور صعوبتیں خندہ پیشانی سے برداشت کیں کہ جن کے تصور سے ہی رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔

ہجرت کا حکم آنے کے بعد دیکھتے ہی دیکھتے کیفیت یہ ہوئی کہ مکہ مسلمانوں سے خالی ہوگیا، صرف چند مجبور ومحبوس قسم کے افراد ہی رہ گئے، اس کے علاوہ خود رسول اللہ ﷺ، نیز حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ، اور حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ ابھی تک مکہ میں تھے، کیونکہ ان دونوں حضرات کو تاہنوز خود رسول اللہ ﷺ نے روانگی سے روک رکھا تھا۔

اس دوران حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے متعدد بار رسول اللہ ﷺ سے ہجرت کی

اجازت مانگی تھی، لیکن ہر بار آپؐ کی طرف سے جواب یہ ملا تھا کہ: یا أبابکر! لا تَعْجَل لَعَلّ اللّٰہَ یَجْعَل لَكَ صَاحِبا...... یعنی ''اے ابوبکر! جلدی نہ کرو، شاید اللہ تمہارے لئے کسی اچھے ہمسفر کا انتظام کردے''۔ اور تب حضرت ابوبکرؓ کے دل میں ایک تمنا کروٹ لیتی ...... اور ایک آرزو جاگ اٹھتی ...... اور وہ اس سوچ میں پڑجاتے کہ کاش میرا وہ ''اچھا ہمسفر'' خود رسول اللہ ﷺ ہی ہوں۔

انہی دنوں ایک روز مشرکینِ مکہ نے اپنا ایک ہنگامی اجلاس طلب کیا جس میں تمام رؤسائے قریش سر جوڑ کر بیٹھے اس بارے میں غور وفکر اور تبادلۂ خیال کرتے رہے کہ رسول اللہ ﷺ کے ساتھ آخر کیا سلوک کیا جائے اور اس نئے دین کی نشر واشاعت کی روک تھام کیلئے کیا فیصلہ کن اقدامات کئے جائیں......؟

ان میں سے کسی نے مشورہ دیا کہ رسول اللہ ﷺ کو ہمیشہ کیلئے قیدِ تنہائی میں ڈال دیا جائے، کسی نے کہا کہ ملک بدر کردیا جائے۔ آخر تمام تر بحث ومباحثہ کے بعد وہ اس رائے پر متفق ہوئے کہ نعوذ باللہ آپؐ کو قتل کردیا جائے۔ جیسا کہ اس ارشادِ ربانی میں اسی طرف اشارہ کیا گیا ہے: ﴿وَ اِذ یَمْکُرُ بِكَ الَّذِینَ کَفَرُوا لِیُثْبِتُوكَ أو یَقْتُلُوكَ أو یُخْرِجُوكَ ، وَ یَمْکُرُونَ وَ یَمْکُرُ اللّٰہُ ، وَ اللّٰہُ خَیرُ المَاکِرِینَ﴾ (۱) ترجمہ: (اور وہ وقت یاد کیجئے جب کافر لوگ آپ کے بارے میں تدبیریں سوچ رہے تھے کہ آپ کو قید کردیں، یا آپ کو قتل کر ڈالیں، یا آپ کو ملک بدر کردیں، اور وہ تو اپنی تدبیریں کررہے تھے، اور اللہ اپنی تدبیر کررہا تھا، اور اللہ تو بہترین تدبیر کرنے والا ہے)

ان رؤسائے قریش نے آپ ﷺ کے قتل کی مذموم وناپاک سازش کو عملی جامہ پہنانے

(۱) الأنفال [۳۰]

کیلئے طریقہ یہ سوچا کہ مختلف قبائل سے متعدد نوجوانوں کا انتخاب کیا جائے جو کہ آج رات آپؐ کے گھر کا محاصرہ کرلیں ، اور پھر جب آپؐ حسبِ معمول رات کے آخری پہر عبادت کی غرض سے بیت اللہ کی جانب روانگی کیلئے اپنے گھر سے باہر نکلیں تو یہ سب ایک ساتھ اپنی تلواروں سے حملہ کر کے آپؐ کو قتل کر ڈالیں...... اور چونکہ ان سب قاتلوں کا تعلق قبیلۂ قریش کے جدا جدا خاندانوں اور مختلف شاخوں سے ہوگا' لہٰذا بنو ہاشم تنہا کس کس سے لڑیں گے......؟ اور اتنے سارے خاندانوں سے کس طرح قصاص کا مطالبہ کریں گے......؟ اور مجبوراً بس خون بہا کے مطالبے پر ہی اکتفاء کریں گے...... چنانچہ صورتِ حال کے تمام پہلوؤں کا بغور جائزہ لینے کے بعد یہ ناپاک منصوبہ تیار کرلیا گیا، اور جلد از جلد اسی رات ہی اسے عملی جامہ پہنانے کے عزم بالجزم کے ساتھ وہ طواغیت وہاں سے رخصت ہوئے۔

دوسری جانب اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی جانب سے بذریعۂ وحی رسول اللہ ﷺ کو رؤسائے قریش کے اس مذموم منصوبے کے بارے میں آگاہ کر دیا گیا اور اسی رات مکہ سے ہجرت کر جانے کا حکمِ خداوندی لئے ہوئے جبریل امین نازل ہوئے۔

اس حکم کی تعمیل میں رسول اللہ ﷺ اُس دن خلافِ معمول تپتی دوپہر میں حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے گھر پہنچے، اور ہجرت کے اس حکم کے بارے میں انہیں مطلع فرمایا۔ اس پر ابوبکرؓ نے عرض کیا: الصُحبَة یا رسُولَ اللّٰه؟ یعنی ''اے اللہ کے رسول اس سفر میں کیا میں آپ کے ہمراہ چلوں......؟'' آپ ﷺ نے جواب میں ارشاد فرمایا: نَعَم ، الصُحبَة یا أبَا بَکر۔ یعنی؛ ''ہاں اے ابوبکر! اس سفر میں تم میرے ''ہمسفر'' ہوگے''۔ اور تب فرطِ مسرت کی وجہ سے ابوبکرؓ اپنے جذبات پر قابو نہ رکھ سکے...... ضبط کے تمام بندھن ٹوٹ گئے...... اور ابوبکر کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے......!!

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی صاحبزادی ام المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا اُس وقت یہ تمام منظر دیکھ رہی تھیں...... وہ فرماتی ہیں کہ اُس روز جب میں نے اپنے والد (ابوبکرؓ) کو فرطِ مسرت کی وجہ سے روتے ہوئے دیکھا......تو اُس وقت زندگی میں پہلی بار مجھ پر یہ حقیقت منکشف ہوئی کہ انسان جس طرح بہت زیادہ غم اور صدمے کے وقت روتا ہے......اسی طرح بہت زیادہ خوشی کے وقت بھی روتا ہے......انسان کی آنکھوں سے بہنے والے یہ آنسو کبھی ''غم کے آنسو'' ہوا کرتے ہیں، اور کبھی ''خوشی کے آنسو''، اس سے قبل مجھے اس بات کا علم نہیں تھا''۔

اور پھر آپ ﷺ اپنے ''رفیقِ سفر'' کو چند ضروری ہدایات دینے کے بعد اپنے گھر واپس تشریف لے آئے۔

اور جب رات ہوئی، ہر طرف اندھیرا چھا گیا، تب رؤسائے قریش کی طرف سے مقرر کردہ مسلح نوجوانوں کا ایک چاق و چوبند دستہ وہاں آ پہنچا، اور آتے ہی انہوں نے رسول اللہ ﷺ کے گھر کا محاصرہ کر لیا، تاکہ آپؐ حسبِ معمول جب رات کے آخری پہر عبادت کی غرض سے بیت اللہ کی جانب روانگی کیلئے گھر سے نکلیں گے تب یہ سب یکبارگی آپؐ پر ٹوٹ پڑیں گے......!

رسول اللہ ﷺ کے پاس مشرکینِ مکہ کی بہت سی امانتیں تھیں، اس رات آپؐ نے وہ تمام امانتیں حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کے حوالے کرتے ہوئے انہیں تاکید فرمائی کہ ''میری روانگی کے بعد یہ تمام امانتیں ان کے مالکوں تک پہنچا دینا، اور اس کے بعد مکہ سے ہجرت کرنا''۔

اس کے بعد رسول اللہ ﷺ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو حکم دیا کہ ''اے علی! آج رات تم

میرے بستر پر سوجاؤ اور میری چادر اوڑھ لو"۔
اُس رات رسول اللہ ﷺ کے بستر پر سونا یقیناً موت کو دعوت دینے کے مترادف تھا، یا یوں سمجھ لیا جائے کہ اُس رات آپؐ کے بستر پر سونا گویا خودکشی کرنا تھا...... لیکن حضرت علیؓ بلا چون وچرا آپؐ کے حکم کی تعمیل کرتے ہوئے فوراً ہی آپؐ کے بستر پر لیٹ گئے اور آپؐ کی چادر اوڑھ لی، یقیناً نوجوانی میں یوں بغیر کسی ادنیٰ تأمل یا تردد کے اللہ اور رسول ﷺ کے کسی بھی حکم کی تعمیل کی خاطر اپنی جان تک کی بازی لگا دینے کیلئے ہمہ وقت مستعد اور تیار رہنا...... یہی وہ بے مثال ایمانی جذبہ تھا کہ جس کی عکاسی اُس موقع پر حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کے اس طرزِ عمل سے ہوتی ہے...... حالانکہ اُس وقت وہ بالکل نوعمر تھے، یقیناً اس سے حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کی بڑی فضیلت ومنقبت ثابت ہوتی ہے۔
اس کے بعد رسول اللہ ﷺ رات کے آخری پہر قرآن کریم کی آیت: ﴿وَ جَعَلْنَا مِن بَينِ أَيْدِيهِم سَدّاً وَّ مِن خَلْفِهِم سَدّاً فَأَغشَينَاهُم فَهُم لَا يُبْصِرُونَ﴾ (۱) پڑھتے ہوئے اپنے گھر سے باہر تشریف لائے، اپنی مٹھی میں کچھ خاک لی، اور پھونک مار کر اسے ان مسلح نوجوانوں کی جانب اڑا دیا، اور نہایت اطمینان کے ساتھ ان کی نگاہوں کے سامنے سے گذر گئے...... لیکن نہ تو انہیں کچھ نظر آیا...... اور نہ ہی انہیں کچھ علم ہوسکا...... اور وہ رات بھر اس اطمینان کے ساتھ وہاں پہرہ دیتے رہے کہ رسول ﷺ اندر اپنے گھر میں موجود ہیں......!!
رسول اللہ ﷺ اُس رات اپنے گھر سے روانگی کے بعد سیدھے اس شخص کے گھر پہنچے کہ جس

(۱) سورۃ یٰس [۹]

پراُس وقت آپ ﷺ کوسب سے زیادہ بھروسہ تھا، یعنی حضرت ابوبکرصدیق رضی اللہ عنہ، اور پھرفوراً ہی وہ دونوں رات کی تاریکی میں گھر کے عقبی دروازے سے نکل کرایک نئی منزل کی جانب روانہ ہوگئے......، مدینہ منورہ مکہ مکرمہ سے شمال کی جانب واقع تھا، لیکن یہ دونوں حضرات بالکل مخالف سمت میں یعنی جنوب کی طرف چل دیئے، رات کے اندھیرے میں دشوارگذار پہاڑی راستوں پرکہ جہاں ہرطرف نوکیلے سنگ ریزوں کی بھرمارتھی...... دونوں مسلسل پاپیادہ چلتے رہے......، حضرت ابوبکرصدیق رضی اللہ عنہ کبھی رسول ﷺ کے آگے چلتے...... کبھی پیچھے...... کبھی دائیں...... اورکبھی بائیں...... یوں وہ بارباراپنی جگہ تبدیل کرتے...... گویابڑی بے چینی میں مبتلا ہوں......آپ ؐ نے ان کی یہ کیفیت دیکھی تو دریافت فرمایاکہ اے ابوبکر! کیابات ہے......؟ اس پرابوبکرؓ نے جواب دیاکہ ''اے اللہ کے رسول! کبھی مجھے یہ اندیشہ ہونے لگتاہے کہ ایسانہوکہ کوئی دشمن سامنے کہیں چھپابیٹھاہو اوروہ اچانک سامنے سے ظاہرہوکرآپ کوکوئی نقصان پہنچائے، اس لئے میں آپ کے آگے آگے چلنے لگتاہوں......اورپھر یہ اندیشہ ہونے لگتاہے کہ ایسانہوکہ کوئی تعاقب کرنے والاکہیں پیچھے سے اچانک آجائے، یہ سوچ کرمیں آپ کے پیچھے آجاتاہوں...... پھریہ فکرستانے لگتی ہے کہ کہیں ایسانہوکہ دائیں یابائیں کوئی دشمن کہیں گھات لگائے بیٹھاہو، اس لئے میں کبھی آپ کے دائیں چلنے لگتاہوں اورکبھی آپ کے بائیں......!!

اسی کیفیت میں یہ دونوں حضرات مسلسل چلتے رہے...... یہاں تک کہ تقریباً پانچ میل (یعنی تقریباً آٹھ کلومیٹر) کی مسافت پیدل طے کرنے کے بعدایک انتہائی بلندوبالا پہاڑ کے دامن میں پہنچے، اورانتہائی کٹھن اورمشکل ترین راستہ طے کرتے ہوئے اس کی چوٹی پرواقع ایک غارکے سامنے جاپہنچے جوکہ ''غارِثور'' کے نام سے معروف ہے۔

اس غار کے دہانے پر پہنچنے کے بعد ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ! آپ یہیں توقف فرمائیے، پہلے میں اکیلا اندر جا کر غار کا جائزہ لے لوں ...... کہیں ایسا نہ ہو کہ پہلے سے ہی یہاں کوئی دشمن چھپا بیٹھا ہو...... چنانچہ ابوبکر رضی اللہ عنہ تنہا اندر گئے، اچھی طرح جائزہ لیا، اور خوب صفائی وغیرہ بھی کی، اِدھر اُدھر چند چھوٹے بڑے سوراخ نظر آئے حضرت ابوبکرؓ کو یہ اندیشہ لاحق ہوا کہ کہیں ان سوراخوں میں کوئی موذی جانور نہ ہو، کہ جو رسول اللہ ﷺ کیلئے تکلیف واذیت کا باعث بن جائے ...... یہ سوچ کر انہوں نے اپنے لباس سے کچھ کپڑا اپھاڑ کر اس کے ذریعے ان سوراخوں کو بند کر دیا، اور پھر باہر آ کر رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں گذارش کی کہ یا رسول اللہ! اب آپ اندر تشریف لے آیئے ...... جس پر آپ ﷺ غار کے اندر تشریف لے آئے، اور اس کے بعد یہ دونوں حضرات اس غار میں تین دن مقیم رہے۔

دوسری طرف مکہ میں وہ مسلح نوجوان رات بھر مسلسل رسول اللہ ﷺ کے گھر کا محاصرہ کئے کھڑے رہے، اس دوران کبھی کبھی وہ کسی سوراخ سے اندر جھانک بھی لیتے اور مطمئن ہو جاتے کہ رسول ﷺ بدستور اندر گھر میں موجود ہیں اور اپنے بستر پر سو رہے ہیں ......!

لیکن صبح ہونے پر جب اس بستر سے رسول اللہ ﷺ کی بجائے حضرت علی رضی اللہ عنہ نمودار ہوئے تو ان مشرکین کی خفت وشرمساری اور جھنجھلاہٹ کی انتہاء نہ رہی، انتہائی شرمندی وافسردگی کے عالم میں سر جھکائے اور منہ لٹکائے ہوئے وہاں سے چل دیئے، اور جا کر اپنے سرداروں کو اس صورتِ حال سے مطلع کیا، جس پر وہ سب طیش میں آ گئے ...... اور انتہائی غیظ وغضب' نیز حیرت وپریشانی کی اس ملی جلی کیفیت میں ایک دوسرے کا منہ تکنے لگے......!

اور پھر وہ سب رسول اللہ ﷺ کے گھر پہنچے، وہاں حضرت علی رضی اللہ عنہ کو جا پکڑا...... خوب

تحقیق وتفتیش کی گئی......حتیٰ کہ انہیں زدوکوب بھی کیا گیا......لیکن یہ سب کچھ بے سود اور لا حاصل ہی رہا، ان سے کوئی مفید معلومات حاصل نہ ہوسکیں۔

آخران رؤسائے قریش کا سرغنہ ابوجہل اپنے ساتھیوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہنے لگا کہ ''اب سب سے پہلے ابوبکر کے گھر کی تلاشی لی جائے''، چنانچہ وہ سب نہایت سرگرمی وتیزی کے ساتھ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے گھر پہنچے، دروازے پر دستک دی، جس پر اندر سے حضرت ابوبکر صدیقؓ کی بیٹی حضرت اسماءؓ نمودار ہوئیں، ان کے آتے ہی ابوجہل نے نہایت کرخت اور تند وتیز لہجے میں پوچھا کہ ''لڑکی! تمہارا باپ کہاں ہے؟'' حضرت اسماء نے جواب دیا کہ ''مجھے نہیں معلوم''، ابوجہل نے اصرار کرتے ہوئے باربار اپنا سوال دہرایا......اور ہر بار حضرت اسماء کی طرف سے وہی جواب ملا......

تب ابوجہل کہنے لگا کہ ''محمد بھی غائب ...... اور......ابوبکر بھی غائب......مطلب صاف ظاہر ہے......یعنی وہ دونوں اب ہمارے چنگل سے نکل چکے ہیں......''

اور تب اس نے اپنے ساتھیوں کو وہاں سے چلنے کا اشارہ کیا......اور جاتے جاتے طیش میں آکر اس بدبخت نے حضرت اسماءؓ کے چہرے پر اس قدر زور سے تھپڑ مارا کہ ان کے کان سے بالی اُڑکر دور جاگری......!

اس کے بعد تمام شہر مکہ میں نہایت سرگرمی کے ساتھ ان دونوں حضرات کی تلاش شروع کردی گئی، ان کے تعاقب میں مختلف اطراف میں متعدد دستے روانہ کئے گئے، تمام راستوں پر پہرے بٹھادیئے گئے، ہر طرف ناکہ بندی کردی گئی، چپے چپے پر سراغ رساں پھیل گئے......!

جب کچھ حاصل نہ ہوا تو آخر اعلانِ عام کیا گیا کہ ''جو کوئی ان دونوں کو زندہ یا مردہ پکڑ کر لائیگا

یا ان کے بارے میں کوئی مفید اطلاع دے گا......اسے سو اونٹ بطورِ انعام پیش کئے جائیں گے......''

ظاہر ہے کہ یہ بہت بڑا انعام تھا، کیونکہ اس معاشرے میں ان کیلئے اونٹ بہت بڑی چیز تھی، کہ اس پر وہ سواری بھی کیا کرتے تھے، نقل وحمل اور بار برداری کا وسیلہ بھی یہی تھا، اس کا گوشت بھی کھایا جاتا تھا......غرضیکہ ان کیلئے اونٹ ہی سبھی کچھ تھا......ایسے میں اگر کسی کو مفت میں بیٹھے بٹھائے ......ایک دو نہیں ......یا دس بیس نہیں...... بلکہ پورے سو اونٹ مل جاتے......تو یقیناً اس کی تو نسلیں سنور جاتیں......!

چنانچہ اس انعام کے اعلان کو سننے کے بعد تو وہاں ہر کوئی دیوانہ ہی ہو گیا......راتوں کی نیند اور دن کا چین سکون جاتا رہا......اب ہر کوئی اپنے تمام کام کاج چھوڑ چھاڑ کر......بس ان دونوں کی تلاش میں ہی سرگرداں ہو گیا۔

آخر ایک روز یہ لوگ تعاقب کرتے کرتے اُس غار کے دہانے پر جا پہنچے کہ جس میں وہ دونوں حضرات پناہ لئے ہوئے تھے، حتیٰ کہ اِن کی آوازیں اور اِن کی باہمی گفتگو غار کے اندر سنائی دینے لگی۔

اس قدر نازک ترین صورتِ حال کی وجہ سے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ پریشان ہو گئے، اور عرض کیا کہ ''اے اللہ کے رسول! مجھے اپنی کوئی فکر نہیں ہے، البتہ مجھے یہ غم کھائے جا رہا ہے کہ کہیں آپ کو کوئی تکلیف نہ پہنچے، اس لئے کہ اگر آپ کو کچھ ہو گیا تو ...... پھر...... پوری امت کا کیا بنے گا......؟'' یعنی یہ تو پوری امت کا خسارہ ہو گا۔

تب آپ ﷺ نے انہیں تسلی دیتے ہوئے ارشاد فرمایا: مَا ظَنُّكَ يَا أَبَا بَكر بِاثنَين ، اَللّٰهُ ثَالِثُهُمَا؟ یعنی ''اے ابوبکر! ایسے دو انسان کہ جن کے ساتھ تیسرا خود اللہ ہو، ان کے

بارے میں تمہارا کیا گمان ہے؟'' مقصد یہ کہ ہم محض دو نہیں ہیں، بلکہ ہمارے ساتھ اللہ کی معیت ونصرت بھی شاملِ حال ہے، لہٰذا فکر کی کوئی بات نہیں۔

اسی واقعے کی طرف قرآن کریم میں اس طرح اشارہ کیا گیا ہے: ﴿اِلَّا تَنْصُرُوهُ فَقَد نَصَرَهُ اللّٰهُ اِذ أخرَجَهُ الَّذِينَ كَفَرُوا ثَانِيَ اثنَينِ اِذ هُمَا فِي الغَارِ اِذ يَقُولُ لِصَاحِبِهٖ لَا تَحزَن اِنَّ اللّٰهَ مَعَنَا﴾ (۱) ترجمہ: (اگر تم ان (نبی ﷺ) کی مدد نہیں کرو گے' تو اللہ نے ہی ان کی مدد کی اُس وقت جبکہ انہیں کافروں نے نکال دیا تھا' دو میں سے دوسرا' جبکہ وہ دونوں غار میں تھے، جب یہ اپنے ساتھی سے کہہ رہے تھے کہ غم نہ کرو اللہ ہمارے ساتھ ہے)

اُس غار کی ہیئت کچھ ایسی تھی کہ اس کا دہانہ نیچے تھا، جبکہ دہانے کے بعد اندر فوراً ہی کچھ بلندی تھی، یعنی غار کے اندر کا منظر دیکھنے کیلئے ضروری تھا کہ نیچے جھک کر یا بیٹھ کر اندر اوپر کی جانب جھانکا جائے، جھکے بغیر اندر کا منظر دیکھنا ممکن نہیں تھا، جبکہ اندر بیٹھے ہوئے ان دونوں حضرات کو باہر کھڑے ہوئے ان افراد کے پاؤں نظر آرہے تھے۔

اللہ کی شان ملاحظہ ہو کہ یہ تعاقب کرنے والے دشمن شب وروز ہر جگہ مارے مارے پھر رہے تھے، چپہ چپہ انہوں نے چھان مارا تھا، حتیٰ کہ تعاقب کرتے ہوئے اس پہاڑ پر اتنی بلندی تک بھی آ گئے ...... اس غار کے دہانے تک بھی آ پہنچے ...... لیکن انہیں اتنی توفیق نہ ہو سکی کہ ذرہ جھک کر اندر جھانک ہی لیں ...... یقیناً اُس وقت ان سے اس توفیق کا سلب کر لیا جانا اللہ ہی کے حکم سے تھا۔

رسول اللہ ﷺ اور آپؐ کے ہمسفر یعنی ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ' دونوں تین دن تین رات

(۱) التوبہ [۴۰]

مسلسل اس غار میں مقیم رہے، اس دوران حضرت ابوبکرؓ کے بیٹے عبداللہ دن بھر مکہ میں گھوم پھر کر صورتِ حال کا جائزہ لیتے ...... رؤسائے قریش کی گفتگو سنتے ...... اور رات کی تاریکی میں وہاں جا کر ان دونوں حضرات کو صورتِ حال سے مطلع کرتے ...... تاکہ اس صورتِ حال کے مطابق کوئی اگلا قدم اٹھایا جائے۔

حضرت ابوبکر صدیقؓ کا ایک غلام' جس کا نام عامر بن فہیرہ تھا' وہ علی الصباح اس راستے پر بکریاں چراتا' تاکہ عبداللہ بن ابی بکرؓ کے قدموں کے نشانات مٹ جائیں، نیز اس دوران مناسب موقع پا کر وہ اُس غار تک بھی جا پہنچتا، اور ان دونوں حضرات کو بکریوں کا دودھ بھی پیش کیا کرتا۔

اس طرح اس غار میں جب تین دن گذر گئے اور ان کی تلاش' تعاقب' اور بھاگ دوڑ کے اس سلسلے میں کچھ کمی آئی ......تب وہاں سے روانگی کی غرض سے یہ دونوں حضرات غار سے باہر تشریف لائے۔

چونکہ حفاظتی اقدام کے طور پر طے یہ پایا تھا کہ مکہ سے مدینہ سفر کیلئے عام راستہ اختیار کرنے کی بجائے کوئی ایسا غیر معروف اور گمنام راستہ اختیار کیا جائے گا جو کہ نسبتاً ویران اور غیر آباد ہو، جہاں مسافروں کی آمد و رفت اور نقل و حرکت بہت کم ہوتی ہو...... لہٰذا غارِ ثور سے روانگی کے موقع پر پہلے سے طے شدہ منصوبے کے مطابق عبداللہ بن اُرَیقط نامی ''رہبر'' بھی وہاں آ پہنچا، جس کی خدمات اسی مقصد کیلئے حاصل کی گئی تھیں، جو کہ قابلِ بھروسہ بھی تھا، نیز یہ کہ ویران اور خفیہ راستوں سے خوب واقف بھی تھا۔

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے کافی پہلے سے ہی اس سفر کیلئے دو اونٹنیاں تیار کر رکھی تھیں، اور شک سے بچنے کیلئے انہیں اپنے پاس رکھنے کی بجائے اس ''رہبر'' کے حوالے کر

رکھا تھا۔ چنانچہ اس غار سے نکل کر جب آگے روانگی کا مرحلہ آیا تو ، پہلے سے طے شدہ منصوبے کے مطابق یہ رہبر وہاں آمد کے موقع پر یہ دونوں اونٹنیاں بھی ہمراہ لایا۔

☆......عظیم خاتون:

جب یہ دونوں حضرات اونٹنیوں پرسوار ہو چکے تو عین موقع پر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی بیٹی حضرت اسماء رضی اللہ عنہا بھی کھانا لئے ہوئے وہاں پہنچیں، جو کہ انہوں نے بڑے ہی شوق اور اہتمام کے ساتھ ان دونوں حضرات کیلئے ''زادِراہ'' کے طور پر تیار کیا تھا۔

اُس زمانے میں اونٹ پر جو گدی ہوا کرتی تھی جس پر سوار بیٹھتا تھا، سوار کسی رسی کے ذریعے اپنا کچھ مختصر سامان بھی اسی گدی کے ساتھ لٹکا دیا کرتا تھا، اُس روز اسماءؓ جب یہ کھانا لائیں تو اب اس برتن کو اونٹنی پر رکھی ہوئی اس گدی کے ساتھ لٹکانے کیلئے کوئی رسی وہاں دستیاب نہیں تھی، تب اسماءؓ نے اپنا دوپٹہ پھاڑ کر دو حصوں میں تقسیم کیا، ایک حصے کو بل دے کر اس سے رسی تیار کی، اور پھر اس سے کھانے کے اُس برتن کو اونٹنی پر رکھی ہوئی گدی کے ساتھ لٹکا دیا......اسی واقعے کی نسبت سے اسماءؓ تاریخ میں ہمیشہ کیلئے ''ذات النطاقین'' یعنی ''اپنے دوپٹے کے دو حصے کر دینے والی'' کے لقب سے مشہور ہو گئیں۔(۱)

اس کے بعد حضرت اسماء رضی اللہ عنہا نے بھیگی پلکوں کے ساتھ ان دونوں حضرات کو رخصت کیا......اور تب ان کے دل میں اندیشوں اور وسوسوں کا ایک طوفان برپا ہونے لگا کہ نہ جانے......اللہ کے رسول ﷺ......اور ان کے ہمراہ میرے پیارے بابا جان......

(۱) بعض کتبِ تاریخ میں دوپٹے کی بجائے اس پٹکے کا تذکرہ ہے جو کہ اُس دور میں عورتیں عموماً اپنی کمر کے گرد باندھا کرتی تھیں، تاکہ کام کاج کرتے وقت لباس اِدھر اُدھر اُڑنے اور کام کاج میں رکاوٹ بننے کی بجائے ایک جگہ ٹکا رہے۔ اسماءؓ نے اپنے اس پٹکے کو دو حصوں میں تقسیم کیا۔ واللہ اعلم۔

نہ جانے یہ دونوں حضرات اپنی منزل تک پہنچ بھی پائیں گے...... یا خدانخواستہ......؟ اور پھراسی کیفیت میں......انہی اندیشوں اوروسوں کا ایک طوفان دل میں لئے ہوئے وہ وہاں سے واپس چل دیں...... یکہ وتنہا......

اس نازک ترین موقع پرحضرت اسماءرضی اللہ عنہا کا یہ تاریخی کردار......عورت ہونے کے باوجود......کمزورونا تواں مخلوق ہونے کے باوجود......اس قدرخطرات مول لےکر......کہ جہاں قدم قدم پردشمنوں' سراغ رسانوں' اورکھوجیوں کا جال بچھا ہوا تھا......اورپھراس قدر دشوارگذاراورانتہائی خطرناک پہاڑی راستہ......کہ جہاں قدم قدم پرموت گھات لگائے بیٹھی تھی......ان تمامترمشکلات کے باوجوداس نازک ترین موقع پراس خاتون کا یوں تنِ تنہا...... پیدل سفرکرتے ہوئے ......اورموت سے آنکھیں ملاتے ہوئے ......وہاں چلے آنا......محض ان دونوں حضرات کوکھانا پہنچانے کیلئے...... اوراس تاریخی اورخطرناک سفر پران حضرات کی روانگی کے وقت ......اپنی بھیگی پلکوں کے ساتھ ......انہیں رخصت کرنے کیلئے......اورکپکپاتے ہونٹوں کے ساتھ......انہیں سلامتی کی دعاءدینے کیلئے...... یقیناًاس سےاس خاتون کی عظمت ظاہرہوتی ہے......(۱)

(۱) یہاں یہ تذکرہ بھی ہوجائے کہ حضرت اسماءرضی اللہ عنہا کے والدبھی صحابی تھے،دادابھی، بھائی بھی،شوہربھی، اور بیٹابھی (والد: ابوبکرصدیق۔ دادا: ابوقحافہ۔ بھائی: عبداللہ اورعبدالرحمٰن۔شوہر: زبیربن العوام۔ بیٹا: عبداللہ بن زبیر، رضی اللہ عنہم اجمعین)
جبکہ ان کی بہن نہ صرف یہ کہ صحابیہ تھیں' بلکہ ام المؤمنین بھی تھیں،یعنی حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا۔
ایں خانہ ہمہ آفتاب است......!!

غارِ ثور سے روانگی:

تین دن غار میں قیام کے بعد اب وہاں سے آگے روانگی ہوئی، اس موقع پر رسول اللہ ﷺ اور آپ ؐ کے ہمسفر حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ دونوں اپنی اپنی اونٹنی پر سوار تھے، ان حضرات نے احتیاطی تدبیر کے طور پر مدینہ کی جانب فوری سفر کی بجائے پہلے کافی دور تک بالکل مخالف سمت میں یعنی یمن کی جانب سفر کیا، اور پھر کافی مسافت طے کرنے کے بعد اپنا رخ تبدیل کر لیا، اور بحرِ احمر کے ساحل کے ساتھ ساتھ غیر معروف اور ویران راستے پر مدینہ کی جانب روانہ ہو گئے۔

اُدھر ہر طرف نہایت زور و شور اور سرگرمی کے ساتھ تلاش کا سلسلہ ابھی تک جاری تھا، انہی تلاش کرنے والوں میں سُراقہ بن مالک المُدلجی نامی ایک شخص بھی تھا(۱) ایک روز وہ اپنے گاؤں میں اپنے کچھ دوستوں کے ہمراہ بیٹھا ہوا تھا، محفل جمی ہوئی تھی، ایسے میں ان لوگوں نے دور کافی فاصلے پر دو اشخاص کو اونٹنیوں پر سفر کرتے ہوئے دیکھا، تب ان میں سے کچھ لوگ چلانے لگے کہ...... یہ تو ضرور محمد (ﷺ) اور ابوبکر ہیں...... اور پھر ان میں سے ہر کوئی اُس بڑے انعام کے لالچ میں...... نہایت بیتابی کے ساتھ ان دونوں کے تعاقب میں جانے کیلئے اٹھ کھڑا ہوا۔

سراقہ کو بھی مکمل یقین ہو گیا کہ یہ دونوں سوار وہی ہیں، یعنی رسول اللہ ﷺ اور حضرت ابوبکرؓ...... لیکن سراقہ نے سوچا کہ یہ اتنا بڑا انعام میرے ہاتھ سے کیوں نکل جائے...... کوئی دوسرا کیوں لے اُڑے یہ انعام...... (سواونٹ) تب سراقہ اپنے ساتھیوں کا مذاق اڑاتے

(۱) بعد میں سراقہ مسلمان ہو گئے تھے۔

ہوئے انہیں یوں کہنے لگا کہ ''تم سب دیوانے ہوگئے ہو......سواونٹوں کے لالچ میں تم لوگوں کا یہ حال ہوگیا ہے...... یہ محمد اور ابوبکر ہرگز نہیں ہوسکتے...... یہ تو کوئی اور لوگ ہیں، کیوں خودکو بلاوجہ ہلکان کرنا چاہتے ہو؟ آرام سے بیٹھے رہو تم سب لوگ''

لیکن خود سراقہ کو اس بات کا مکمل یقین تھا کہ یہ دونوں سوار وہی حضرات ہی ہیں، اور اب اس سے صبر نہیں ہورہا تھا......

کچھ دیر وہ اسی جگہ اپنے دوستوں کی محفل میں بیٹھا رہا، تاکہ کسی کو اس پر شک نہ ہو...... اور پھر کچھ دیر بعد بہانہ بناتے ہوئے کہنے لگا کہ مجھے گھر میں ایک بہت ضروری کام پڑ گیا ہے...... یوں وہ وہاں سے اٹھا اور اپنے گھر چلا آیا، گھر پہنچتے ہی فوراً اپنے تیز رفتار گھوڑے پر سوار ہوا، اور گھر کے عقبی راستے سے نکل کر...... اپنے دوستوں کی نگاہوں سے بچتا ہوا...... اپنے گھوڑے کو سرپٹ دوڑاتا ہوا...... ان دونوں کے تعاقب میں روانہ ہوگیا......اور بہت جلد ان کے اس قدر قریب جا پہنچا کہ اب اس نے انہیں پہچان بھی لیا، اس موقع پر حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نہایت پریشانی کے عالم میں بار بار مڑمڑ کر اس کی جانب دیکھ رہے تھے، جبکہ رسول اللہ ﷺ مسلسل آگے کی جانب دیکھتے ہوئے اپنا سفر جاری رکھے ہوئے تھے، اور تلاوتِ قرآن میں مشغول ومنہمک تھے۔

اس انعام کے لالچ میں سراقہ بن مالک جب اپنے گھوڑے کو سرپٹ دوڑاتا ہوا رواں دواں تھا کہ اس دوران اچانک اس کے گھوڑے نے ٹھوکر کھائی اور وہ گھوڑے کی پشت سے نیچے جاگرا...... مگر وہ نہایت مستعدی اور پھرتی کے ساتھ اٹھا اور دوبارہ گھوڑے پر سوار ہوکر گھوڑے کو ایڑ لگائی ......لیکن کچھ ہی دیر بعد اس کے گھوڑے نے پھر ٹھوکر کھائی ......سراقہ دوبارہ گرا، لیکن فوراً ہی اٹھا اور پھر تعاقب میں رواں دواں ہوگیا......البتہ اسے اس بات پر

بہت حیرت تھی کہ اس کے گھوڑے کو مسلسل دوبار یہ ٹھوکر کس طرح لگی......؟ اوراب تیسری بار ایسی صورتِ حال پیش آئی کہ جس سے اس کے ہوش وحواس ہی اڑنے لگے...... ہوا یہ کہ دوڑتے دوڑتے اچانک اس کے گھوڑے کی اگلی دونوں ٹانگیں گھٹنوں تک زمین میں دھنس گئیں...... حالانکہ وہ کوئی ایسی نرم یا ریتیلی زمین بھی نہیں تھی......اور پھر جب اس نے نیچے اتر کر گھوڑے کو اٹھانے کی کوشش کی......اور گھوڑا اٹھا......اوراس کی ٹانگیں جب زمین سے نکلیں......تو عین اس جگہ سے ایک دھوئاں سا نمودار ہوا اور فضاء میں بلند ہو کر تحلیل ہونے لگا......!

سراقہ یہ منظر دیکھ کر انتہائی حیرت زدہ رہ گیا، اوراسے رسول اللہ ﷺ کی صداقت وحقانیت کا مکمل یقین ہو گیا، اوراب وہ بآواز بلند پکارنے لگا: الأمَان یا مُحَمّد...... الأمَان یا مُحَمّد...... یعنی ''اے محمد! مجھے امان چاہئے......''

اللہ کی شان...... وہ شخص جو ابھی محض کچھ دیر قبل تک نہایت جوش وخروش اور سرگرمی کے ساتھ تعاقب میں چلا آ رہا تھا...... جسے اپنی جرأت و بہادری پر ناز تھا......اور جسے قیمتی انعام کے لالچ نے بے چین کر رکھا تھا...... دیکھتے ہی دیکھتے ......اب وہی شخص مجبور...... ولاچار......خود اپنی سلامتی اور عافیت کیلئے فریاد کرنے لگا......اور خود اپنے لئے پناہ طلب کرنے لگا......اور وہ بھی کس سے......؟ رسول اللہ ﷺ سے...... جو کہ اُس وقت خود پناہ کی تلاش میں تھے......؟؟

آخراس کی اس قدر آہ وپکار پر رسول اللہ ﷺ نے پلٹ کر اس کی جانب دیکھا، اور قریب چلے آنے کا اشارہ فرمایا، تب وہ آپؐ کی خدمت میں حاضر ہوا، اوراس تعاقب پر معذرت کرنے لگا......

رسول اللہ ﷺ نے اسے مخاطب کرتے ہوئے فرمایا: ''اے سراقہ ، اُس وقت تمہاری کیا کیفیت ہوگی جب کسریٰ کے کنگن تمہارے ہاتھوں میں ہوں گے؟''

رسول اللہ ﷺ کی زبانِ مبارک سے یہ الفاظ سن کر سراقہ حیرت زدہ رہ گیا...... کہ آپؐ جو اس وقت خود پناہ کی تلاش میں ہیں...... بے گھر اور بے وطن ہیں...... کس طرح سراقہ کو اتنی بڑی خوشخبری سنا رہے ہیں کہ روئے زمین کی سب سے عظیم ترین قوت یعنی سلطنتِ فارس کے فرمانروا ''کسریٰ'' کے کنگن سراقہ کے ہاتھوں میں آنے والے ہیں......؟؟ (۱)

مزید یہ کہ اس موقع پر اس نے اظہارِ عقیدت کے طور پر اپنا سامان نیز کچھ اشیائے خورد ونوش آپؐ کی خدمت میں پیش کیں، لیکن آپؐ نے معذرت کا اظہار کرتے ہوئے فرمایا کہ ''ہمیں اس کی ضرورت نہیں، ہاں البتہ تم اس ملاقات کو مخفی رکھنا''

یعنی یہ جو ہماری تمہاری ملاقات ہوئی ہے اس کے بارے میں کسی کو کچھ نہ بتانا، اسے صیغۂ راز میں ہی رہنے دینا۔ اس پر اس نے یہ وعدہ کیا کہ وہ کسی کو اس ملاقات کے بارے میں کچھ نہیں بتائے گا۔

تب سراقہ وہاں سے واپس روانہ ہوگیا، راستے میں اسے جہاں کہیں بھی کوئی ایسا شخص نظر آیا جو رسول اللہ ﷺ کے تعاقب میں سرگرداں تھا، سراقہ نے اسے یوں کہا کہ ''میں آگے بہت دور تک خوب اچھی طرح تلاش کرکے آرہا ہوں ...... یہاں ان کا کوئی نام ونشان نہیں ہے...... لہٰذا اب تمہیں آگے جانے اور خود کو بلاوجہ ہلکان کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے''

اور یوں وہ ہر تعاقب کرنے والے کو واپس بھیجتا گیا......

(۱) خلیفۂ دوم حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ کے دورِ خلافت میں جب حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کی سپہ سالاری میں فارس فتح ہوا اور بہت بڑی مقدار میں مالِ غنیمت مدینہ پہنچا جس میں کسریٰ کے کنگن بھی تھے، تب حضرت عمرؓ نے سراقہ کو بلوایا اور وہ کنگن اس کے ہاتھ میں پہنائے۔

اللہ کی قدرت ملاحظہ ہو کہ جو شخص تھوڑی دیر قبل تک رسول اللہ ﷺ اور ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی تلاش میں سرگرداں تھا...... ان کا جانی دشمن ...... اور خون کا پیاسا تھا...... اب وہی جاں نثار بن کر وہاں سے لوٹا......اور اب وہی ان کا محافظ بن گیا......

مدینہ میں آمد:

اس طویل سفر کے بعد آخرکار رسول اللہ ﷺ اور آپؐ کے ہمسفر یعنی حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ ۸/ ربیع الاول ۱۴؁ نبوی بروز پیر مدینہ کے مضافات میں پہنچ گئے۔

چونکہ آپ ﷺ کی مکہ سے روانگی کی خبر مدینہ پہنچ چکی تھی اس لئے اہلِ مدینہ نہایت بیتابی کے ساتھ آپؐ کی آمد کے منتظر تھے، اور وہ ہر روز صبح ہوتے ہی شہر کی حدود سے باہر نکل کر آپؐ کے استقبال کیلئے وہاں کھڑے ہو جاتے......اور آپؐ کی آمد کا نہایت بے چینی کے ساتھ انتظار کرتے......اور وہ بے چین کیوں نہ ہوتے...... کہ......آنے والا مہمان آخر کون تھا......؟ وہ عزیز ترین مہمان...... خاتم الأنبیاء............سید البشر......بلکہ سید الخلق...... ایسا مہمان جس کیلئے وہ سب اپنا تن من دھن سبھی کچھ نچھاور کر دینے کیلئے بیقرار تھے......وہ عظیم مہمان کہ جس کا نامِ نامی اور اسمِ گرامی ''محمدؐ بن عبداللہ'' تھا......اس پیارے مہمان کا انتظار انہیں بیقرار کئے ہوئے تھا......!!

اس دور میں کوئی ٹیلی فون یا ٹیلی گرام یا دیگر ذرائعِ اتصالات کا تو کوئی وجود نہیں تھا......لہٰذا بس......آنے جانے والے مسافروں سے وہ مسلسل پوچھتے رہتے کہ ''کیا کوئی سوار......کوئی قافلہ...... کوئی مسافر......تمہیں راستے میں نظر آیا......؟؟'' اور پھر اسی کیفیت میں جب دھوپ تیز ہو جاتی......تب وہ سب اپنے اپنے گھروں کی طرف واپس لوٹ جاتے۔

اُس روز بھی وہ لوگ صبح سے انتظار کرتے کرتے واپس اپنے گھروں کی طرف لوٹ گئے تھے، اسی دوران ایک یہودی جو کہ کھجور کے درخت پر چڑھا ہوا تھا' اس نے دور سے رسول اللہ ﷺ اور حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو آتے دیکھا، تو اس نے ان دونوں کو فوراً ہی پہچان لیا(۱) اور مدینہ کے مسلمانوں کو مخاطب کرتے ہوئے بآوازِ بلند چلانے لگا...... کہ:
''تمہارے نبی آ گئے...... تمہارے نبی آ گئے......'' جس پر دیکھتے ہی دیکھتے وہاں ایک جمعِ غفیر اکٹھا ہو گیا...... بڑے چھوٹے...... بوڑھے جوان...... مردوں اور عورتوں کی بہت بڑی تعداد وہاں آ پہنچی...... ہر کوئی رسول اللہ ﷺ کی ایک جھلک دیکھنے کیلئے بیتاب تھا......!

رسول اللہ ﷺ اور آپؐ کے ہمسفر یعنی حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے مدینہ شہر کے اندر داخل ہونے کی بجائے ''قباء'' نامی مضافاتی بستی میں پڑاؤ ڈالا اور تین دن یہیں قیام فرمایا۔ اس دوران مسجدِ قباء کی بنیاد بھی رکھی گئی، جس کی فضیلت خود قرآن کریم میں ان الفاظ میں بیان کی گئی ہے: ﴿لَمَسۡجِدٌ أُسِّسَ عَلَى ٱلتَّقۡوَىٰ مِنۡ أَوَّلِ يَوۡمٍ أَحَقُّ أَن تَقُومَ فِيهِ﴾ (۲) یعنی ''وہ مسجد کہ جس کی بنیاد روزِ اول سے ہی تقویٰ پر رکھی گئی ہے وہ اس لائق ہے کہ آپ اس میں کھڑے ہوں''۔

اسی دوران حضرت علی رضی اللہ عنہ بھی آپؐ کی تاکید کے مطابق مشرکینِ مکہ کی امانتیں ان

(۱) جیسا کہ قرآن کریم میں ارشاد ہے: ﴿ٱلَّذِينَ آتَيۡنَاهُمُ ٱلۡكِتَابَ يَعۡرِفُونَهُۥ كَمَا يَعۡرِفُونَ أَبۡنَاءَهُمۡ ......﴾ (البقرۃ: ۱۴۶) یعنی ''وہ لوگ جنہیں ہم نے کتاب عطاء کی ہے وہ انہیں یوں پہچانتے ہیں جیسے وہ اپنے بچوں کو پہچانتے ہیں''۔
مقصد یہ کہ گذشتہ آسمانی کتابوں میں رسول اللہ ﷺ کا تذکرہ اور آپؐ کی علامات وخصائص کا اس قدر مفصل تذکرہ ہے کہ جس کی وجہ سے اہلِ کتاب آپؐ کو خوب پہچانتے ہیں اور آپؐ کی صداقت وحقانیت کو خوب جانتے ہیں۔
(۲) التوبہ [۱۰۸]

کے حوالے کردینے کے بعد مکہ سے سفر کرتے ہوئے ''قباء'' میں رسول اللہ ﷺ سے آملے۔

☆......قباء سے اندرونِ مدینہ شہر کی جانب روانگی:

''قباء'' نامی اس مضافاتی بستی میں تین دن قیام کے بعد دونوں حضرات اندرونِ مدینہ شہر کی جانب روانہ ہوئے، اس موقع پر یہ دونوں الگ الگ اونٹنی کی بجائے اب ایک ہی اونٹنی پرسوار تھے، اس دوران رسول اللہ ﷺ کو دھوپ کی شدت سے بچانے کیلئے ابوبکرصدیق رضی اللہ عنہ اپنے رومال سے مسلسل آپؐ کے سرمبارک پرسایہ کئے ہوئے تھے۔

اس دوران کتنی ہی بستیوں سے اور کتنے ہی گلی محلوں سے گذر ہوا...... کتنے ہی قبائل کے مسکن راستے میں آئے......جس قبیلے کے مسکن سے گذر ہوتا......وہاں ہرکوئی دیدہ ودل فرشِ راہ کئے ہوئے نظر آتا......بار بار آوزیں بلند ہوتیں ''هَلُمَّ اِلَینَا یَا رَسُولَ اللّٰه...... هَلُمَّ اِلَیٰ العَدَدِ وَ العُدَّة...... وَالسِّلَاحِ وَالمَنَعَة...... '' یعنی: ''اے اللہ کے رسول! ہمارے پاس تشریف لایئے......ہمیں خدمت کا موقع مرحمت فرمایئے......اے اللہ کے رسول......آپ دیکھ لیجئے کہ ہماری تعداد کتنی زیادہ ہے......اور ہمارے پاس سامانِ جنگ کی کس قدر بہتات ہے......ہم کتنی اچھی طرح آپ کی حفاظت کا فریضہ انجام دینے کے قابل ہیں......''

یوں دیوانہ وار ہر قبیلے والے یہی صدائیں بلند کرتے ...... اور یہی اصرار کرتے...... اور رسول اللہ ﷺ کی میزبانی کا شرف حاصل کرنے کیلئے بچھے بچھے جاتے......!!

ایسے میں بسا اوقات بہت سے لوگ آگے بڑھ کر آپؐ کی اونٹنی کی مہار پکڑ لیتے ......تا کہ اونٹنی یہیں بیٹھ جائے اور آپؐ یہیں پڑاؤ ڈال دیں......لیکن ہر بار آپؐ نہایت شفقت ومحبت سے انہیں سمجھاتے......اور بار بار اپنی زبانِ مبارک سے یہ الفاظ دہراتے: ''دَعُوهَا

...... فَـاِنَّهـا مَـأمُورَة...... ''یعنی''لوگو! میری اونٹنی کو چھوڑ دو......کیونکہ یہ تو اللہ کے حکم سے چل رہی ہے......''

تمام راستے میں چھوٹے بڑے......بوڑھے...... جوان اور بچے...... مرد اور عورتیں...... سب ہی راستے کے دونوں جانب صف بستہ کھڑے تھے......گویا آج تمام مدینہ شہر ہی اُمڈ آیا تھا......اوراس دوران بچیاں نہایت دل کش انداز میں' خوب ترنم کے ساتھ...... بیک آواز خیر مقدمی اشعار گا رہی تھیں:

طَلَعَ البَدرُ عَلَينَا مِن ثَنِيّةِ الوَدَاعِ

وَجَبَ الشُّكرُ عَلَينَا مَا دَعَا لِلّهِ دَاعِ

أَيُّهَا المَبْعُوثُ فِينَا جِئتَ بِالأَمرِ المُطَاعِ

مفہوم:''آج تو ہمارے شہر مدینہ میں ......چودھویں کا چاند نکل آیا ہے......اللہ کی طرف سے ہم پر یہ تو ایسا احسانِ عظیم ہوگیا ہے کہ......جس کی وجہ سے اب ہم پر ہر لمحہ اللہ کا شکر بجالانا ضروری ہوگیا ہے......اے ہماری جانب بھیجے جانے والے اللہ کے رسول......یقیناً آپ تو ایسا دین لائے ہیں کہ ...... جسے قبول کرنا سب کیلئے لازمی ہے......!!''۔

اسی کیفیت میں اونٹنی مسلسل چلتی رہی...... چلتی رہی...... کتنے ہی گلی کوچے آئے ......اور گذر گئے......آخر...... چلتے چلتے......ایک جگہ پہنچ کر اونٹنی اچانک رک گئی...... کچھ دیر اِدھر اُدھر نگاہ دوڑائی...... اوراس کے بعد بیٹھ گئی......لیکن پھر فوراً ہی اٹھی......چند قدم آگے چلی......اور پھر رُک کر......گردن گھما گھما کر......پیچھے اسی جگہ کی جانب دیکھنے لگی......اس کے بعد واپس مڑی......دوبارہ اسی جگہ آئی......اور بیٹھ گئی......اور بیٹھتے ہی

فوراًاب اپنی گردن زمین کے ساتھ ٹکادی......یعنی اشارہ دیدیاکہ منزلِ مقصود یہی ہے......جس منزل کی تلاش میں مکہ سے سینکڑوں میلوں کی مسافت طے کرتے ہوئے چلے آرہے ہیں...... وہ منزل یہی ہے...... اورتب رسول اللہ ﷺ نیز آپؐ کے ہمسفر ابوبکرصدیق رضی اللہ عنہ دونوں اونٹنی سے نیچے اتر آئے......اور یہ بعینہٖ وہی مقام تھا کہ جہاں آج مسجدِ نبوی آباد ہے......!!

اونٹنی سے نیچے اترتے ہی آپؐ نے دریافت فرمایا کہ ''یہ سامنے سب سے قریب جو دروازہ نظر آرہا ہے' یہ کس کا ہے؟'' جواب ملا کہ ''یہ دروازہ ابوایوب انصاریؓ کا ہے'' تب آپؐ اس دروازے کی جانب بڑھے...... ابوایوب انصاریؓ نے جب یہ منظر دیکھا......تو ان کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ ہی نہ رہا......اوروہ دیوانہ وار آپؐ کی جانب لپکے......اور یوں اس نئے شہر میں ...... مدینہ میں......سیدالاولین والآخرین...... اشرف الأنبیاء والمرسلین...... خیرالبشر...... رسول اکرم......صلیٰ اللہ علیہ وسلم ...... کی میزبانی کاعظیم شرف حضرت ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ کونصیب ہوا......ذَلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيهِ مَن يَّشَاء...... آپؐ سات ماہ مسلسل انہی کے گھر میں تشریف فرمارہے۔

رسول اللہ ﷺ کی مدینہ تشریف آوری کے بعد چندروز ہی گذرے تھے کہ اس دوران حضرت ابوبکرصدیق رضی اللہ عنہ کے صاحبزادے عبداللہ بن ابی بکررضی اللہ عنہما کی زیرِ قیادت ایک مختصرسا قافلہ مکہ سے ہجرت کرکے مدینہ پہنچااورآپؐ سے آملا، اس مختصرقافلے میں آپ ﷺ کے اہلِ خانہ میں سے ام المؤمنین حضرت سودہ رضی اللہ عنہا، ام المؤمنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا، آپؐ کی صاحبزادیوں میں سے حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا، نیز حضرت ام کلثوم رضی اللہ عنہا، ان کے علاوہ اسامہ بن زیدرضی اللہ عنہما جو کہ اس

وقت کافی کم سن تھے اور ان کی والدہ ام ایمن رضی اللہ عنہا شامل تھیں۔

سفرِ ہجرت میں ہمارے لئے سبق اور پیغام:

☆...... اللہ پر توکل:

اس تاریخی اور یادگارترین سفر میں امت کیلئے یقیناً سب سے پہلا سبق یہی ہے کہ حالات کیسے ہی کٹھن اور مشکل ترین کیوں نہوں...... بہرصورت صرف اور صرف اللہ پر توکل واعتماد کیا جائے' اسی سے التجاء وفریاد کی جائے، اور اسی سے مدد طلب کی جائے......

اس سفر کے دوران ہر ایک ایک قدم پر' اور بالخصوص غارِ ثور میں قیام کے دوران جب مشرکینِ مکہ تعاقب کرتے ہوئے اس غار کے دہانے تک آپہنچے تھے......رسول اللہ ﷺ کی سیرت وکردار میں توکل علی اللہ کی ایسی نادر ونایاب مثالیں نظر آتی ہیں کہ شاید تمام انسانی تاریخ میں ایسی کوئی اور مثال نہیں مل سکے گی۔

☆......توکل کی حقیقت:

البتہ اس مناسبت سے یہ تذکرہ بھی ضروری ہے کہ اس تاریخی موقع پر رسول اللہ ﷺ نے اپنے مبارک عمل سے ہمیشہ کیلئے امت کو ''توکل کی حقیقت'' بھی بتادی۔

چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ اس تاریخی اور انتہائی خطرناک سفر کے موقع پر آپؐ نے اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ پر تمامتر توکل اور غیر متزلزل اعتماد اور بھروسے کے باوجود ہر وہ سبب اختیار کیا جو اس سلسلے میں مفید ثابت ہوسکتا تھا، مثلاً:

☆......اس سفر کے بارے میں انتہائی رازداری برتی گئی۔

☆......مکہ سے روانگی کے فوری بعد شمال یعنی مدینہ کی جانب چلنے کی بجائے بالکل مخالف

سمت یعنی جنوب کی جانب سفر کیا گیا۔

☆......مسلسل سفر جاری رکھنے کی بجائے ابتداء میں چندروز ''غارِثور''میں توقف کیا گیا، تا کہ تلاش اور تعاقب کا سلسلہ جب کچھ ٹھنڈا پڑ جائے تب وہاں سے آگے اصل سفر کا آغاز کیا جائے۔

☆......اصل سفر پر روانہ ہوتے وقت معروف راستے کی بجائے گمنام اور ویران راستہ اختیار کیا گیا۔

☆......اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی طرف سے رسول اللہ ﷺ کو تمام جہاں والوں کیلئے ''رہبر'' بنا کر بھیجا گیا تھا،مگر اس کے باوجود اس سفرِ ہجرت کے موقع پر آپؐ نے ''احتیاطی تدبیر'' کے طور پر عبداللہ بن اُریقط نامی ''رہبر'' کی خدمات حاصل کیں۔

☆......قدموں کے نشانات مٹانے کیلئے عامر بن فہیرہ نامی چرواہے کو پیشگی تاکید کی گئی کہ وہ اس راستے پر اپنی بکریاں چرائے، نیز بکریوں کا دودھ بھی انہیں پہنچا دیا کرے۔

غرضیکہ رسول اللہ ﷺ نے محض بیٹھے بٹھائے یہ دعویٰ کرنے کی بجائے کہ اپنے اللہ پر مجھے مکمل بھروسہ ہے...... آپؐ نے اس سفر کی تیاری کے سلسلے میں انتہائی کوشش اور محنت ومشقت کی، ہر اس سبب کو اختیار کیا جو اس سفر کو کامیاب بنانے کے سلسلے میں اللہ کے حکم سے نافع ومفید ثابت ہوسکتا تھا۔

یقیناً اس سے ''توکل کی حقیقت''سمجھ میں آتی ہے کہ انسان ہاتھ پر ہاتھ رکھے بیٹھے رہنے اور''توکل'' کا دعویٰ کرنے کی بجائے، خوب کوشش، جدوجہد اور محنت ومشقت کیا کرے، ہر اس سبب کو اختیار کرے جو''مقصود'' تک پہنچنے کیلئے نافع ومفید ثابت ہوسکتا ہو، اور اس کے بعد معاملہ اللہ پر چھوڑ دے، خود کو اللہ کے حوالے کر دے، خوب گڑگڑا کر اور دل لگا کر

اللہ سے مناجات اور دعاء وفریاد کرے...... یہ ہے ''توکل کی حقیقت''۔
پرندہ جب اپنے گھونسلے سے نکلتا ہے' تب اللہ اسے رزق عطاء فرماتا ہے، وہی اللہ اس کمزور مخلوق کو اس کے گھونسلے کے اندر بیٹھے بٹھائے بھی یقیناً رزق عطاء فرما سکتا ہے...... لیکن ایسا نہیں ہوتا...... جب وہ گھونسلے سے باہر آتا ہے...... محنت کرتا ہے...... تلاش وجستجو کرتا ہے...... تب اللہ کی طرف سے اس کیلئے رزق کا انتظام کیا جاتا ہے۔
لہٰذا قانونِ قدرت یہی ہے کہ انسان جو کچھ کر سکتا ہے وہ ضرور کرے...... اور اس کے بعد اللہ پر توکل کرتے ہوئے معاملہ اس کے حوالے کر دے...... اور پھر جو بھی نتیجہ ظاہر ہو اس پر راضی وقانع رہے...... اسی کا نام ''توکل'' ہے۔

☆......امانت ودیانت:

اُس دور میں مشرکینِ مکہ کا یہ معمول تھا کہ وہ اپنی تمام قیمتی اشیاء حفاظت کی غرض سے رسول اللہ ﷺ کے پاس بطورِ امانت رکھوایا کرتے تھے، ہجرت کی رات آپ ﷺ نے وہ تمام امانتیں حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کے حوالے کرتے ہوئے انہیں تاکید فرمائی کہ ''میری روانگی کے بعد تم یہ تمام امانتیں ان کے مالکوں تک پہنچا دینا، اور اس کے بعد مکہ سے ہجرت کرنا''۔
مشرکینِ مکہ کے کردار کا یہ عجیب تضاد تھا...... بلکہ اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ یقیناً ان کے کردار کا یہ ایک بڑا اعجوبہ تھا کہ ایک طرف تو وہ سب رسول اللہ ﷺ کے خون کے پیاسے تھے اور آپ ؐ کی جان کے درپے تھے...... جبکہ اس کے ساتھ ہی دوسری طرف یہ عجیب صورتِ حالت تھی کہ آپس میں تمامتر محبتوں اور قربتوں کے باوجود وہ باہم ایک دوسرے پر بھروسہ کرنے کیلئے قطعاً تیار نہیں تھے...... پورے شہر مکہ میں اگر انہیں بھروسہ تھا' تو صرف

رسول اللہ ﷺ پر ہی تھا......اسی لئے اپنی امانتیں وہ سب ہمیشہ بلاخوف وخطر آپؐ کے پاس ہی رکھوایا کرتے......اور پھر بے فکر ہو جایا کرتے تھے......!

اور پھر اس موقع پر رسول اللہ ﷺ کی بے مثال امانت و دیانت بھی قابلِ غور ہے کہ آپؐ نے لمحہ بھر کیلئے بھی یہ نہیں سوچا کہ میرا یوں گھر سے بے گھر، اور وطن سے بے وطن ہو جانا...... اور یہ تمام تر مشکلات اور یہ نقصانات...... ان سب کی اصل وجہ تو یہی مشرکینِ مکہ ہی ہیں......لہٰذا کیوں نہ میں یہاں سے چلتے چلتے ان کی یہ تمام امانتیں اپنے ہمراہ لیتا چلوں ......تاکہ اس طرح میرے اس نقصان کی کچھ تلافی تو ہو سکے کہ جس کا سبب خود یہی مشرکین مکہ ہی ہیں......!

لیکن آپؐ نے ایسا نہیں کیا......اور آپؐ ایسا کس طرح کرتے......؟ کہ خود آپؐ نے ہی تو اپنی امت کو یہ سنہری تعلیم دی تھی کہ: (أَدِّ الأمَـانَةَ اِلـیٰ مَنِ ائتَمَنَكَ ، وَ لَا تَخُنْ مَن خَـانَكَ)(۱) ترجمہ: (جس نے تمہارے پاس کوئی امانت رکھوائی ہو، تم اس کی امانت اس کے حوالے کر دو، اور جس کسی نے تمہارے ساتھ خیانت کی ہو، تم اس کے ساتھ ہرگز خیانت نہ کرو)۔

یعنی اگر کوئی تمہارے پاس اپنی کوئی چیز بطورِ امانت رکھوائے، اس کے بعد جب بھی وہ اپنی امانت کا تم سے مطالبہ کرے، تم بلا چون و چرا فوراً اس کی امانت اصل حالت میں پوری طرح اور بغیر کسی کمی بیشی کے اس کے حوالے کر دو، اگرچہ اس نے کبھی تمہارے ساتھ کوئی خیانت و بددیانتی کی ہو......لیکن تم جواب میں اس کے ساتھ ایسا نہ کرو‘‘

چنانچہ اپنی امت کیلئے جس طرح رسول اللہ ﷺ کی یہ سنہری اور بے مثال تعلیم تھی، یقیناً آپؐ

(۱) ابوداؤد [۳۵۳۴]

کا اپنا طرزِ عمل اور اخلاق وکردار بھی ایسا ہی بے مثال اور روشن تھا...... آپؐ اپنے بدترین مخالفین اور اپنے جانی دشمنوں کی وہ امانتیں اپنے ہمراہ نہیں لے گئے ...... بلکہ وہ تمامتر امانتیں حضرت علی رضی اللہ عنہ کے حوالے کرتے ہوئے انہیں ان کے مالکوں کے حوالے کرنے کی تاکید وتلقین فرمائی۔

امانت ودیانت کے حوالے سے تمام دنیائے انسانیت ایسی روشن مثال پیش کرنے سے ہمیشہ عاجز وقاصر ہی رہے گی......!

لہٰذا مسلمان ہونے کی حیثیت سے' اور آپ ﷺ کے امتی اور نام لیوا ہونے کی حیثیت سے ہمارا یہ فرض ہے کہ واقعۂ ہجرت کے تعلق سے ہم ''امانت ودیانت'' کے سلسلے میں اپنے گریبان میں جھانکیں...... اپنے ضمیر کو جھنجوڑیں...... اور اپنے اخلاق وکردار کو ٹٹولیں......!!

☆ ......قیمتی ترین متاع؛ دین وایمان:

رسول اللہ ﷺ اور آپؐ کے جاں نثار صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین نے اپنے رب کے حکم کی تعمیل میں مکہ مکرمہ سے مدینہ منورہ کی طرف ہجرت کی، اس مقصد کیلئے انہوں نے اپنی تجارت' زمین جائیداد' گھربار وغیرہ سب ہی کچھ قربان کر دیا، حالانکہ آپ ﷺ نیز آپؐ کے جاں نثار ساتھیوں کو راہِ حق سے برگشتہ کرنے کیلئے مشرکینِ مکہ نے ''ترہیب'' کے ساتھ ساتھ ''ترغیب'' میں بھی کوئی کسر اٹھا نہ رکھی تھی، یعنی ہر قسم کی بدسلوکی' ایذاء رسانی' اور ظلم وتعدّی کے ساتھ ساتھ...... ہر قسم کا لالچ بھی دیا، مختلف حیلوں بہانوں سے مسلمانوں کو بہکانے اور ورغلانے کی سرتوڑ کوششیں کیں، اور ہر قسم کے حربے آزمائے...... غرضیکہ مسلمان اگر ان مشرکینِ مکہ کا مطالبہ تسلیم کرتے ہوئے دینِ اسلام کو ترک کر دیتے' تو نہ صرف یہ کہ ان پر ظلم وتشدد کا سلسلہ بند کر دیا جاتا اور انہیں ان کی دولت اور زمین وجائیداد

سے زبردستی محروم نہ کیا جاتا...... بلکہ اس سے بھی بڑھ کر مزید یہ کہ انہیں بہت کچھ دیا جاتا اورانعام واکرام سے نوازا جاتا۔

لیکن اس کے باوجود حضرات صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین نے اپنا سب کچھ قربان کردیا، زندگی بھر کی جمع پونجی راہِ حق میں لُٹا کر......بس ایمان کی دولت کو غاصبوں اور لٹیروں سے بچانے کیلئے وہاں سے ہجرت کرگئے......

اس سلسلے میں مثالیں تو بہت سی ہیں، لیکن یہاں صرف ایک مثال ذکر کی جارہی ہے:

حضرت صہیب بن سنان رومی رضی اللہ عنہ جب سفرِ ہجرت پر روانہ ہونے لگے تو مشرکینِ مکہ نے ان کا راستہ روکا، اور یوں کہنے لگے کہ ''اے صہیب! تم ملکِ روم سے یہاں خالی ہاتھ آئے تھے، اور پھر یہاں ہمارے شہر مکہ میں رہتے ہوئے تم نے تجارت کی اور یہ تمام روپیہ پیسہ جمع کیا، لہٰذا ہم تمہیں یہاں سے ہرگز جانے نہیں دیں گے''

اس پر انہوں نے جواب دیا کہ ''ٹھیک ہے، میرا تمام روپیہ پیسہ فلاں جگہ موجود ہے......وہ تم وہاں سے لے لو......اور مجھے جانے دو''

اس پر وہ مشرکینِ مکہ خوش ہوگئے اور انہیں جانے کی اجازت دے دی۔

غرضیکہ اس طرزِ عمل سے حضرت صہیب بن سنان رومیؓ نے ہمیشہ کیلئے دنیائے انسانیت کو یہ انمول پیغام دیا کہ مؤمن کیلئے سب سے اہم ترین دولت ایمان کی دولت ہے، کہ سب کچھ لٹا کر بھی اگر اس دولت کو بچالیا جائے تو یہ بہت بڑے فائدے کا سودا ہے۔

اسی واقعے کی طرف قرآن کریم کی اس آیت میں اشارہ کیا گیا ہے: ﴿وَمِنَ النَّاسِ مَن يَّشْرِي نَفْسَهُ ابتِغَاءَ مَرضَاتِ اللّٰهِ وَاللّٰهُ رَؤُوفٌ بِالعِبَادِ﴾ (۱)

(۱) البقرہ [۲۰۷]

ترجمہ:(لوگوں میں سے ایک وہ بھی ہے جو اپنی جان تک فروخت کر دیتا ہے اللہ کی رضا حاصل کرنے کیلئے،اوراللہ تو بندوں پر بڑا ہی مہربان ہے)

یعنی رسول اللہ ﷺ اورآپ کے جاں نثارصحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی نظر میں دنیا کی ہر دولت سے زیادہ' بلکہ اپنی جان سے بھی زیادہ عزیزاورقیمتی ترین متاع ''ایمان'' کی دولت تھی،اوران کا یہ نظریہ تھا کہ مال ودولت باقی رہے یا نہ رہے' جان بچے یا نہ بچے' مگر''ایمان'' بہرصورت سلامت رہے۔

چنانچہ واقعۂ ہجرت ہمیں دعوتِ فکر دیتا ہے کہ ہم اپنے دلوں کوٹٹولیں،اپنے گریبانوں میں جھانکیں،اپنی ایمانی کیفیت کا محاسبہ کریں،اوراپنے اخلاق وکردار کا جائزہ لیں،اوراس عظیم اورتاریخی سفر' یعنی''سفرِ ہجرت''میں پوشیدہ اس پیغام کو ہمیشہ یادرکھیں کہ''ہم جن کے نام لیوااورامتی ہیں......جن سے محبت کے ہم دعویدار ہیں......ان کا نظریہ اوراندازِ فکرتو یہ تھا کہ جو کچھ لٹتا ہے لُٹ جائے' مگرایمان سلامت رہ جائے......یہی واقعۂ ہجرت کا پیغام ہے۔

☆......ہجرت سے مقصود نئے معاشرے کا قیام:

واقعۂ ہجرت کے حوالے سے یہ بات بھی ذہن نشیں رکھی جائے کہ رسول اللہ ﷺ' نیز حضرات صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی مکہ سے مدینہ کی جانب یہ ہجرت محض مشرکینِ مکہ کے ظلم واستبداد سے نجات اوران کی ایذاءرسانیوں سے فرار کی خاطر نہیں تھی......

بلکہ ان کی اس ہجرت سے اصل مقصودایک نئے اورایسے مثالی معاشرے کا قیام تھا کہ جس کی بنیادعقیدہ وایمان' حق وصداقت' اورعدل وانصاف پر ہو،جہاں کسی کے ساتھ کسی قسم کی ظلم وزیادتی' ناانصافی اورحق تلفی کا کوئی تصور نہ ہو،جہاں ہرایک کی جان ومال اورعزت وآبرو مکمل محفوظ ہو،کیونکہ ایسے مثالی معاشرے کا قیام بھی ضروریاتِ دین میں سے ہے۔

☆......اسلامی کیلنڈر کا آغاز:

☆اس دنیا میں جتنی اقوام ہیں اور جتنے مذاہب وادیان کے پیروکار ہیں ان سبھی کے یہاں کیفیت یہ نظر آتی ہے کہ ان میں سے کسی کے سال کا آغاز ہوتا ہے ان کی کسی اہم ترین اور محبوب ومحترم شخصیت کی پیدائش سے، چنانچہ وہ لوگ ہمیشہ نئے سال کی آمد کے موقع پر اس حوالے سے خوشیاں مناتے ہیں۔

اس کے برعکس کسی کا نیا سال شروع ہوتا ہے ان کی کسی اہم شخصیت کی وفات کے دن سے، لہٰذا یہ لوگ ہمیشہ رونے دھونے اور غم منانے میں ہی مشغول ومنہمک رہتے ہیں۔

جبکہ اسلام تو ''اللہ'' کا دین ہے، اور اللہ تو ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ کیلئے ہے، نہ اس کی کوئی ابتداء ہے اور نہ ہی اس کی کوئی انتہاء ہے، لہٰذا اسلامی سال کا تعلق نہ تو کسی کی پیدائش سے ہے اور نہ ہی کسی کی وفات سے...... بلکہ اسلامی سال کا آغاز تو ''واقعۂ ہجرت'' سے ہوتا ہے۔

☆رسول اللہ ﷺ کے مبارک دور میں متعدد ایسے واقعات پیش آئے جو کہ تمام مسلمانوں کیلئے انتہائی مسرت کا باعث بنے...... جبکہ اسی طرح بہت سے ایسے واقعات بھی تواتر کے ساتھ پیش آتے رہے جو کہ انتہائی رنج وغم اور بڑے صدمے کا سبب بنے۔

لیکن یہ بات قابلِ غور ہے کہ اسلامی سال کے آغاز کیلئے مسرتوں سے بھرپور کسی واقعے کا انتخاب نہیں کیا گیا...... کیونکہ ہمیشہ خوشیاں مناتے رہنا اور اصل مقصد سے غافل ہو جانا دینِ اسلام کے مزاج کے خلاف ہے۔

بعینہٖ اسی طرح کسی اندوہناک واقعے کو بھی اسلامی سال کے آغاز کیلئے منتخب نہیں کیا گیا، کیونکہ ہمیشہ غم منانا، روتے رہنا، اور پست ہمتی کا شکار ہو جانا بھی یقیناً مسلمان کی شان کے

خلاف ہے۔

لہٰذا ہم دیکھتے ہیں کہ ''اسلامی سال'' کا آغاز ''واقعۂ ہجرت'' سے کیا گیا، تاکہ ہمیشہ نئے سال کی آمد کے موقع پر وہ قیمتی ترین سبق اور وہ اہم ترین پیغام ذہنوں میں تازہ ہوتا رہے کہ جو اس تاریخی واقعے میں ہمارے لئے پوشیدہ ہے......یعنی: اللہ پر سچا ایمان، حقیقی توکل، امانت ودیانت کی ضرورت واہمیت، دین وایمان کی حفاظت کی خاطر بڑی سے بڑی قربانی کیلئے ہمہ وقت مستعد رہنے کا جذبہ وشعور، حق کی سربلندی کی خاطر جہدِ مسلسل اور سعیٔ پیہم......نیز ہر قسم کے حالات میں صراطِ مستقیم پر مکمل استقامت کے ساتھ گامزن رہنا......!

☆ اسلامی کیلنڈر کے آغاز کیلئے ''واقعۂ ہجرت'' کے انتخاب کی ایک اہم وجہ یہ بھی ہے کہ یہ اس قدر عظیم الشان اور ایسا بے مثال واقعہ ہے کہ جس کے نتیجے میں اسلامی تاریخ ہمیشہ کیلئے بدل گئی......دینِ اسلام جو کہ ہجرت سے قبل محض مکہ شہر کے اندر محصور تھا' اب ہجرت کے بعد دیکھتے ہی دیکھتے زمان ومکان کی تمام حدود وقیود کو توڑتا ہوا مشرق ومغرب میں......شمال اور جنوب میں......دنیا کے ہر خطے......اور ہر گوشے میں جا پہنچا۔

مکہ میں مسلمان انتہائی کمزور اور مظلوم ومجبور تھے، بے بسی وکسمپرسی کی زندگی بسر کر رہے تھے، جبکہ ہجرت کے بعد ان کیلئے اب ایک نئی اور بدلی ہوئی زندگی کا آغاز ہوا......ایسی زندگی جو کہ ان کی مکی زندگی سے یکسر مختلف تھی۔

غرضیکہ ''واقعۂ ہجرت'' چونکہ مسلمانوں کیلئے دینی' معاشی' سیاسی......غرضیکہ ہر لحاظ سے ہمیشہ کیلئے انتہائی خوشگوار تبدیلی کا ''نقطۂ آغاز'' ثابت ہوا......لہٰذا اسلامی سال کا آغاز بھی واقعۂ ہجرت سے ہی کیا گیا۔

نئی زندگی:

مدینہ میں دینی، معاشرتی، وسیاسی صورتِ حال:

رسول اللہ ﷺ نے بعثت سے قبل اپنی حیاتِ طیبہ کے چالیس سال اس دنیامیں گذارے، اور پھر جب آپؐ کواللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کی طرف سے نبوت عطاء کی گئی تواب آپؐ کی پیغمبرانہ زندگی کا آغاز ہوا،آپؐ کی یہ پیغمبرانہ زندگی تئیس سال کے عرصے پرمحیط ہے،جس میں سے ابتدائی تیرہ سال آپؐ نے مکہ مکرمہ میں گذارے،اورپھرہجرت کاحکم نازل ہونے پرآپؐ مکہ سے مدینہ(اُس دورمیں جسے یثرب کہاجاتاتھا)ہجرت فرماگئے، جہاں آپؐ نے اپنی حیاتِ مبارکہ کےآخری دس سال گذارے۔

رسول اللہ ﷺ کی تیرہ سالہ''مکی زندگی''کوجس طرح تین حصوں میں تقسیم کیاگیاتھا،اسی طرح دس سال کےعرصے پرمحیط اس''مدنی زندگی''کوبھی تین حصوں میں تقسیم کیاگیاہے:

☆......پہلا دور:

مدینہ آمد کے بعد سے سنہ ٦ ہجری میں پیش آنے والے''صلحِ حدیبیہ''کے واقعے تک کاچھ سالہ دور، جس کے دوران چھپے ہوئے اندرونی دشمنوں، نیز بیرونی دشمنوں نے مختلف مشکلات پیدا کیں، متعدد جنگوں کی نوبت آئی، بالآخر''صلحِ حدیبیہ''کے نتیجے میں صورتِ حال میں تبدیلی رونماہوئی۔

☆......دوسرادور:

صلحِ حدیبیہ کے بعددوسالہ دور،اس صلح کی وجہ سے چونکہ رسول اللہ ﷺ نیزآپؐ کے جاں

نثارساتھیوں کومشرکینِ مکہ کی طرف سے قدرے بےفکری میسر آئی تھی' لہٰذااس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے آپ ﷺ نے تبلیغِ دین کا فریضہ انجام دیتے ہوئے مختلف سربراہانِ مملکت' فرمانرواؤں' اورحکمرانوں کے نام دعوتی خطوط ارسال فرمائے۔

تاہم یہ امن عارضی ثابت ہوا، مشرکینِ مکہ کی طرف سے مسلسل عہدشکنی کے نتیجے میں بالآخر دوسال کا عرصہ گذرنے کے بعدسنہ ۸ ہجری میں اس معاہدۂ صلح کا خاتمہ ہوگیا۔

☆……تیسرادور:

سن ۸ ہجری ماہِ رمضان میں فتحِ مکہ کے تاریخی واقعہ سے سن ۱۱ ہجری ماہِ ربیع الاول میں رسول اللہ ﷺ کی اس جہانِ فانی سے رحلت تک کا تقریباً ڈھائی سالہ دور۔

اس دورمیں چونکہ فتحِ مکہ کے نتیجے میں مشرکین کا غلبہ ختم ہوگیا، ان کی شان وشوکت جاتی رہی…… اور وہ ظاہری ونفسیاتی طورپرٹوٹ پھوٹ کا شکار ہوگئے……جس کے نتیجے میں ملکِ عرب کے طول وعرض میں لوگ فوج درفوج دائرہ اسلام میں داخل ہونے لگے…… دوردراز کے علاقوں سے لوگ بڑی تعدادمیں بڑے بڑے وفودکی شکل میں دینِ اسلام قبول کرنے کیلئے مدینہ آنے لگے……اس دوسالہ دورمیں ان وفودکا مستقل تانتابندھارہا۔

☆……نیامعاشرہ:

ہجرتِ مدینہ سے مقصود یہ نہیں تھا کہ محض مشکلات سے نجات کی خاطرکسی ایک جگہ سے دوسری جگہ کی جانب ''نقل مکانی'' کرلی جائے۔

بلکہ اصل مقصودایک نئے معاشرے کا قیام تھا کہ جس کی بنیادعقیدہ وایمان پرہو، جس کا اپنا کوئی تشخص ہو، کوئی قانون ہو، کوئی دستورہو……ورنہ محض ''نقل مکانی'' کی تو کوئی

ضرورت نہیں تھی۔

ہجرت کے بعداب اس نئی جگہ پر ہر مسلمان کا یہ فرض تھا کہ وہ اس نئے معاشرے کی تشکیل کیلئے محنت وکوشش اورفکروجستجو کرے، ہرکوئی اپنی ذمہ داری نبھائے اوراپنافرض پورا کرے......اوراس سلسلے میں ان سب کے متفقہ قائداوررہبرورہنما خودرسول اللہ ﷺ تھے۔

مکی دور میں تمام مسلمان اگرچہ عقیدہ وایمان کے معاملے میں یقیناًباہم متفق ومتحد تھے، لیکن ان کا کوئی مستقل معاشرہ نہیں تھا، وہ سب وہاں متفرق اورمنتشر تھے، الگ الگ محلوں اوربستیوں میں...... کسی ایک محلے میں اکادکا مسلمان...... دوردراز کسی دوسرے محلے میں دوچار مسلمان......لہٰذا مکی دور میں مسلمانوں کی کوئی مستقل معاشرتی زندگی نہیں تھی۔

یہی وجہ ہے کہ مکی دور میں قرآن کریم کی جوسورتیں یاجوآیات نازل ہوئیں ان میں صرف ایسی بنیادی تعلیمات تھیں کہ جن پر ہرکوئی اپنی اپنی جگہ انفرادی طور پرعمل کرسکتا تھا، ان میں اجتماعی یامعاشرتی مسائل کا کوئی تذکرہ نہیں تھا۔

لیکن اب یہاں مدینہ میں وہ سب یکجا تھے، آزاد تھے، مکمل خودمختار بھی تھے، اب اس نئے اورآزادومکمل خودمختارمعاشرے کیلئے نئے قانون' نئے آئین' اورنئے دستور کی ضرورت تھی، کیونکہ اب تو گویاباقاعدہ ایک نئی مملکت وجود میں آچکی تھی......اس نوزائیدہ مملکت کوکس طرح چلاناہے؟ یہاں قواعدوقوانین کیاہوں گے؟ معیشت اورروزگار کے مسائل کاحل کیا ہوگا؟ اندرونی وبیرونی خطرات سے کس طرح نپٹاجائے گا؟ جغرافیائی ونظریاتی سرحدوں کی حفاظت کا کیاانتظام ہوگا؟ نیز اجتماعی ومعاشرتی مسائل کاحل ......تجارت' سیاست' معیشت واقتصاد سے متعلق امور......وغیرہ......یقیناًیہ سب کچھ بہت بڑاچیلنج تھا۔

اور پھر مزید یہ کہ اس بڑے چیلنج سے نپٹنے کیلئے اس شہر' اس علاقے ' اس ماحول' نیز وہاں آباد لوگوں کے مذہبی' سیاسی' معاشی' ومعاشرتی اموراوران کے پس منظر سے مکمل واقفیت وآگاہی ضروری تھی، تاکہ کوئی بھی قاعدہ وقانون یا آئین ودستور ترتیب دیتے وقت ان تمام امور کو ملحوظِ خاطر اور مدِ نظر رکھا جاسکے۔

چنانچہ اُس وقت مدینہ کے باشندوں کی صورتِ حال کچھ یوں تھی کہ انہیں درجِ ذیل تین اقسام میں تقسیم کیا جاسکتا ہے:

☆……صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین:

سب سے پہلی قسم کے لوگ رسول اللہ ﷺ کے جاں نثار صحابۂ کرام تھے جو آپ ؐ کے محض ایک اشارے پر ہمہ وقت اپنا تن من دھن سب ہی کچھ قربان کردینے کیلئے آمادہ وتیار رہتے تھے۔ پھر ان صحابۂ کرام کی دو قسمیں تھیں، مہاجرین وانصار:

☆ ''مہاجرین'' وہ حضرات تھے جو دراصل مکہ کے باشندے تھے، اور محض اپنے دین وایمان کی حفاظت کی خاطر اللہ کے حکم کی تعمیل میں اپنا گھربار' اپنا کاروبار……اور اپنا سبھی کچھ……مکہ میں چھوڑ کر وہاں سے خالی ہاتھ اور بے سروسامان مدینہ چلے آئے تھے۔

☆ جبکہ ''انصار'' مدینہ ہی کے اصل باشندے تھے اور دینِ اسلام قبول کرلینے کے بعد بھی بدستور اپنے شہر میں اور اپنے گھروں میں ہی آباد تھے، لہٰذا (اس لحاظ سے) ان دونوں یعنی مہاجرین وانصار کے حالات کافی مختلف تھے۔

☆……مقامی مشرکین:

یہ لوگ ابھی تک اپنے آبائی دین یعنی شرک وبت پرستی پر ہی قائم تھے، اوران کی بھی دو

قسمیں تھیں:

☆ایک تو وہ لوگ کہ جواب تک'یعنی رسول اللہ ﷺ کی مدینہ منورہ تشریف آوری کے بعد بھی متردد تھے کہ اپنے آباؤ اجداد کے دین پر ہی بدستور قائم رہیں......یا یہ کہ اب دینِ اسلام قبول کرلیں......؟

ایک طرف آباؤ اجداد کے دین سے محبت نے انہیں پریشان کر رکھا تھا، اس دین کو چھوڑ کر کوئی نیا دین اپنالینا ان کی نظر میں گویا اپنے آباؤ اجداد کے ساتھ غداری و بیوفائی کے مترادف تھا......جبکہ دوسری طرف یہ کہ مدینہ میں اب وہ جہاں جاتے......جس طرف ان کی نگاہ اٹھتی...... ہر طرف مسلمان ہی نظر آتے...... لہٰذا اب اپنے چاروں طرف پھیلے ہوئے ان مسلمانوں کے درمیان اجنبی بن کر رہنا بہت مشکل محسوس ہوتا تھا......یوں یہ لوگ ابتداء میں کچھ عرصہ ذہنی کشمکش میں مبتلا رہے ...... اور بڑے تردد کا شکار رہے......لیکن جلد ہی انہیں شرحِ صدر ہو گیا اور انہوں نے دینِ اسلام قبول کرلیا اور یوں ہمیشہ کیلئے بہت ہی اچھے اور سچے مسلمان ثابت ہوئے۔

☆جبکہ دوسرے وہ لوگ تھے کہ جو اپنے ظاہری و دنیاوی مفادات کی خاطر بظاہر مسلمان ہو گئے......یعنی یہ ''ابن الوقت'' قسم کے لوگ تھے، اور چڑھتے سورج کے پجاری تھے، کہ دنیاوی مفادات کی خاطر بظاہر مسلمان ہو گئے......لیکن......دل ہی دل میں اپنے پرانے دین اور پرانے طور طریقوں کو ہی اچھا سمجھتے رہے......گویا ''زبان پر کچھ...... اور دل میں کچھ......''یوں آئندہ چل کر یہ لوگ ''منافقین'' کہلائے۔

یہ منافقین ہمیشہ رسول اللہ ﷺ کو' نیز دیگر تمام مسلمانوں کو پریشان کرتے رہے، بیرونی دشمنوں کے ساتھ مل کر مسلمانوں کیلئے قدم قدم پر مشکلات پیدا کرتے رہے، اور درپردہ

سازشوں کے جال بنتے رہے......اوران تمام منافقین کا سرغنہ ''عبداللہ بن اُبی'' تھا۔

دراصل رسول اللہ ﷺ کی مدینہ منورہ تشریف آوری سے قبل وہاں عرصۂ دراز سے صورتِ حال کچھ ایسی چلی آرہی تھی کہ باہمی قبائلی جنگوں کا ایک لامتناہی سلسلہ تھا' جس نے مدینہ کے تمام باشندوں کو ہلکان اورنڈھال کررکھا تھا،آپس کی ان خونریزیوں اورتباہ کاریوں سے وہ تنگ آچکے تھے،اوراب وہ اس مصیبت سے مستقل نجات کا کوئی پائیدارحل چاہتے تھے۔ آخرغوروفکر کے بعدپہلی باروہ اس نتیجے پر پہنچے تھے کہ نسل درنسل چلی آنے والی ان طویل اورخونریزجنگوں کے پیچھے اقتدارکی خواہش کارفرماہے، اوریہ تمام ترر سہ کشی محض حصولِ اقتدارکیلئے ہے......اورتب انہوں نے سوچا کہ ''اقتدار'' کی اس ''ہوس'' سے جان چھڑائی جائے......اورتمام قبائل متفقہ طورپرکسی ایک شخص کواپنا ''بادشاہ'' تسلیم کرلیں۔

چنانچہ ان سب نے متفقہ طورپریہ طے کیا کہ عبداللہ بن اُبی ان کا بادشاہ ہوگا......اورپھراس کیلئے ایک شاہی تخت کاانتظام کیا گیا......شاہی تاج بھی تیارکیا گیا......حتیٰ کہ اس کی تخت نشینی اورتاج پوشی کی تاریخ بھی مقررکرلی گئی......اوراس مقصدکیلئے تمامترانتظامات کرلئے گئے۔

لیکن عین انہی دنوں رسول اللہ ﷺ اپنے رب کے حکم کی تعمیل کرتے ہوئے اپنے آبائی شہرمکہ مکرمہ سے ہجرت فرماکرمدینہ منورہ آپہنچے......جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ عبداللہ بن اُبی کا بادشاہ بننے کاوہ خواب ادھورارہ گیا......اسے اپنے خواب کی تعبیرنہ مل سکی......ظاہرہے کہ اس کیلئے یہ بہت بڑاصدمہ تھا......لہٰذارسول اللہ ﷺ اورمسلمانوں کی مدینہ آمداسے انتہائی ناگوارگذری......اورپھربظاہراسلام قبول کرلینے کے باوجودوہ ہمیشہ مسلمانوں کے خلاف مکروفریب اورسازشوں کے تانے بانے بُننے میں پیش پیش رہا......حتیٰ کہ اپنی انہی مذموم

ومکروہ حرکتوں کی وجہ سے ہمیشہ کیلئے ’’رئیس المنافقین‘‘ کے لقب سے مشہور ہوگیا۔

☆......یہود:

مدینہ میں یہودی بڑی تعداد میں آباد تھے، جوکہ دراصل مقامی باشندے نہیں تھے، اصل میں ان کا تعلق ملکِ شام کے مختلف علاقوں سے تھا، لیکن جب وہاں مختلف جنگوں اور خونریزیوں کے نتیجے میں' اور بالخصوص رومیوں کے غلبہ اور تسلط کے بعد جب وہاں ان کیلئے حالات ناسازگار ہوتے گئے تو وہ اپنا وطن چھوڑ کر پناہ کی تلاش میں اِدھر اُدھر منتشر ہونے لگے، اسی سلسلے میں بڑی تعداد میں وہ حجاز کے مختلف علاقوں اور بالخصوص خیبر اور مدینہ (جس کا نام اُس وقت یثرب تھا) میں بھی آ کر بس گئے۔

ان کی اصل زبان عبرانی تھی، لیکن انہوں نے رفتہ رفتہ عربی زبان سیکھ لی، مقامی رسم ورواج اور طور طریقے اپنا لئے، اور یوں لسانی' ثقافتی اور تمدنی لحاظ سے مقامی آبادی میں خوب رچ بس گئے، حتیٰ کہ مقامی آبادی کا ہی ایک حصہ بن گئے۔

یہودیوں کو اپنے دین کی نشر واشاعت سے کوئی غرض نہیں تھی، کیونکہ وہ خود کو باقی لوگوں سے اعلیٰ وافضل تصور کرتے تھے، لہٰذا انہیں یہ بات ہرگز قبول نہیں تھی کہ دوسرا کوئی اس شرف اور اعزاز میں ان کے ساتھ حصے دار بنے۔

مقامی لوگوں کو یہ جاہل' گنوار اور حقیر سمجھتے، جب موقع ملتا اپنے مکروفریب کے ذریعے انہیں لوٹ لیتے، انہیں دھوکہ دیتے، ان کا مال دبا لیتے، ان کا حق چھین لیتے......اور اس حرکت کو وہ اپنا پیدائشی اور جائز حق قرار دیتے......حتیٰ کہ ان کی اسی مذموم حرکت کی طرف خود قرآن کریم میں بھی اشارہ کیا گیا: ﴿......ذٰلِكَ بِأَنَّهُم قَالُوا لَيسَ عَلَينَا فِي

الْأُمِّيِّينَ سَبِيلٌ﴾ (۱) ترجمہ: (…… یہ اس لئے کہ انہوں نے یہ کہہ رکھا ہے کہ ہم پر ان جاہلوں کے حق کا کوئی گناہ نہیں ہے)

یعنی یہ لوگ پیدائشی طور پر اپنا یہ جائز حق سمجھتے تھے کہ ہم چونکہ دوسروں سے بہت اعلیٰ وافضل ہیں …… اللہ کے بیٹے اور اس کے لاڈلے ہیں…… جبکہ یہ مقامی افراد تو بس جاہل' گنوار……اور حقیر وکمتر قسم کے لوگ ہیں……لہٰذا ہم اگر اپنی عیاری ومکاری کے ذریعے ان کا حق دبا لیتے ہیں……اور انہیں لوٹ لیتے ہیں……تو اس میں قطعاً کوئی قباحت نہیں…… کیونکہ یہ تو ہیں ہی اسی قابل کہ ہم انہیں لوٹا ہی کریں……

اُن دنوں وہاں مدینہ میں ان یہودیوں کے دو پسندیدہ ترین مشاغل تھے، جادوٹونہ اور تجارت۔

جادوٹونے میں یہ بہت پہنچے ہوئے تھے، بس یہی ان کا شب وروز کا مشغلہ تھا……حتیٰ کہ خود رسول اللہ ﷺ پر بھی انہوں نے جادو کیا۔

اسی طرح تجارت میں انہیں بڑی مہارت حاصل تھی، اور یہ اس حقیقت سے خوب آگاہ تھے کہ کسی بھی معاشرے پر اپنا تسلط قائم رکھنے کیلئے معاشی برتری بہت ضروری ہے…… جائز وناجائز ہر قسم کے ہتھکنڈے اپنا کر کسی بھی صورت بس اپنی اجارہ داری اور معاشی برتری قائم رکھی جائے…… دوسروں کو بہر صورت اپنا محتاج بنا کر رکھا جائے……کوئی کتنا ہی ہیبت ناک' خونخوار' اور طاقتور شیر ہی کیوں نہو……لیکن اگر چند دن کیلئے اس کا دانہ پانی بند کر دیا جائے……اور اسے بھوکا پیاسا رکھا جائے……تو وہ خود بخود قابو میں آجائے گا……

یہ ان کا اندازِ فکر تھا، اور پھر اسی کے مطابق ان کا طرزِ عمل بھی تھا، لہٰذا تجارت اور معیشت پر

(۱) آل عمران [۷۵]

ان کی خوب مضبوط گرفت تھی۔

مزید یہ کہ مکروفریب' عیاری ومکاری' اورسازشوں کے تانے بنے بننے میں ان کا کوئی ثانی نہیں تھا۔

چنانچہ یہ لوگ مقامی افراد کو' اور بالخصوص ان میں سے جوصاحبِ حیثیت اورقبائلی سردارقسم کے لوگ ہوتے' انہیں یہ جان بوجھ کرایسی نازیباحرکتوں اور بری عادتوں پراُکساتے کہ جن کیلئے مال کی ضرورت ہوتی......انہیں برائی کاراستہ دکھانے اوربری عادتوں میں مبتلاکردینے کے بعداب اس نشے اوربرے شوق کی تکمیل کیلئے انہیں سود پرروپیہ پیسہ بھی مہیاکرتے......اوریوں ان کی اخلاقی ومعاشرتی بربادی کےساتھ ساتھ......مالی طورپربھی انہیں مفلس وکنگال کرتے چلے جاتے......اوراپنے شکنجے میں کستے چلے جاتے......!

اس کے علاوہ یہ کہ یہ یہودی مختلف مقامی قبائل کوآپس میں لڑواتے،خودخفیہ اورپسِ پردہ رہتے ہوئے ان میں باہمی اختلافات اورفتنوں کوہوادیتے،جس کے نتیجے میں عرصۂ درازتک جاری رہنے والی بڑی خونریزجنگوں کی نوبت آتی،اوران جنگوں کیلئے مقامی افرادکواسلحہ کی جب ضرورت پیش آتی تواسلحہ ودیگرسامانِ جنگ خریدنے کی غرض سے یہ یہودی انہیں بڑی بڑی رقمیں سودی قرض پرمہیاکرتے......اوریوں مقامی افرادآپس میں لڑتے لڑتے مسلسل کمزوروناتواں ہوتے چلے جاتے،اپنے تمامتروسائل ان تباہ کن جنگوں کی آگ میں جھونک دیتے......جبکہ یہودی اپنی صفوں میں اتفاق واتحاداوراپنی بستیوں میں امن وامان کی وجہ سے مضبوط سے مضبوط تر ہوتے چلے جاتے......نیزاس سودی قرضے کی وجہ سے مقامی افرادمسلسل محتاج وکنگال ...... جبکہ یہودی اپنی تجوریاں بھرتے چلے جاتے......!

اس صورتِ حال میں رسول اللہ ﷺ ودیگر مسلمانوں کی جب مکہ سے مدینہ آمد ہوئی تو یہ چیز یہودِ مدینہ کوسخت ناگوارمحسوس ہوئی، ان کی کتابوں میں رسول اللہ ﷺ کے بارے میں جوتذکرہ تھا، اورجوواضح نشانیاں بیان کی گئی تھیں…… ان کی وجہ سے وہ دینِ اسلام اور پیغمبرِ اسلام کی حقانیت وصداقت سے بخوبی آگاہ تھے……لیکن اس کے باوجود محض اپنی ضداورعناداورخبثِ باطن کی وجہ سے اسلام اورمسلمانوں سے سخت نالاں تھے اور ہروقت عداوت ومخالفت پرآمادہ وکمربستہ رہتے تھے۔

☆ ……ان داخلی اوراندرونی پریشانیوں کے علاوہ مزید یہ کہ مسلمان ابھی مدینہ میں سکھ کا سانس بھی نہ لینے پائے تھے کہ مشرکینِ مکہ کے بارے میں مسلسل ایسی خبریں آنے لگیں کہ وہ خوب زوروشور کے ساتھ مسلمانوں کے خلاف لشکرکشی کی تیاریوں میں مشغول ہیں، تاکہ مدینہ میں مسلمانوں کے سنبھلنے اورپھلنے پھولنے سے پہلے ہی ان کا خاتمہ کردیا جائے……

لہٰذا مدنی زندگی میں مسلمانوں کوابتداء سے ہی اندرونی خفیہ دشمنوں (یعنی منافقین اور یہود) کے علاوہ مزید یہ کہ مشرکینِ مکہ کی طرف سے بھی بڑے اندیشے اورتشویش کا سامنا تھا۔

یہ تھے وہ حالات……اور یہ تھے وہ اندرونی وبیرونی خطرات جن کے درمیان رسول اللہ ﷺ نے اس نوزائیدہ اسلامی ریاست کی بنیادرکھی۔

☆☆☆

الحمدللہ آج بتاریخ ۶/ جمادیٰ الأولیٰ ۱۴۳۴ھ، مطابق ۱۸/ مارچ ۲۰۱۳ء بروز پیر یہ باب مکمل ہوا۔

رَبَّنَا تَقَبَّل مِنَّا اِنّکَ أنتَ السَّمِیعُ العَلِیمُ ، وَتُب عَلَینَا اِنَّکَ أنتَ التَوَّابُ الرَّحِیمُ

نئے معاشرے کی تشکیل کیلئے

فوری اقدامات

رسول اللہ ﷺ نے ہجرت کے بعد مدینہ منورہ میں نئے معاشرے کی تشکیل اور اس نوزائیدہ اسلامی ریاست کی تأسیس کی غرض سے چند فوری اور بنیادی قسم کے اقدامات کئے جن کے اثرات وثمرات آئندہ چل کر انتہائی مفید اور دوررس ثابت ہوئے۔

☆......مسجدِ نبوی کی تعمیر:

رسول اللہ ﷺ ہجرت کے موقع پر جب مکہ سے سفر کرتے ہوئے مدینہ منورہ تشریف لائے تھے، اُس موقع پر آپؐ کی اونٹنی مختلف گلیوں، محلوں، نیز مختلف قبائل کے مساکن میں سے گذرتی ہوئی مسلسل آگے بڑھتی چلی جارہی تھی، راستے میں بار بار لوگ دیوانہ وار آگے بڑھ کر اس اونٹنی کو روکنے کی کوشش کرتے اور اور انتہائی عقیدت ومحبت کے ساتھ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں گذارش کرتے کہ ''اے اللہ کے رسول! بس یہیں ہمارے محلے میں رُک جائیے ......ہمیں خدمت کا موقع عنایت فرمائیے......لیکن آپؐ بار بار یہی ارشاد دہراتے:

''دَعُوهَا فَإِنَّهَا مَأمُورَة'' یعنی ''اسے چھوڑ دو، یہ اللہ کے حکم سے چل رہی ہے''

بالآخر چلتے چلتے وہ اونٹنی مدینہ کے مشہور خاندان ''بنونجار'' کے محلے میں ایک جگہ جا کر رُک گئی تھی، اور پھر کچھ دیر اِدھر اُدھر گردن گھمانے کے بعد اسی جگہ بیٹھ گئی تھی......اور یہ جگہ حضرت ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ کے گھر کے دروازے کے عین سامنے تھی۔

مدینہ منورہ میں چند دن گذرنے کے بعد رسول اللہ ﷺ نے جب مسلمانوں کیلئے روزانہ

پانچ وقت کی نماز باجماعت کی ادائیگی کی غرض سے مسجد کی تعمیر کا فیصلہ فرمایا‘ تب اس مقصد کیلئے جس جگہ کا انتخاب کیا گیا‘ اتفاقاً یہ وہی جگہ تھی کہ جہاں آپؐ کی اونٹنی آ کر رُکی تھی۔ چنانچہ تعمیرِ مسجد کے مبارک کام کا آغاز کیا گیا، اس کام میں رسول اللہ ﷺ اپنے صحابۂ کرام کے شانہ بشانہ مستقل طور پر بنفسِ نفیس شریک رہے...... آپؐ اس موقع پر لکڑی‘ پتھر‘ مٹی وغیرہ ودیگر سامانِ تعمیر اپنے کندھوں پر اٹھا کر اِدھر اُدھر لے جاتے رہے...... غرضیکہ تعمیرِ مسجد کے اس مشکل اور کٹھن کام میں آپؐ ابتداء سے انتہاء تک خود شریک رہے۔

☆ رسول اللہ ﷺ کی ہر بات میں اس قدر تاثیر کیوں تھی؟ آپؐ کی ہر بات فوراً مخاطَب کے دل کی گہرائیوں میں کیوں اُتر جاتی تھی؟ اس کی بہت بڑی وجہ یہی تھی کہ آپؐ کے قول وفعل میں کوئی تضاد نہیں تھا، آپؐ جب بھی دوسروں کو کسی کام کا حکم دیتے تو سب سے پہلے خود وہ کام انجام دیتے...... دوسروں سے پیش پیش رہتے...... اور یوں آپؐ کے قول وفعل میں مکمل مطابقت کی وجہ سے لوگ آپؐ کی گفتگو سے...... آپؐ کی شخصیت سے...... اور آپؐ کی تعلیمات سے متأثر ہوئے بغیر نہ رہتے......!

قول وفعل میں مطابقت کے اسی زریں اصول کا عملی نمونہ ہمیں ’’تعمیرِ مسجد‘‘ کے موقع پر بھی خوب واضح نظر آتا ہے کہ آپؐ دوسروں کو اس کام میں شرکت کی ترغیب دینے کے بعد خود کسی ایک جگہ آرام سے بیٹھ نہیں گئے...... بلکہ آپؐ بنفسِ نفیس اس کام میں شریک رہے...... دوسروں سے آگے آگے رہے...... یہی وجہ تھی کہ آپؐ کو اس طرح محنت ومشقت کرتے ہوئے دیکھ کر صحابۂ کرام کے دلوں میں بھی جذبہ تازہ ہوجاتا...... ہمتیں بلند ہوجاتیں...... تھکاوٹ سے چور ہوجانے کے باوجود وہ خوب ہنسی خوشی اور انتہائی ذوق وشوق اور دلجمعی کے ساتھ اس مقدس کام میں مگن رہتے...... اور اسی موقع پر ان میں سے

کسی نے یہ یادگار شعر کہا تھا:

لَئِن قَعَدنَا وَ النَّبِیُّ یَعمَلُ ...... لَذاكَ مِنَّا العَمَلُ المُضَلّلُ

یعنی''ہم اگر اپنی جگہ بیٹھے رہیں......جبکہ ہماری آنکھوں کے سامنے اللہ کے نبی ﷺ کام کاج اور محنت ومشقت میں مشغول رہیں......یقیناً یہ تو بہت ہی بڑی گمراہی ہوگی......!

چنانچہ اسی طرح محنت ومشقت اور ایسے ہی بے مثال جذبے کے ساتھ تعمیرِ مسجد کا مبارک کام انجام دیا گیا اور یہ کام بخیر وخوبی پایۂ تکمیل کو پہنچا۔

اس مسجد کی عمارت بہت ہی سیدھی سادھی تھی،فرش ریت اور کنکریوں کا تھا......چھت کھجور کے پتوں کی......ستون کھجور کے تنوں کے......جبکہ دیواریں کچی تھیں...... جب کبھی بارش ہوتی تو چھت ٹپکنے لگتی،اور پیروں میں کیچڑ نمازیوں کیلئے پریشانی کا باعث بن جاتا۔

رسول اللہ ﷺ نے مدینہ منورہ میں اپنی تشریف آوری کے فوری بعد جو تعمیرِ مسجد کا کام انجام دیا، اور پھر اس کام میں بنفسِ نفیس خود بھی شرکت فرمائی......یقیناً اس سے اسلامی معاشرے میں مسجد کی اہمیت وضرورت واضح ہوتی ہے......حقیقت یہ ہے کہ مسجد اسلامی معاشرے کی پہچان ہے، جہاں کہیں مسلمانوں کی کوئی بستی ہوگی، وہاں مسجد ضرور نظر آئے گی......!

مدینہ منورہ میں رسول اللہ ﷺ کی تعمیر فرمودہ یہ مسجد مسلمانوں کیلئے عبادت گاہ بھی تھی......روحانی ومادی علوم کی عظیم درسگاہ بھی......داخلی وخارجی تعلقات کی تعلیم وتربیت کا ادارہ بھی......اور عسکری تربیت کا مرکز بھی......اس مسجد کے سامنے آج کے بڑے بڑے علمی وثقافتی وعسکری ادارے ہیچ ہیں......اور اسی مسجد سے ہی علم ومعرفت کا......اور نور کا وہ سیلاب پھوٹا......کہ جس کی شعاعوں نے ساری دنیا کو منور کر دیا......!!

☆......مؤاخاۃ:

مدنی زندگی کے آغاز میں دوسرا جو فوری اور اہم ترین اقدام کیا گیا وہ ''مؤاخاۃ'' تھا، جس کے لفظی معنیٰ ہیں ''آپس میں بھائی بھائی بنا دینا''۔

رسول اللہ ﷺ کے ساتھیوں میں سے کچھ مہاجرین تھے، جن کا تعلق شہر مکہ سے تھا، اور جو محض اپنے دین وایمان کی حفاظت کی خاطر اپنا شہر' اپنا گھربار' اپنا کاروبار' اپنی زمین جائیداد' اور اپنا سبھی کچھ مکہ میں چھوڑ کر اللہ ورسول ﷺ کے حکم کی تعمیل میں خالی ہاتھ مدینہ چلے آئے تھے، جو اصل میں مفلس ونادار نہیں تھے، وہاں مکہ میں ان کے پاس سبھی کچھ تھا، ان میں سے اکثر وہاں اپنے گھروں میں خوشحالی کی زندگی بسر کر رہے تھے، لیکن اب یہ افراد جب خالی ہاتھ مدینہ پہنچے تو ان کی فوری آبادکاری اور ان کیلئے بنیادی ضروریات کی فراہمی یقیناً بہت بڑا مسئلہ تھا۔

قرآن کریم میں انہی حضرات کے بارے میں ارشاد ہے: ﴿لِلفُقَرَآءِ المُهَاجِرِينَ الَّذِينَ أُخْرِجُوا مِن دِيَارِهِم وَأَموَالِهِم يَبْتَغُونَ فَضلاً مِّنَ اللّٰهِ وَ رِضْوَاناً وَّ يَنْصُرُونَ اللّٰهَ وَ رَسُولَهُ أُولٰٓئِكَ هُمُ الصَّادِقُونَ﴾ (۱) ترجمہ: (اُن مہاجر مسکینوں کیلئے جو اپنے گھروں سے اور اپنے مالوں سے نکال دیئے گئے ہیں' وہ اللہ کے فضل اور اس کی رضامندی کے طلبگار ہیں' اور اللہ کی اور اس کے رسول کی مدد کرتے ہیں' یہی سچے لوگ ہیں)

اس آیت میں اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کی طرف سے حضرات مہاجرین کی فضیلت' ان کا مقام ومرتبہ' ان کا اخلاص' اور ان کا سچا اور حقیقی مؤمن ہونا بیان کیا گیا ہے......ظاہر ہے کہ یہ

(۱) الحشر [۸]

بہت بڑی بات ہے......!

جبکہ اس کے فوری بعد اگلی آیت میں خالقِ ارض وسماء کی طرف سے انصارِ مدینہ کی تعریف ان الفاظ میں بیان کی گئی ہے: ﴿وَالَّذِينَ تَبَوَّؤا الدَّارَ وَ الإِيمَانَ مِن قَبْلِهِم يُحِبُّونَ مَن هَاجَرَ اِلَيهِم وَلَايَجِدُونَ فِي صُدُورِهِم حَاجَةً مِّمَّا أُوتُوا وَيُؤثِرُونَ عَلَىٰ أَنفُسِهِم وَلَو كَانَ بِهِم خَصَاصَةٌ وَّمَن يُوقَ شُحَّ نَفسِهٖ فَأُولَـٰئِكَ هُمُ المُفلِحُونَ﴾ (۱) ترجمہ: (اور وہ لوگ جنہوں نے اس گھر (مدینہ) میں اور ایمان میں ان سے پہلے جگہ بنالی ہے، اور وہ اپنی طرف ہجرت کر کے آنے والوں سے محبت کرتے ہیں، اور مہاجرین کو جو کچھ دے دیا جائے اُس پر وہ اپنے دلوں میں کوئی تنگی نہیں رکھتے، بلکہ خود اپنے اوپر انہیں ترجیح دیتے ہیں، گو خود کتنے ہی سخت ضرورتمند ہوں، بات یہ ہے کہ جو کوئی بھی اپنے نفس کے بخل سے بچایا گیا وہی کامیاب و بامراد ہے)

اس آیت میں اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کی طرف سے انصارِ مدینہ کے بے مثال جذبۂ ایثار کی تعریف بیان کی گئی ہے کہ یہ حضرات خود تنگی ومحتاجی کے باوجود جو کچھ انہیں میسر آتا ہے سبھی کچھ اپنے مہاجر بھائیوں کیلئے قربان کر دیتے ہیں...... اس سلسلے میں اپنے دلوں میں ذرہ برابر تنگی وانقباض اور ناگواری محسوس نہیں کرتے...... انہوں نے تو ان مہاجرین کی مدینہ آمد سے قبل ہی ایمان بھی تیار کر رکھا تھا...... اور ان کیلئے ٹھکانہ بھی تیار کر رکھا تھا...... غرضیکہ انصارِ مدینہ نے اپنے مہاجر بھائیوں کو اپنے گھروں میں جگہ دی...... اپنے دلوں میں بسایا، سر آنکھوں پر بٹھایا...... اپنا سب کچھ ان کے حوالے کر دیا...... ان کیلئے اپنے گھروں کے دروازے بھی کھول دیئے...... اور...... اپنے دلوں کے دروازے بھی کھول دیئے...... اور

(۱) الحشر [۹]

ہمدردی وایثار کے ایسے نمونے پیش کیے کہ تاریخِ عالَم میں اس کی مثال نہیں مل سکے گی......!!

☆......انصار کے دلوں میں اپنے مہاجر بھائیوں کیلئے ایثار کا یہ بے مثال جذبہ اپنی جگہ...... لیکن حقیقت کی دنیا میں محض جذبات سے کام نہیں چلتا...... محض جذبات سے نہ کسی کا پیٹ بھر سکتا ہے...... اور نہ ہی گھروں کے چولھے جل سکتے ہیں...... اس چیز کیلئے تو حقیقت کو مدِ نظر رکھنا پڑتا ہے...... اور اُس وقت حقیقت یہی تھی کہ انصارِ مدینہ بہت زیادہ خوش حال نہیں تھے...... ان کے مالی حالات ایسے نہیں تھے کہ اُن پر مہاجرین کا اضافی بوجھ بھی ڈال دیا جائے...... یہی وہ حقیقت تھی جسے مدِ نظر رکھتے ہوئے اُس موقع پر رسول اللہ ﷺ نے انصار پر بہت زیادہ بوجھ نہیں ڈالا...... بلکہ بہت ہی ہلکی پھلکی سی ذمے داری ہر انصاری کو سونپی......یعنی ہر ایک انصاری کے ذمے اپنے صرف ایک مہاجر بھائی کی ذمے داری۔ اور یوں آپؐ نے مہاجرین وانصار کے درمیان تاریخی ''رشتۂ مؤاخاۃ'' قائم فرمایا، یعنی ایک ایک انصاری کو ایک ایک مہاجر کا بھائی بنا دیا...... یوں آپؐ نے مہاجرین وانصار کو ہمیشہ کیلئے اس بے مثال اُخوت کے رشتے میں پرو دیا۔

☆......اس تاریخی موقع پر جہاں انصار کا اپنے مہاجر بھائیوں کیلئے جذبۂ ہمدردی وایثار قابلِ ذکر ہے...... وہیں مہاجرین کا یہ اعلیٰ ترین اخلاق، ان کے دلوں میں یہ احساس، اور ان کا یہ جذبہ بھی آبِ زر سے لکھے جانے کے قابل ہے کہ انہوں نے انصار کی اس خوش اخلاقی اور شرافت سے کوئی ناجائز فائدہ اٹھانے کی کوشش نہیں کی کہ بس ہمیشہ کیلئے ''مفت خورے'' بن کر......اور انصار پر بارِ گراں بن کر......اسی طرح انہی کے گھروں میں بیٹھے رہتے...... ایسا کرنے کی بجائے حضرات مہاجرین نے ''مؤاخاۃ'' کے اس رشتے میں بندھنے کے بعد

اپنے انصاری بھائیوں کا دل وجان سے شکریہ ادا کیا...... اور پھر فوراً ہی رزق حلال کیلئے تلاش وجستجو اور جدوجہد میں مشغول ومنہمک ہوگئے......ان میں سے ہر کوئی جلد از جلد خود اپنے پاؤں پر کھڑے ہونے کی کوششوں میں لگ گیا......یوں شب وروز کی مسلسل محنت ومشقت اور تگ ودو کے نتیجے میں وہ سب اپنا بوجھ خود اٹھانے کے قابل ہوگئے......!!

☆...... یہاں یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ مدینہ میں اوس وخزرج ودیگر قبائل سالہا سال سے باہم برسرِ پیکار تھے، ان میں نسل درنسل خونریزیوں کا اور تباہ کاریوں کا ایک لامتناہی سلسلہ چلا آرہا تھا......ان کی باہم دشمنی ضرب المثل تھی......

لیکن اب کلمۂ ''لا الٰہ الا اللہ'' پر ایمان کی بدولت ......ان کی صورتِ حال یکسر بدل گئی...... پہلے جن کی دشمنی ضرب المثل تھی......اب ان کا ''ایثار'' ہمیشہ کیلئے ضرب المثل بن گیا...... پہلے ایک ہی شہر (مدینہ) کے باشندے ہونے کے باوجود وہ آپس میں ایک دوسرے کے خون کے پیاسے تھے......لیکن اب مسلمان ہوجانے کے بعد نہ صرف یہ کہ آپس میں بھائی بھائی بن گئے ...... بلکہ اس سے بڑھ کر یہ کہ بہت دور دراز......یعنی مکہ سے آئے ہوئے مہاجرین کے ساتھ بھی وہ اُخوت ومحبت کے ایسے بے مثال اور لازوال رشتے میں بندھ گئے کہ انسانی تاریخ میں شاید ایسی کوئی اور مثال نہیں مل سکے گی۔ یقیناً یہ ''اللہ پر سچے اور حقیقی ایمان'' ہی کا کرشمہ تھا، اور یہ چیز آج تمام امتِ مسلمہ کو ''دعوتِ غور وفکر'' دے رہی ہے۔

☆......میثاقِ مدینہ:

مدنی زندگی کے آغاز میں تیسرا جو فوری اور اہم ترین اقدام کیا گیا وہ ''میثاقِ مدینہ'' کے نام سے معروف معاہدہ تھا جو رسول اللہ ﷺ نے اُس وقت وہاں موجود دیگر اقوام، خصوصاً یہود کے ساتھ کیا، یہ معاہدہ دولتِ اسلامیہ کے قیام کی طرف پیش قدمی کے سلسلے میں اہم

ترین اقدام کی حیثیت رکھتا ہے۔

اس معاہدے میں تمام شرکائے معاہدہ کے حقوق وفرائض کا تعین کیا گیا اور اس سے متعلق تمام تفصیلات طے کی گئیں، گویا یہ معاہدہ بنیادی دستور کی حیثیت رکھتا تھا۔

نیز اس معاہدے میں یہ بھی طے کیا گیا کہ تمام شرکائے معاہدہ باہم مل جل کر رہیں گے، ایک دوسرے کا مکمل احترام کریں گے، ایک دوسرے کیلئے ہمیشہ نیک نیتی، خلوص اور خیر سگالی کا اظہار کریں گے، آپس میں ایک دوسرے کے خلاف کسی قسم کی کوئی سازش نہیں کریں گے، ایک دوسرے کو کوئی نقصان نہیں پہنچائیں گے۔

یہی وجہ تھی کہ اس معاہدے کو ''معاہدۂ صلح'' نیز ''معاہدۂ عدمِ جارحیت'' کے نام سے بھی تاریخ میں یاد کیا جاتا ہے۔

نیز یہ بھی طے کیا گیا کہ کسی بھی بیرونی دشمن کی طرف سے حملے کی صورت میں تمام شرکائے معاہدہ مشترکہ طور پر دفاع کریں گے۔

مدنی زندگی کے آغاز اور دولتِ اسلامیہ کے قیام کے بالکل ابتدائی دنوں میں ہی رسول اللہ ﷺ نے اس معاہدے کے ذریعے مدینہ میں موجود دیگر تمام اقوام کیلئے اپنی طرف سے نیک نیتی اور خیر سگالی کا اظہار فرمایا، نیز تمام دنیا کو روزِ اول سے ہی یہ پیغام دے دیا کہ دینِ اسلام مل جل کر رہنے کا سبق سکھاتا ہے، دینِ اسلام بقائے باہمی، تحمل، برداشت، اور رواداری کی تاکید وتلقین کرتا ہے......

رسول اللہ ﷺ نے اس معاہدے کے ذریعے روزِ اول سے ہی دیگر تمام اقوام کے ساتھ مل جل کر رہنے کے اس اصول کو اپناتے ہوئے نئے دور کا آغاز فرمایا......

لیکن دوسری طرف نیک نیتی، یا خیر سگالی کے جذبات کا کوئی نام ونشان تک نظر نہیں آتا تھا،

بلکہ وہاں تو مسلسل خفیہ سازشوں کا ایک لامتناہی سلسلہ تھا......جس نے مرورِوقت کے ساتھ رفتہ رفتہ بڑے فتنوں کی شکل اختیار کرلی۔

☆☆☆

الحمدللہ آج بتاریخ ۱۲/ جمادیٰ الأولیٰ ۱۴۳۴ھ، مطابق ۲۴/ مارچ ۲۰۱۳ء بروز اتوار یہ باب مکمل ہوا۔

رَبَّنَا تَقَبَّل مِنَّا اِنّكَ أنتَ السَّمِيعُ العَلِيمُ ، وَتُب عَلَينَا اِنَّكَ أنتَ التَوَّابُ الرَّحِيم

مشرکینِ مکہ کے خلاف غزوات

کا مختصر تذکرہ اور تنقیدی جائزہ:

رسول اللہ ﷺ نے تو ''بقائے باہمی'' کے سنہری اصول کو اپناتے ہوئے مدنی زندگی کے بالکل آغاز میں ہی ''میثاقِ مدینہ'' کے ذریعے وہاں آباد غیرمسلم اقوام کیلئے جذبۂ خیرسگالی کا اظہار فرمایا، لیکن افسوس کہ دوسری طرف مسلمانوں کیلئے کوئی خیرسگالی نہیں تھی، بلکہ وہاں تو شب وروز مسلمانوں کے خلاف نفرتوں اور سازشوں کے تانے بانے بنے جارہے تھے، اوراس سلسلے میں سب سے زیادہ افسوس ناک اور قبیح ترین کردار ''رئیس المنافقین عبداللہ بن اُبی'' کا تھا۔

انہی نامساعد حالات میں مزید پریشانی یہ کھڑی ہوگئی کہ رسول اللہ ﷺ کو باوثوق ذرائع سے یہ اطلاع ملی کہ اُدھر مکہ میں مشرکین بھی مسلسل مسلمانوں کے خلاف جلدازجلد کوئی فیصلہ کن اقدام کرنا چاہتے ہیں اوراس مقصد کیلئے زوروشور کے ساتھ منصوبہ بندی کی جارہی ہے، کیونکہ مشرکین کو یہ بات ہرگز گوارا نہیں تھی کہ مسلمان ان کے شکنجے سے نکلنے کے بعد اب مدینہ میں جاکر سکون واطمینان کی زندگی بسر کریں، وہاں پھلتے پھولتے رہیں اوران کی قوت میں اضافہ ہوتا چلا جائے، بالخصوص انہیں اُس تجارتی شاہراہ کی وجہ سے بہت زیادہ پریشانی لاحق تھی کہ جس پرسفر کرتے ہوئے ان کے تجارتی قافلے مکہ سے ملکِ شام آتے جاتے تھے، اوروہ شاہراہ مدینہ کے قریب سے گذرتی تھی۔

ایسی ہی صورتِ حال میں ایک روز مشرکینِ مکہ کے چند سرداروں کی طرف سے مدینہ میں ''رئیس المنافقین عبداللہ بن اُبی'' کو ایک خط موصول ہوا، جس میں مشرکینِ مکہ کی طرف سے

اسے خبردار کرتے ہوئے یہ تحریر کیا گیا تھا کہ ''ہم یہ بات ہرگز برداشت نہیں کر سکتے کہ محمد (ﷺ) اوران کے ساتھی ہمارے شہر مکہ سے نکلنے کے بعداب تمہارے شہر مدینہ میں چین وسکون کی زندگی بسر کریں اور پھلتے پھولتے رہیں......لہٰذا تم سے ہمارا یہ پرزور مطالبہ ہے کہ تم ان مسلمانوں کو جلد از جلد اپنے شہر سے نکال باہر کرو......اور اگر تم نے ہماری اس ہدایت پر عمل نہ کیا تو یاد رکھو......ہم بہت جلد تمہارے شہر پر تباہ کن حملہ کریں گے......اور تب صرف مسلمانوں کو ہی نہیں...... ان کے ساتھ ساتھ تم سب کو بھی ہم مدینہ سے نکال باہر کریں گے''۔

اس خط میں مشرکینِ مکہ کی طرف سے مدینہ میں موجود منافقین و یہود کو بظاہر اگرچہ ''دھمکی'' دی گئی تھی...... لیکن درحقیقت یہ ان کیلئے ''دھمکی'' نہیں ...... بلکہ بہت بڑی خوشخبری تھی......کیونکہ وہ رسول اللہ ﷺ و دیگر مسلمانوں کی مدینہ آمد سے انتہائی نالاں اور ناخوش تھے، اور چاہتے تھے کہ کسی طرح یہ لوگ مدینہ سے نکل جائیں...... اور پھر ہمارے وہی پرانے دن لوٹ آئیں......اور اس مقصد کیلئے ان کی دلی خواہش تھی کہ کاش انہیں کسی بڑی قوت کی پشت پناہی حاصل ہو سکے۔

لہٰذا اب مشرکینِ مکہ کی طرف سے جب انہیں یہ دھمکی موصول ہوئی تو انہوں نے اسے دھمکی کی بجائے اپنے لئے بہت بڑی خوشخبری سمجھا......اور اب مسلمانوں کے خلاف یہ اندرونی دشمن اور بیرونی دشمن دونوں متحد اور یکجا ہو گئے، اور پھر ان بدلے ہوئے حالات میں مسلسل ایسے ٹھوس ثبوت' پے در پے شواہد و دلائل اور آثار و قرائن نظر آتے رہے جن کی وجہ سے رسول اللہ ﷺ کو مکمل یقین ہو گیا کہ یہ اندرونی و بیرونی دشمن مل کر کسی بھی وقت مسلمانوں کیلئے کوئی بڑی مشکل پیدا کر سکتے ہیں، نیز یہ کہ اس گٹھ جوڑ کے نتیجے میں مشرکینِ مکہ کسی بھی

وقت مدینہ پر کوئی بڑا اور اچانک حملہ کر سکتے ہیں۔

ایسی صورتِ حال میں رسول اللہ ﷺ نے بھی اپنے ساتھیوں سے مشورے کے بعد کسی بھی مشکل کا سامنا کرنے کیلئے تیاریاں شروع کر دیں......اور آپ ﷺ و دیگر تمام مسلمان ذہنی طور پر اس بات پر آمادہ ہو گئے کہ اپنی حفاظت و سلامتی کیلئے جو کچھ بن پڑے گا وہ ضرور کریں گے......خواہ اس مقصد کیلئے ہتھیار اٹھانا پڑیں...... یا میدان میں نکل کر باقاعدہ جنگ لڑنی پڑے......!

غزوۂ بدر:

چنانچہ ایسے ہی حالات میں ہجرت کے بعد دوسرے ہی سال مشرکینِ مکہ کا ایک لشکر جو کہ ہر قسم کے سامانِ حرب و ضرب سے مسلح تھا' مسلمانوں پر حملے کی غرض سے مدینہ کی جانب روانہ ہوا، رمضان کے مبارک مہینے میں مدینہ شہر سے کچھ فاصلے پر واقع ''بدر'' نامی مقام پر مسلمانوں اور مشرکینِ مکہ کے درمیان یہ پہلی باقاعدہ جنگ تھی، عجب کیفیت تھی، ایک طرف ایک ہزار آزمودہ کار جنگجو......سامانِ جنگ کی بہتات...... جبکہ دوسری طرف محض مٹھی بھر...... تین سو تیرہ افراد......جنہیں سامانِ جنگ کی شدید قلت کا سامنا تھا......اس مختصر سی بے سرو سامان جماعت کو کسی صورت ''فوج'' نہیں کہا جا سکتا تھا......!

لیکن جب جنگ شروع ہوئی تو ''ساز و سامان'' اور ''کثرتِ تعداد'' کی بجائے مسلمانوں کا اپنے اللہ پر خالص ایمان' سچا توکل' اور جذبۂ سرفروشی کام آیا......چنانچہ انہوں نے انتہائی شجاعت و بہادری اور ثابت قدمی کے ساتھ دشمن کا مقابلہ کیا......جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مشرکینِ مکہ کے پاؤں اکھڑ گئے......ان کے متعدد بڑے بڑے سردار اور نامی گرامی قسم کے

شہسوار اس جنگ میں مارے گئے، اور وہ بہت زیادہ جانی ومالی نقصان اٹھانے کے بعد میدان چھوڑ کر بھاگ کھڑے ہوئے۔

یوں مسلمانوں کے حق میں اس جنگ کا بہت ہی اچھا نتیجہ برآمد ہوا، جبکہ مشرکینِ مکہ کی صفوں میں صفِ ماتم بچھ گئی...... اور وہ بدترین شکست وہزیمت اور ذلت ورسوائی کا داغ لئے ہوئے وہاں سے واپس مکہ کی جانب روانہ ہوئے۔

غزوۂ اُحد:

مٹھی بھر مسلمانوں کے ہاتھوں اس بدترین شکست اور ذلت ورسوائی کی وجہ سے مشرکینِ مکہ کے دلوں میں چونکہ انتقام کے شعلے خوب بھڑک رہے تھے...... اس لئے ان سے زیادہ عرصہ صبر نہو سکا...... اور اگلے ہی سال پہلے سے بہت زیادہ تیاری اور جوش وخروش کے ساتھ وہ مسلمانوں کو نیست ونابود کردینے کی غرض سے مدینہ کی جانب روانہ ہوئے...... ہجرت کے تیسرے سال شوال کے مہینے میں مدینہ شہر کے مضافات میں واقع ''اُحد'' نامی مشہور ومعروف پہاڑ کے دامن میں یہ دوسری جنگ لڑی گئی، اس موقع پر دشمن کی تعداد تین ہزار تھی جبکہ ان کے مقابلے میں مسلمان صرف سات سو تھے...... لیکن اس کے باوجود مسلمانوں نے اللہ پر توکل کرتے ہوئے بہادری کے ایسے جوہر دکھائے کہ دشمن کے چھکے چھوٹ گئے...... اور یوں گویا مسلمانوں کی فتح یقینی ہوگئی...... لیکن وہ ''تیرانداز'' جنہیں رسول اللہ ﷺ نے ایک پہاڑی راستے پر مقرر فرمایا تھا، انہوں نے جب دیکھا کہ دشمن شکست کھا کر بھاگ رہا ہے...... تو وہ اپنی جگہ سے اتر آئے...... اُدھر بھاگتے ہوئے دشمن نے جب یہ منظر دیکھا تو موقع غنیمت جانتے ہوئے پلٹ کر مسلمانوں پر عقب سے پوری قوت کے ساتھ حملہ کردیا

اور یوں صورتِ حال یکسر بدل کر رہ گئی......جس کے نتیجے میں مسلمانوں کو شدید پریشانی کا اور بڑے نقصان کا سامنا کرنا پڑا......

البتہ ''اُحد'' کے موقع پر مسلمانوں کی یہ ''بھول'' انہیں ہمیشہ کیلئے یہ ناقابلِ فراموش ''سبق'' سکھا گئی کہ انہیں ہر حال میں اللہ اور رسول ﷺ کے ہر حکم کی تعمیل کرنا چاہئے......ورنہ نتیجہ ایسا ہی برآمد ہوگا......!

غزوۂ خندق:

اسی طرح ہجرت کے پانچویں سال پیش آنے والے ''غزوۂ خندق'' (جسے ''اَحزاب'' بھی کہا جاتا ہے) کے موقع پر صورتِ حال یہ ہوئی کہ ''غزوۂ اُحد'' کے محض دو سال بعد مشرکینِ مکہ دوبارہ آئے، اور اس بار مسلمانوں کو ہمیشہ کیلئے جڑ سے اکھاڑ پھینکنے کا پختہ عزم لے کر آئے، اس موقع پر ان کی تعداد دس ہزار تھی، رسول اللہ ﷺ نے حفاظتی تدابیر کے سلسلے میں اپنے صحابۂ کرام سے مشورہ فرمایا، آخر حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ کے مشورے پر مدینہ شہر کے اطراف میں کافی وسیع وعریض اور گہری خندق کھودی گئی، اس مشکل ترین اور انتہائی پُرمشقت کام میں آپ ﷺ بنفسِ نفیس اپنے جاں نثار ساتھیوں کے شانہ بشانہ شریک رہے، بلکہ پیش پیش رہے۔

مشرکین کا لشکر جب وہاں پہنچا تو ''خندق'' کو دیکھ کر وہ حیرت زدہ رہ گئے، اور لاکھ کوشش کے باوجود وہ اسے پار نہ کر سکے، بس خندق کے اُس پار سے ہی تیروں کی بارش برساتے رہے، اور مدینہ شہر کا محاصرہ کر کے بیٹھ گئے۔ اس جان لیوا محاصرے نے جب طول پکڑا تو مدینہ شہر کے اندر اشیائے خورد ونوش کی شدید قلت ہونے لگی۔ مسلمانوں کو جب بھوک اور

پیاس ستاتی تو اس تکلیف کی شدت کو کم کرنے کیلئے پیٹ پر پتھر باندھ لیتے......تا کہ بھوک کی یہ شدت ان کے عزم واستقلال کی راہ میں رکاوٹ نہ بن سکے......اور یونہی شب وروز گذرتے رہے۔

آخرایک رات بہت تیز آندھی آئی ،طوفانی جھکڑ پوری طاقت سے چلنے لگے،سخت سردی کا موسم تھا،اوپر سے ایسی سیاہ اور بھیانک رات......اور پھر تیز رفتار آندھی اور گردوغبار کا ایسا خوفناک طوفان آیا......کہ......ان کے خیمے اُکھڑ گئے، برتن اُلٹ گئے،کھانے پینے کا تمام سامان ریت میں مل گیا، خالی برتن ہوا میں اُڑ اُڑ کران کے سروں سے ٹکرانے اورانہیں زخمی کرنے لگے......گھوڑے اوراونٹ بدحواس ہوکر......اوررسیاں تڑا کرسر پٹ اِدھراُدھر دوڑنے لگے......اورانہیں پاؤں تلے کچلنے لگے......بالآخراس بلائے ناگہانی سے گھبرا کروہ سب وہاں سے بھاگ کھڑے ہوئے......جب صبح کی روشنی پھیلی تو مسلمانوں نے اپنے سامنے صاف میدان دیکھا......دشمنوں کا دوردور تک کوئی نام ونشان نظر نہ آیا......یہی وہ کیفیت ہے جس کا قرآن کریم میں سورۃ الأحزاب میں تفصیلی تذکرہ موجود ہے۔

قیمتی ترین سبق:

رسول اللہ ﷺ کی حیاتِ طیبہ کے دوران جتنے غزوات پیش آئے ......ان سب میں ہمیں جومیدانی صورتِ حال ......اور پھر جونتیجہ نظرآتا ہے......اس میں ہمیشہ کیلئے یہ انتہائی قیمتی ترین سبق اور پیغام پوشیدہ ہے کہ کسی بھی جنگ میں فتح یا شکست کا دارومدار تعداد کی کثرت یا قلت پر نہیں ہے......نہ ہی اس چیز کا تعلق سامانِ جنگ کی کثرت یا قلت سے ہے...... اگر چہ ان چیزوں کی بھی اپنی جگہ یقیناً بڑی اہمیت ہے، کیونکہ اسباب ووسائل کو اختیار کرنا

ضروری ہے......لیکن ......فتح اور کامیابی کا اصل دارومدار اس بات پر ہے کہ ''نیت خالص ہو، اور جذبہ صادق ہو'' کیونکہ میدانِ کارزار میں ہتھیار تو ٹوٹ سکتے ہیں......لیکن جذبہ اگر سچا ہو تو وہ کبھی نہیں ٹوٹ سکتا......!!

اسلام بزورِ شمشیر نہیں پھیلا:

''غزوات'' کے تذکرے کے موقع پر یہ حقیقت بھی قابلِ ذکر ہے کہ بہت سے لوگ یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ ''اسلام بزورِ شمشیر پھیلا ہے......اور یہ کہ رسول اللہ ﷺ نے خوب تلوار چلا چلا کر......لوگوں کو ڈرا ڈرا کر......زبردستی مسلمان بنایا......''

بیمار ذہنیت رکھنے والے ان افراد کا یہ دعویٰ سراسر غلط اور باطل ہے، ان کی یہ بات مکمل طور پر بے بنیاد اور حقائق کے منافی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اسلام تلوار کی نوک سے نہیں پھیلایا......بلکہ اسلام تو آپؐ کے حسنِ اخلاق، بلند کردار، اور آپؐ کی مسلسل دعوت وتبلیغ کے نتیجے میں پھیلا ہے...... اسلام دینِ رحمت ہے، اسلام امن وامان کا دین ہے، اسلام سلامتی کا دین ہے، اسلام ہر انسان کی جان ومال اور عزت وآبرو کی حفاظت کا حکم دیتا ہے، انسانی خون کی جتنی قدر وقیمت اور حرمت وعظمت دینِ اسلام میں ہے اس کی مثال شاید کہیں اور نہیں مل سکے گی۔

قرآن کریم میں یہاں تک کہا گیا ہے کہ: ﴿......أَنَّهُ مَن قَتَلَ نَفساً بِغَيرِ نفسٍ أَو فَسَادٍ فِي الأَرضِ فَكَأَنَّمَا قَتَلَ النَّاسَ جَمِيعاً وَ مَن أَحيَاهَا فَكَأَنَّمَا أَحيَا النَّاسَ جَمِيعاً......﴾ (۱) ترجمہ: (......جو شخص کسی کو، بغیر اس کے کہ وہ قاتل ہو، زمین میں فساد برپا کرنے والا ہو، قتل کر ڈالے، تو گویا اس نے تمام لوگوں کو قتل کر دیا، اور جو

(۱) المائدہ[۳۲]

شخص کسی ایک کی جان بچالے اس نے گویا تمام لوگوں کو زندہ کر دیا......)

یعنی قرآن کریم میں اس ارشادِ ربانی کی رو سے ایک انسان کا ناحق خون کر دینے والا شخص تمام انسانیت کا قاتل ہے، جبکہ جس کسی نے محض کسی ایک انسان کی جان بچائی اس نے گویا تمام انسانیت کو بچالیا...... گویا وہ تمام انسانیت کا محسن ہے اور نجات دہندہ ہے......!

اسی طرح قرآن کریم میں اللہ کے جلیل القدر پیغمبر حضرت ابراہیم علیہ السلام کی جس مشہور و معروف اور انتہائی جامع و مفصل دعاء کا تذکرہ ہے، اس میں یہی کیفیت نظر آتی ہے کہ انہوں نے اس دعاء میں سب سے پہلے اللہ سے امن وامان کی نعمت کا سوال کیا، جیسا کہ ارشادِ ربانی ہے: ﴿وَ اِذ قَالَ اِبرَاهِيمُ رَبِّ اجعَل هٰذَا البَلَدَ آمِناً﴾ (۱)

ترجمہ: (اور جب ابراہیم نے کہا کہ: اے میرے رب! تو بنا دے اس شہر کو امن کی جگہ)

اور پھر اس کے بعد آگے چل کر اسی دعاء میں اللہ سے اپنے لئے نیز اپنی ذریت اور اہل وعیال کیلئے عقیدہ و ایمان کی سلامتی کا سوال کیا، اس کے بعد نماز کی توفیق کا سوال کیا...... اور پھر رزق کی فراوانی اور خوشحالی مانگی۔

لہٰذا اس دعاء میں جو ترتیب وارد ہوئی ہے، اس سے یہی بات واضح وثابت ہوتی ہے کہ امن وامان اور سلامتی وعافیت اس قدر اہم چیز ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے سب سے پہلے اللہ سے اسی چیز کا سوال کیا...... اور اس کے بعد باقی چیزیں مانگیں...... یقیناً جب امن وامان کی نعمت نصیب ہوگی، انسان کی جان ومال محفوظ ہوگی، تبھی تو انسان اللہ کی عبادت کا فریضہ انجام دینے کے قابل ہو سکے گا، جان ومال محفوظ ہوگی تبھی تو انسان مسجد جا سکے گا، اور تبھی حجِ بیت اللہ کیلئے سفر ممکن ہوگا، اور تبھی تو انسان اپنے لئے اور اپنے اہل وعیال کیلئے

(۱) ابراہیم [۳۵]

رزقِ حلال کی تلاش میں گھر سے نکل سکے گا، محنت مشقت کر سکے گا...... یہ ہے دینِ اسلام کی تعلیم، اور یہی چیز رسول اللہ ﷺ کی سیرت مبارکہ میں بھی واضح نظر آتی ہے۔

ہاں البتہ جب مخالفین اور دشمنوں کی طرف سے ظلم وستم کے پہاڑ توڑے گئے، معاملہ حد سے تجاوز کر گیا، زبردستی جنگ مسلط کر دی گئی......تب رسول اللہ ﷺ نے بھی اپنی حفاظت اور دفاع کی خاطر جو راستہ مناسب سمجھا وہ اختیار کیا۔

☆اس سلسلے میں بہت بڑا ثبوت یہی ہے کہ دشمنوں کے خلاف مسلح جدوجہد کی سب سے پہلے جس آیت میں اجازت دی گئی اس کا انداز ہی کچھ اس طرح ہے، چنانچہ ارشادِ ربانی ہے:﴿أُذِنَ لِلَّذِينَ يُقَاتَلُونَ بِأَنَّهُم ظُلِمُوا وَ اِنَّ اللّٰهَ عَلَىٰ نَصرِهِم لَقَدِيرٌ الَّذِينَ اُخرِجُوا مِن دِيَارِهِم بِغَيرِ حَقٍّ اِلَّا أَن يَّقُولُوا رَبُّنَا اللّٰهُ ......﴾ (۱)

ترجمہ: (جن کے خلاف جنگ لڑی جارہی ہے انہیں مقابلے کی اجازت دی جاتی ہے' کیونکہ ان پر ظلم کیا گیا ہے، بے شک اللہ ان کی مدد پر قادر ہے، یہ وہ ہیں جنہیں ناحق ان کے گھروں سے نکال دیا گیا، محض اس وجہ سے کہ انہوں نے یوں کہا کہ "ہمارا رب صرف اللہ ہے"۔

اس آیت کے مفہوم سے اور اس کے انداز سے یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ مخالفین کی طرف سے مظلوم مسلمانوں کے ساتھ ہر قسم کی ظلم وزیادتی' جبر اور سفا کی کا سلسلہ پہلے سے بلکہ دینِ اسلام کے ظہور کے بعد روزِ اول سے ہی چلا آرہا تھا......اور اسی کیفیت میں طویل عرصہ گذر گیا...... بلکہ پورا مکی دور گذر گیا......اور اب ہجرت کے بعد مسلمانوں کی مدینہ منتقلی کے باوجود یہ مخالفین اپنی حرکتوں سے اور ظلم وزیادتی کے اس سلسلے سے باز نہ آئے......تب

(۱) الحج [۳۹-۴۰]

جا کر اس آیت میں مخالفین اور دشمنوں کے خلاف مظلوم مسلمانوں کو اپنی حفاظت اور اپنے دفاع کی خاطر مسلح جدوجہد کی اجازت دی گئی۔

☆اس کے علاوہ یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ مشرکینِ مکہ کے خلاف جن غزوات کی نوبت آئی ان میں سے مشہور و معروف اور اہم ترین غزوات ''بدر'' ''اُحد'' اور ''خندق'' (جسے احزاب بھی کہا جاتا ہے) ہیں۔ ان جنگوں کے ناموں سے ہی یہ حقیقت عیاں ہو جاتی ہے کہ مشرکینِ مکہ اپنی پرانی فطرت اور اسلام دشمنی کے ہاتھوں مجبور ہو کر مسلمانوں کو نیست و نابود کر دینے اور انہیں صفحۂ ہستی سے ہمیشہ کیلئے مٹا دینے کے جنون میں خود مکہ سے سفر کر کے مدینہ پہنچے...... کیونکہ یہ تمام مقامات مکہ میں نہیں ہیں، بلکہ مدینہ میں یا اُس کے مضافات میں واقع ہیں...... ''بدر'' مدینہ شہر سے کچھ فاصلے پر ہے، ''اُحد'' نامی پہاڑ تو مدینہ شہر سے بالکل متصل ہی ہے، جبکہ ''خندق'' کے آثار تو آج تک عین مدینہ شہر کے اندر ہی موجود ہیں۔

لہٰذا ان تمام غزوات کے نام ہی یہ ظاہر کر رہے ہیں کہ مشرکینِ مکہ اپنے شہر سے سفر کرتے ہوئے مدینہ پہنچے تھے، اور یوں یہ جنگیں مسلمانوں پر مسلط کی گئی تھیں...... نہ یہ کہ مسلمان خود لڑنے کیلئے مدینہ سے مکہ جا پہنچے...... اور وہاں جا کر مشرکینِ مکہ کو للکارا...... اور ان بے چاروں کو لڑنے پر مجبور کر ڈالا......!

کچھ جنگیں مشرکینِ مکہ کے سوا دیگر مشرکینِ عرب کے خلاف لڑی گئیں، اس کی وجہ بھی یہی تھی کہ وہ مشرک قبائل کسی نہ کسی شکل میں مسلمانوں کے خلاف جارحیت' اشتعال اور فتنہ و فساد پھیلانے میں مشغول تھے، لہٰذا ان کی اس شرارت کے جواب میں ان کی سرکوبی ضروری سمجھی گئی۔

☆ مشرکینِ مکہ کے سوا دیگر مشرکین کے خلاف لڑی جانے والی جنگوں میں ''غزوۂ حنین'' سب سے اہم اور مشہور جنگ تھی، اس کا پس منظر بھی یہی تھا کہ فتحِ مکہ کے فوری بعد طائف اور اس کے مضافات میں آباد بہت ہی مشہور اور طاقتور قسم کے قبائل ''ہوازن'' اور ''ثقیف'' وغیرہ...... مسلمانوں کو جڑ سے اکھاڑ پھینکنے کی حسرت دل میں لئے ہوئے بہت بڑے لشکرِ جرار کے ساتھ طائف سے مکہ کی طرف پیش قدمی کر رہے تھے۔ رسول اللہ ﷺ کو مکہ میں جب یہ خبر ملی تو آپؐ نے ہاتھ پر ہاتھ رکھے بیٹھے رہنے کی بجائے اپنا دفاع ضروری سمجھا، اور اس مقصد کیلئے مکہ سے ان کی جانب روانگی کا فیصلہ فرمایا...... اور تب مکہ اور طائف کے درمیان ''حنین'' نامی مقام پر یہ بہت ہی خطرناک اور تاریخی جنگ لڑی گئی، لہٰذا اس موقع پر بھی جارحیت کی ابتداء مشرکین کی طرف سے ہوئی تھی' نہ کہ مسلمانوں کی طرف سے۔

☆ چند غزوات مدینہ شہر میں' نیز خیبر نامی شہر میں آباد یہودیوں کے خلاف لڑے گئے، اس کی وجہ بھی یہی تھی کہ انہوں نے مسلمانوں کے ساتھ بظاہر صلح اور عدمِ جارحیت کے معاہدات کر رکھے تھے، مگر درپردہ وہ ہمیشہ مسلمانوں کے خلاف سازشوں کے جال پھیلانے میں ہی مصروف رہے، بار بار مکہ جا کر مشرکینِ مکہ کو مسلمانوں کے خلاف ورغلاتے اور اُکساتے رہے...... انہیں مسلمانوں پر لشکر کشی کی ترغیب دیتے رہے اور اس مقصد کیلئے انہیں اپنی مکمل حمایت اور ہر قسم کے خفیہ تعاون کا یقین دلاتے رہے۔

لیکن ان کی ان شرانگیزیوں کے باوجود ہم دیکھتے ہیں کہ مسلمانوں کی طرف سے کبھی باقاعدہ ان کے خلاف کوئی لشکر کشی نہیں کی گئی...... البتہ انہیں بار بار تنبیہ کی گئی...... لیکن جب سب کچھ لاحاصل رہا تو آخر ان سے شہر مدینہ سے کوچ کر جانے کا مطالبہ کیا گیا، اور اس موقع پر بھی کسی اکادکا معمولی جھڑپ کے سوا باقاعدہ کسی جنگ یا عام یلغار کی نوبت نہیں آئی، اور

پھر مزید یہ کہ مسلمانوں کی طرف سے مدینہ سے انخلاء کے اس مطالبے پر یہ تمام یہودی نہایت آرام واطمینان کے ساتھ وہاں سے خیبر کی جانب روانہ ہوئے، اپنا تمامتر ساز وسامان……حتیٰ کہ اپنے گھروں کے دروازے اور کھڑکیاں تک اکھاڑ کر اونٹوں پر لاد کر اپنے ہمراہ لے گئے……کسی نے انہیں روکا نہیں……کسی نے انہیں ٹوکا نہیں……(۱)

☆ غزوۂ تبوک' نیز غزوۂ مؤتہ سلطنتِ روم کے خلاف لڑے گئے، جسے اُس دور میں تمام روئے زمین کی عظیم ترین قوت تصور کیا جاتا تھا، اوران غزوات کی وجہ بھی یہی تھی کہ سرحدی علاقوں پر رومی افواج کا بکثرت اجتماع' نیز مسلمانوں کے خلاف اشتعال انگیزیوں کے سلسلے' اور بالخصوص رسول اللہ ﷺ کے قاصد حارث بن عمیر الأزدی رضی اللہ عنہ کو بغیر کسی قصور کے حاکمِ مؤتہ کے حکم پر رسیوں سے جکڑ کر انتہائی بیدردی کے ساتھ قتل کر دینا…… جو کہ سفارتی آداب کی کھلی خلاف ورزی' نیز اخلاقی اقدار کی بہت بڑی پامالی تھی……اور جو کہ یقیناً انتہائی سنگین جرم تھا…… یہ وہ تمام اسباب تھے جن کی وجہ سے رومیوں کے خلاف ان غزوات کی نوبت آئی۔

☆ غرضیکہ یہ تمام غزوات خواہ مشرکینِ مکہ کے خلاف ہوں' یا دیگر مشرک قبائل کے خلاف' یا یہودِ مدینہ اور پھر یہودِ خیبر کے خلاف' یا سلطنتِ روم کے خلاف……ان میں سے ہر غزوہ خود دشمنوں کی طرف سے شرانگیزی وزیادتی کے نتیجے میں پیش آیا، جس کی وجہ سے مسلمانوں نے اپنی حفاظت کی خاطر مناسب جوابی کارروائیاں کیں۔

اور پھر ایسی صورتِ حال میں بھی مسلمانوں کے ہر لشکر کی روانگی کے موقع پر ''رحمۃ للعالمین'' رسول اکرم ﷺ نے ہمیشہ مسلمانوں کو یہ تلقین فرمائی کہ: ''اللہ سے ڈرتے رہنا، کسی بے گناہ

(۱) مدینہ سے یہود کے انخلاء کے بارے میں مزید تفصیل کیلئے سورۃ الحشر کی تفسیر کا مطالعہ کیا جائے۔

کا خون نہ بہانا، کمزوروں، عورتوں، اور بچوں کو کوئی تکلیف نہ پہنچانا، کوئی لوٹ مار نہ مچانا، سایہ دار درخت نہ کاٹنا، کسی عبادت گاہ کو نقصان نہ پہنچانا''۔

اسی بارے میں قرآن کریم میں اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی طرف سے شدید الفاظ میں تاکید کی گئی:

﴿وَقَاتِلُوا فِي سَبِيلِ اللّٰهِ الَّذِينَ يُقَاتِلُونَكُم وَلَاتَعتَدُوا اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ المُعتَدِينَ﴾ (۱) یعنی: ''تم لڑو اللہ کی راہ میں ان لوگوں سے جو تم سے لڑتے ہیں اور زیادتی نہ کرو، بیشک اللہ زیادتی کرنے والوں کو پسند نہیں فرماتا''۔

غرضیکہ کوئی بھی انصاف پسند انسان اس ناقابلِ انکار حقیقت کو قبول کیے بغیر نہیں رہ سکتا کہ رسول اللہ ﷺ نے دینِ اسلام تلوار کے زور سے نہیں پھیلایا...... بلکہ سچی بات یہ ہے کہ دشمنوں نے ہمیشہ ہر دور میں تلوار کے زور سے دینِ اسلام کا راستہ روکنے کی سرتوڑ کوشش کی......مگر......دینِ اسلام تلوار کے مقابلے میں ہمیشہ پھلتا پھولتا ہی رہا......!!

(۱) البقرۃ [۱۹۰]

الحمد للہ آج بتاریخ ۸/رجب ۱۴۳۴ھ، مطابق ۱۸/مئی ۲۰۱۳ء بروز ہفتہ یہ باب مکمل ہوا۔

رَبَّنَا تَقَبَّل مِنَّا اِنّكَ أنتَ السَّمِيعُ العَلِيمُ ، وَتُب عَلَينَا اِنَّكَ أنتَ التَوَّابُ الرَّحِيم

صلحِ حدیبیہ:

مدنی زندگی کے دوسرے دور کا آغاز:

نبوت کے تیرہویں سال جب ہجرت کا حکم نازل ہوا تھا' تو اس حکم کی تعمیل میں رسول اللہ ﷺ نیز دیگر تمام مسلمان اپنے آبائی شہر مکہ کو چھوڑ کر ایک نئی منزل یعنی مدینہ کی جانب ہجرت کر گئے تھے، مدنی زندگی مکی زندگی سے بہت مختلف اور بہت بہتر تھی ، کیونکہ یہاں مدینہ میں مشرکینِ مکہ نہیں تھے، نہ ہی ان کی طرف سے وہ تلخیوں اور ایذاءرسانیوں کے سلسلے تھے......نہ ہی وہ خوف اور دہشت کی فضاء تھی...... بلکہ یہاں تو انصارِ مدینہ کی طرف سے ملنے والی محبتیں اور عنایتیں تھیں' جنہوں نے مکہ سے آئے ہوئے اپنے ان بے سروسامان بھائیوں پر اپنا سبھی کچھ نچھاور کر دیا تھا...... انہیں سر آنکھوں پر بٹھایا تھا...... ان کیلئے اپنے گھروں کے بھی اور اپنے دلوں کے بھی دروازے کھول دیئے تھے......!

لیکن اس سب کچھ کے باوجود اپنے آبائی وطن کی محبت اور اس کیلئے دل میں کشش اور تڑپ انسان کی فطرت کا حصہ ہے...... جس گھر میں انسان نے آنکھ کھولی ہو...... ہوش سنبھالا ہو...... جس گھر کے آنگن میں ''ماں کے آنچل کی خوشبو' رچی بسی ہو...... اس گھر کو انسان مرتے دم تک کبھی فراموش نہیں کر سکتا......لہذا مدینہ میں ہر طرح کے آرام واطمینان کے باوجود مکہ سے آئے ہوئے مسلمانوں کو اپنے آبائی شہر کی یاد ستاتی تھی۔

اور پھر اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ وہاں مکہ میں ''بیت اللہ'' تھا، جس کی زیارت اور دیدار کیلئے رسول اللہ ﷺ و دیگر اہلِ ایمان بیتاب و بیقرار رہتے تھے۔

مسلمانوں کے دلوں میں بیت اللہ کیلئے اوراپنے آبائی شہرمکہ کیلئے یہ فطری تڑپ تویقیناً موجودتھی،البتہ مجموعی طورپروہ اب یہاں مدینہ میں پرسکون اورخوشگوارزندگی بسرکررہے تھے۔

لیکن ان کی یہی خوشگوارزندگی مشرکینِ مکہ سے برداشت نہیں ہوئی اوروہ مسلمانوں کونیست ونابودکردینے کی غرض سے وقتاً فوقتاً لشکرکشی کرتے رہے ......جس کے نتیجے میں غزوۂ بدراورپھرغزوۂ اُحدکی نوبت آئی......اوریوں مسلح جدوجہدکاایک سلسلہ چل نکلاتھا۔

البتہ اب غزوۂ خندق کے موقع پرمشرکینِ مکہ کی اتنے بڑے پیمانے پرپسپائی کے نتیجے میں جب رسول اللہ ﷺ کوان کی طرف سے ایک حدتک بےفکری نصیب ہوئی تو آپؐ کے قلبِ مبارک میں عمرہ کی ادائیگی اوربیت اللہ کی زیارت کی خواہش پیداہوئی،انہی دنوں آپؐ نے ایک خواب بھی دیکھا' جس میں کچھ ایسامنظرتھاکہ آپؐ اپنے صحابۂ کرام کے ہمراہ بیت اللہ کے طواف میں مشغول ہیں،ظاہرہے کہ یہ خواب اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی طرف سے اپنے حبیب ﷺ ودیگراہلِ ایمان کیلئے بہت بڑی بشارت تھی اورغیبی اشارہ تھا۔(۱)

چنانچہ ۶ ہجری میں رسول اللہ ﷺ اپنے چودہ سوجاں نثاروں کے ہمراہ عمرے کی ادائیگی کی غرض سے مدینہ منورہ سے مکہ مکرمہ کی جانب روانہ ہوئے،اس موقع پران سبھی حضرات

---

(۱)قرآن کریم میں ارشادہے:﴿لَقَدْ صَدَقَ اللّٰهُ رَسُولَهُ الرُّؤْيَا بِالحَقِّ لَتَدخُلُنَّ المَسْجِدَ الحَرَامَ اِن شَآءَ اللّٰهُ آمِنِينَ......﴾ یعنی''یقیناًاللہ نے اپنے رسول کوسچاخواب دکھایاکہ ان شاءاللہ تم یقیناًپورے امن وامان کے ساتھ مسجدِ حرام میں داخل ہوگے......(سورۃ الفتح/۲۷)

رسول اللہ ﷺ نیزمسلمانوں نے اس خواب کوبشارتِ عظیمہ سمجھا،کیونکہ نبی کاخواب بمنزلۂ وحی ہی ہوتاہے، اگرچہ اس خواب میں یہ تعیین نہیں کی گئی تھی کہ امن وامان کے ساتھ یہ عمرہ اسی سال ہوگایاآئندہ سال......لیکن مسلمانوں نے اس خوشخبری کوسننے کے بعدفوری تیاری شروع کردی اورپھرروانہ بھی ہوگئے۔

نے احرام باندھ رکھے تھے، کیونکہ عمرے کی ادائیگی مقصود تھی، مزید یہ کہ مشرکینِ مکہ پر بھی یہ بات تاکہ خوب واضح ہوجائے کہ مسلمان محض عمرے کی نیت سے مکہ آرہے ہیں......اور یہ کہ جنگ لڑنے کا ان کا قطعاً کوئی ارادہ نہیں ہے۔

لیکن طویل سفر کے بعد جب یہ حضرات مکہ کے قریب ''حدیبیہ'' نامی مقام پر پہنچے تو انہیں یہ افسوسناک اطلاع ملی کہ مشرکینِ مکہ جنگ لڑے بغیر کسی صورت مکہ میں داخلے کی اجازت نہیں دیں گے۔(۱)

یہ خبر رسول اللہ ﷺ ودیگر مسلمانوں کیلئے بڑی تشویش اور پریشانی کا باعث بنی ، کیونکہ یہ حضرات تو محض بیت اللہ کی زیارت اور عمرے کی نیت سے آئے تھے، جنگ وجدال ان کا مقصود نہیں تھا، اور یہی وجہ تھی کہ وہ سب اس موقع پر غیر مسلح تھے اور حالتِ احرام میں تھے، اس موقع پر رسول اللہ ﷺ اور مشرکینِ مکہ کے مابین اس سلسلے میں پیغامات کا تبادلہ بھی ہوتا رہا، لیکن کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہوا، تب مشرکینِ مکہ نے گفت وشنید کی غرض سے اپنا ایک باقاعدہ وفد مسلمانوں کے پاس بھیجا، لیکن گفت وشنید کے محض آغاز پر ہی یہ صورتِ حال پیش آئی کہ اس وفد کے سربراہ کے بارے میں حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے محسوس کیا کہ رسول اللہ ﷺ کے ساتھ اس کا اندازِ تخاطب مناسب نہیں ہے، اس پر انہوں نے اسے ٹوکا اور تنبیہ کرتے کہا کہ رسول اللہ ﷺ کے ساتھ ادب اور تمیز سے گفتگو کرو، اس تنبیہ پر وہ سردار بگڑ گیا......اور دونوں میں جھڑپ ہوگئی......اور یوں یہ مذاکرات بھی ناکام ہوگئے اور وہ وفد واپس مکہ لوٹ گیا(۲)

(۱)''حدیبیہ'' نامی یہ مشہور ومعروف تاریخی مقام مکہ مکرمہ سے نکلنے کے بعد جدہ کے راستے میں واقع ہے، آجکل یہ جگہ ''شُمیسی'' کے نام سے معروف ہے۔

(۲) قریشِ مکہ نے اس موقع پر اپنے سرداروں میں سے کسی کو رسول اللہ ﷺ کی طرف بھیجنے کی بجائے طائف

اس کے بعد رسول اللہ ﷺ نے فیصلہ فرمایا کہ مشرکینِ مکہ کے ساتھ مزید گفت وشنید کی غرض سے اپنے صحابہ میں سے کسی کو مکہ روانہ کیا جائے ، اور غور وفکر کے بعد اس مقصد کیلئے حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ کا انتخاب کیا گیا ، چنانچہ رسول اللہ ﷺ کے حکم کی تعمیل کرتے ہوئے حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ مکہ پہنچے ، لیکن مشرکینِ مکہ نے ان کی کوئی بات سننے کی بجائے انہیں نظر بند کر دیا ، مزید یہ کہ مسلمانوں کو نفسیاتی صدمہ پہنچانے کی غرض سے یہ افواہ پھیلا دی کہ ہم نے عثمان کو قتل کر دیا ہے۔

ظاہر ہے کہ یہ خبر رسول اللہ ﷺ کیلئے نیز آپؐ کے تمام جاں نثار ساتھیوں کیلئے انتہائی تشویش ناک اور بڑے صدمے کا باعث تھی ، لہٰذا آپؐ نے یہ افسوسناک خبر سننے کے بعد اپنے ساتھیوں کو مخاطب کرتے ہوئے ارشاد فرمایا ''عثمان کے خون کا بدلہ لینا فرض ہے'' یہ ارشاد فرمانے کے بعد آپؐ وہاں ایک ببول کے درخت کے نیچے بیٹھ گئے اور وہاں موجود

(باقی از حاشیہ صفحۂ گذشتہ)

سے آئے ہوئے اس سردار کو بھیجا جس کا نام عروہ بن مسعود الثقفی تھا ، واضح ہو کہ اگرچہ اس موقع پر اس جھڑپ کی وجہ سے عروہ واپس چلے گئے تھے ، لیکن رسول اللہ ﷺ کے ساتھ یہ مختصر سی ملاقات ان کے دل میں ہمیشہ کیلئے نقش ہو کر رہ گئی تھی اور وہ بہت زیادہ متأثر ہوئے تھے ، آخر دو سال بعد (سن آٹھ ہجری میں) غزوۂ طائف کے موقع پر یہ مسلمان ہو گئے تھے اور جب قبولِ اسلام کے بعد انہوں نے اپنی قوم کو دینِ اسلام کی طرف دعوت وتبلیغ کا سلسلہ شروع کیا تو ان کی قوم کو یہ بات پسند نہ آئی ، اور ایک روز جب یہ کسی ٹیلے پر چڑھے ہوئے نماز کیلئے اذان دے رہے تھے تو ان کی قوم سے رہا نہ گیا اور انہوں نے چاروں طرف سے ان پر تیروں کی بوچھاڑ کر دی (حالانکہ یہ ان کے سردار تھے) جس کے نتیجے میں یہ شہید ہو گئے ...... یہاں یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ بعد میں ان کی ایک صاحبزادی ''ام سعید'' کا حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کے ساتھ نکاح ہوا تھا ، جن سے ان کی دو بیٹیاں تھیں ''ام حسن'' اور ''رملہ''۔

(ملاحظہ ہو: البدایہ والنہایہ۔ فصل فی ذکر زوجاتہ وبنیہ وبناتہ...../ ج:۱۱۔ص:۲۴۔ طبعۃ: دار ہجر)

اپنے تمام صحابۂ کرام سے ''جاں نثاری'' کی بیعت لی۔(۱)

اب مسلمان ذہنی طور پر ''جنگ'' کیلئے مکمل آمادہ ہو چکے تھے، اور ''جاں نثاری'' کی بیعت بھی کر چکے تھے، اور اب ان کے جذبات عروج پر تھے۔

مشرکینِ مکہ نے اب مسلمانوں کے یہ بدلے ہوئے تیور دیکھے اور یہ ناقابلِ تسخیر جذبہ اور زبردست قسم کا جوش وخروش دیکھا...... تو وہ مرعوب اور خوفزدہ ہوگئے، اور نہ صرف یہ کہ اب انہوں نے حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ کو رہا کر دیا بلکہ مزید یہ کہ اب رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں ''صلح'' کا پیغام بھی بھجوایا...... آپؐ نے ہمیشہ کی طرح اب بھی ''صلح پسندی'' کا ثبوت دیتے ہوئے اس پیغام کو قبول فرمایا۔

گفت وشنید کا آغاز ہوا، مشرکینِ مکہ نے اس موقع پر تمام شرائط اپنی پسند کی پیش کیں، جن میں ان کا خالص مفاد تھا...... جبکہ مسلمانوں کیلئے انہیں قبول کرنے میں سراسر نقصان تھا...... لہٰذا یہ شرائط تمام مسلمانوں کیلئے ناقابلِ قبول تھیں۔

خصوصاً یہ کہ سب سے پہلی شرط انہوں نے یہ پیش کی کہ اس سال مسلمان عمرہ کئے بغیر واپس چلے جائیں اور آئندہ سال آکر عمرہ کریں، نیز یہ کہ بالکل خالی ہاتھ اور غیر مسلح ہو کر آئیں۔

(۱) اس بیعت کے بارے میں قرآن کریم میں ارشاد ہے: ﴿لَقَد رَضِيَ اللّٰهُ عَنِ المُؤمِنِينَ اِذ يُبَايِعُونَكَ تَحتَ الشَّجَرَةِ ......﴾ یعنی ''یقیناً اللہ راضی ہو گیا مؤمنوں سے جبکہ وہ درخت کے نیچے آپ سے بیعت کر رہے تھے......'' (سورۃ الفتح:۱۸)

یعنی اس آیت، نیز اس کے بعد چند آیات میں اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی طرف سے ان خوش نصیب افراد کیلئے پکے او سچے مؤمن ہونے کی گواہی دی گئی ہے جو اس بیعت میں شریک ہوئے، نیز انہیں اللہ کی طرف سے متعدد خوشخبریوں سے نوازا گیا، جن میں اہم ترین خوشخبری یہ تھی کہ انہیں ہمیشہ کیلئے اللہ کی طرف سے ''رضامندی وخوشنودی'' سے شادکام کیا گیا...... یہی وجہ ہے کہ اس یادگار اور مبارک ترین بیعت کو ''بیعتِ رضوان'' کے نام سے یاد کیا جاتا ہے، اور اس موقع پر جتنے مسلمان موجود تھے ان کی بڑی فضیلت ومنقبت ہے۔

مسلمان گذشتہ چھ سال سے بیت اللہ کی زیارت کیلئے بے چین تھے، اور اب اس قدر طویل سفر کی صعوبتیں اور مشقتیں برداشت کرنے کے بعد یہاں پہنچے تھے، مزید یہ کہ حالتِ احرام میں بھی تھے...... ایسے میں مکہ کی حدود میں پہنچ کر اب یہاں سے عمرہ کئے بغیر واپس لوٹ جانا کس قدر تکلیف دہ تھا۔

لیکن اس کے باوجود رسول اللہ ﷺ نے ان تمام شرائط کو منظور فرمایا اور اس معاہدۂ صلح کو قبول فرمایا، اس سے یقیناً آپؐ کی صلح پسندی ظاہر ہوتی ہے، نیز یہ کہ جہاں تک ممکن ہو سکے خونریزی، جنگ وجدال اور فتنہ وفساد سے اجتناب کا جذبہ نمایاں ہوتا ہے، اور حقیقت یہ ہے کہ اس صلح میں اللہ کی طرف سے مسلمانوں کیلئے بڑی مصلحتیں پوشیدہ تھیں۔

☆☆☆

الحمدللہ آج بتاریخ ۸/ رمضان المبارک ۱۴۳۴ھ، مطابق ۱۶/ جولائی ۲۰۱۳ء بروز منگل یہ باب مکمل ہوا۔

رَبَّنَا تَقَبَّل مِنَّا اِنّكَ أنتَ السَّمِيعُ العَلِيمُ ، وَتُب عَلَينَا اِنَّكَ أنتَ التَوَّابُ الرَّحِيم

فرماں رواؤں کودعوتِ اسلام:

۶ھ ہجری میں مشرکینِ مکہ کے ساتھ کئے گئے معاہدۂ صلح یعنی ''صلحِ حدیبیہ'' کے نتیجے میں رسول اللہ ﷺ کو جب مشرکینِ مکہ کی طرف سے قدرے بےفکری نصیب ہوئی تو آپؐ نے اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے دینِ اسلام کی نشرواشاعت کے کام کومزید وسعت دینے کی غرض سے ہجرت کے ساتویں سال مختلف فرماں رواؤں اورحکمرانوں کوخطوط ارسال فرمائے جن میں انہیں دینِ برحق قبول کرنے کی دعوت دی گئی تھی، کیونکہ دینِ اسلام کسی خاص قوم کیلئے نہیں ہے، بلکہ یہ تو عالمگیر دین ہے، آخری اورمکمل دین ہے، تمام بنی نوعِ انسان کی صلاح وفلاح اورنجات اسی دین سے وابستہ ہے، اللہ نے اپنے نبی ﷺ کو ''تمام دنیائے انسانیت'' کیلئے ''رحمت'' بنا کر بھیجا تھا، نہ کہ کسی مخصوص قوم کیلئے، لہٰذا آپؐ کی نبوت وبعثت زمان ومکان کی حدودوقیود سے بالاترتھی۔

جیسا کہ ارشادِ ربانی ہے:﴿وَ مَـا أرْسَلْـنَـاكَ اِلّا رَحمَةً لِّلعَـالَمِينَ﴾ (۱)
ترجمہ:(اورہم نے آپ کوتمام جہان والوں کیلئے رحمت بنا کرہی بھیجا ہے)

نیزارشادہے:﴿قُل يَاأيُّهَا النَّاسُ اِنّي رَسُولُ اللّهِ اِلَيكُم جَمِيْعاً الّذي لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوَاتِ وَ الأرضِ لَااِلٰهَ اِلَّاهُوَ يُحْيِي وَيُمِيْتُ﴾ (۲) ترجمہ:(آپ کہہ دیجئے کہ اے لوگو! میں تم سب کی طرف اس اللہ تعالیٰ کا بھیجا ہوا ہوں جس کی بادشاہی تمام آسمانوں اورزمین میں ہے، اس کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں، وہی زندگی دیتا ہے اوروہی موت دیتا ہے)

(۱)لانبیاء[۱۰۷] (۲)الأعراف[۱۵۸]

نیز ارشاد ہے:﴿وَمَـا أَرسَـلْنَـاكَ اِلّاكَـافَّةً لِّلـنَّـاسِ بَشِيْـراً وَّنَذِيْـراً﴾ (۱)
ترجمہ:(ہم نے آپ کو تمام لوگوں کیلئے خوشخبریاں سنانے والا اور ڈرانے والا بنا کر بھیجا ہے)
نیز ارشاد ہے:﴿وَأُوحِيَ اِلَـيَّ هَـذَا الـقُـرآنُ لِأُنْـذِرَكُـمْ بِـهٖ وَمَنْ بَلَغَ﴾ (۲)
ترجمہ:(اور میرے پاس یہ قرآن بطور وحی کے بھیجا گیا ہے تاکہ میں اس قرآن کے ذریعہ سے تم کو اور جس کو یہ قرآن پہنچے ان سب کو ڈراؤں)
نیز ارشاد ہے:﴿تَبَـارَكَ الَّـذِي نَـزَّلَ الـفُـرْقَـانَ عَـلَىٰ عَبدِهٖ لِيَكُونَ لِلعَالَمِينَ نَـذِيْـراً﴾ (۳) ترجمہ:(بہت بابرکت ہے وہ اللہ تعالیٰ جس نے اپنے بندے پر فرقان اتارا تاکہ وہ تمام لوگوں کیلئے آگاہ کرنے والا بن جائے)
رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے:(كَـانَ النَّبِيُّ يُبْعَثُ اِلَىٰ قَوْمِهٖ خَاصَّةً ، وَبُعِثْتُ اِلَىٰ الـنَّـاسِ عَـامَّةً) (۴) ترجمہ:(مجھ سے پہلے ہر نبی کو صرف اپنی ہی قوم کی طرف مبعوث کیا جاتا تھا، جبکہ مجھے تمام بنی نوعِ انسان کی طرف مبعوث کیا گیا ہے)
چنانچہ صلحِ حدیبیہ سے فائدہ اٹھاتے ہوئے رسول اللہ ﷺ نے ''تبلیغِ دین'' کے اس فریضے کی انجام دہی کے طور پر متعدد دعوتی خطوط تحریر فرمائے۔

☆......''اصلاح'' کا ایک بنیادی اصول یہ ہے کہ انسان سب سے پہلے خود اپنی اصلاح کرے، اس کے بعد اپنے اہل وعیال اور افرادِ خانہ کی، پھر اپنے اعزہ واقارب اور اپنے احباب کی، اس کے بعد علاقائی سطح پر یہ کام ہو، پھر ملکی سطح پر......اور اگر حالات اجازت دیں تو مناسب طریقے سے اور حکمت کے ساتھ عالمی سطح پر یہ فریضہ انجام دیا جائے۔

(۱) سبا[۲۸] (۲) الأنعام[۱۹] (۳) الفرقان[۱]
(۴) بخاری[۳۲۸] کتاب التیمم وقول اللہ تعالیٰ: فان لم تجدوا ماء......، مسلم[۵۲۱] کتاب المساجد ومواضع الصلاۃ۔

رسول اللہ ﷺ نے اللہ کے دین کی طرف دعوت کا جوفریضہ انجام دیا' اس میں بھی ''اصلاح'' کا یہی بنیادی اصول کارفرما نظر آتا ہے، چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ:

آپؐ کے اعلیٰ اخلاق' بے داغ کردار اور پاکیزہ سیرت کے اپنے اور پرائے سبھی معترف تھے۔

اس کے بعد جب آپؐ کونبوت سے سرفراز کیا گیا اور اللہ کا پیغام پہنچانے کا فریضہ سونپا گیا' تب آپؐ نے سب سے پہلے اپنے اہلِ خانہ کودینِ حق قبول کرنے کی دعوت دی۔

اس کے بعد جب اللہ کی طرف سے اپنے حبیب ﷺ کیلئے یہ حکم نازل ہوا: ﴿وَأَنذِر عَشِيرَتَكَ الأَقرَبِينَ﴾ (۱) یعنی: ''آپ اپنے قریبی رشتے داروں کوڈرائیے'' تب آپؐ نے بنو ہاشم اور بنوعبدالمطلب کواللہ کا پیغام پہنچاتے ہوئے دینِ برحق کی طرف بلایا، اوراسی سلسلے میں ''کوہِ صفا'' پراجتماع کا مشہور واقعہ پیش آیا تھا۔

اور پھر جب آیت: ﴿فَاصدَع بِمَا تُؤمَرُ وَأَعرِض عنِ المُشرِكِينَ﴾ (۲) یعنی: ''آپ کوجس چیز کاحکم دیا جارہاہے اسے آپ کھول کرسنادیجئے اورمشرکین سے منہ پھیر لیجئے'' (۳) نازل ہوئی تو اس ارشادِ ربانی کی تعمیل کے طور پر آپؐ نے دعوتِ دین کے اس سلسلے کووسعت دیتے ہوئے تمام مکہ والوں کواللہ کا پیغام پہنچایا' جس کے نتیجے میں مشرکینِ مکہ کی جانب سے ایذاءرسانیوں کا آغاز ہوا۔

اس کے بعد آپؐ نے مکہ شہر سے باہر قرب وجوار کے علاقوں میں دعوت کا فریضہ سرانجام

(۱) النمل [۲۱۴] (۲) الحجر [۹۴] (۳) یعنی اب رسول اللہ ﷺ کو یہ حکم دیا گیا کہ چھپ کرتبلیغ کرنے کی بجائے کھلم کھلا اور علیٰ الاعلان اللہ کے دین کی تبلیغ کریں، اوراس سلسلے میں مشرکینِ مکہ کی طرف سے مخالفت وعداوت کا جب سامنا کرنا پڑے توان سے الجھنے کی بجائے' یااس بات پرافسردہ ہونے کی بجائے ان سے منہ موڑلیں (یعنی بس اللہ پر بھروسہ رکھیں اورافسردہ ورنجیدہ نہوں......)

دیا،اسی سلسلے میں ''سفرِ طائف'' کا تاریخی واقعہ پیش آیا، نیز انہی دنوں آپؐ نے مشرکینِ مکہ کی بجائے بیرونِ مکہ سے آنے والے ان افراد وقبائل پر اپنی توجہ زیادہ مرکوز کی جن کی حج وعمرہ کی ادائیگی کی غرض سے' یا تجارت کے سلسلے میں مکہ شہر میں آمدورفت رہتی تھی، اسی سلسلے میں حج کے موقع پر مدینہ سے آئے ہوئے چند افراد کے قبولِ اسلام کا واقعہ' اور پھر ''بیعتِ عقبہ'' کا مشہور واقعہ پیش آیا تھا۔

اور پھر بالآخر ۶ھ ہجری میں ''صلحِ حدیبیہ'' کے نتیجے میں جب مشرکینِ مکہ کی جانب سے قدرے بے فکری نصیب ہوئی اور حالات سازگار محسوس ہوئے تو ہجرت کے ساتویں سال آپؐ نے ارشادِ ربانی ﴿وَمَاأَرْسَلْنَاكَ اِلّاكَافَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْراً وَّنَذِيْراً﴾ (۱) یعنی ''ہم نے آپ کو تمام لوگوں کیلئے خوشخبریاں سنانے والا اور ڈرانے والا بنا کر بھیجا ہے'' کے مصداق کے طور پر دعوت وتبلیغ کے اس سلسلے کو جزیرۃ العرب سے باہر کی دنیا تک وسعت دینے کا آغاز فرمایا، اور اسی سلسلے میں مختلف فرمانرواؤں' حکمرانوں' امراء وسلاطین' والیانِ ریاست' اور سردارانِ قبائل کو دعوتی خطوط ارسال کئے گئے۔

اس سلسلے میں درجِ ذیل امور قابلِ ذکر ہیں:

☆......اُس دور میں چونکہ یہ رواج تھا کہ کسی بھی قسم کی سرکاری خط وکتابت کیلئے مہر کو ضروری تصور کیا جاتا تھا، ان فرمانرواؤں کے شاہی درباروں میں پہنچنے والا کوئی ایسا خط قبول نہیں کیا جاتا تھا کہ جس پر لکھنے والے کی مہر ثبت نہ ہو، بغیر مہر کے خط کو جعلی اور نقلی تصور کیا جاتا تھا۔

چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے ان فرمانرواؤں کے ساتھ دعوتِ اسلام کے سلسلے میں خط وکتابت

(۱) سبا [۲۸]

کے موقع پر ایک مہر تیار کروائی، اور پھر مزید یہ کہ اس مہر میں کوئی عبارت بھی درج ہوا کرتی تھی، جسے خط تحریر کرنے والے کی طرف سے دستخط یا شناخت کی حیثیت سے دیکھا جاتا تھا۔
رسول اللہ ﷺ نے جو مہر تیار کروائی اس میں بطورِ شناخت یہ عبارت تحریر کی گئی: ''محمد رسول اللہ''، اور اس عبارت کی تحریر کیلئے انداز یہ اختیار کیا گیا کہ اسے دائیں سے بائیں جانب لکھنے کی بجائے اوپر سے نیچے کی جانب لکھا گیا، سب سے اوپر ''اللہ'' اس کے نیچے ''رسول'' اور پھر سب سے نیچے ''محمد'' لکھا گیا، تاکہ جس کسی کو یہ خط تحریر کیا جا رہا ہے وہ خط پر نظر پڑتے ہی...... مضمون تک پہنچنے سے پہلے ہی...... اس خط کے تحریر کنندہ کی سوچ اور اس کے عقیدہ وایمان سے...... نیز اس کی حیثیت اور مقام ومرتبے سے آگاہ ہو جائے...... اسے اس حقیقت کا ادراک ہو جائے کہ اس خط کے تحریر کنندہ کا نام ''محمد'' ہے اور یہ کہ وہ اللہ کے رسول ہیں، نیز یہ کہ ان کا عقیدہ وایمان یہ ہے کہ اس تمام کائنات میں ''اللہ عزوجل'' کا مقام ومرتبہ سب سے بلند ہے...... تمام زمین وآسمان میں جو کچھ بھی ہے اس کا مقام ومرتبہ اللہ سے کم ہے۔

☆...... ان تمام خطوط کا بنیادی مضمون اگرچہ مشترک تھا کہ ان سب میں اُن فرمانرواؤں کو دینِ برحق قبول کرنے کی دعوت دی گئی تھی، البتہ عام مضمون ہر خط میں قدرے مختلف تھا، کیونکہ جن فرمانرواؤں کے نام یہ خطوط تحریر کئے گئے تھے ان سب کا پس منظر مختلف تھا، ان میں سے کوئی نصرانی تھا، کوئی مجوسی، کوئی مشرک، کوئی اللہ پر اور نبوت ورسالت پر یقین وایمان رکھتا تھا، کوئی اس چیز کا منکر تھا، جبکہ ان میں سے کسی کو اس بارے میں سرے سے کوئی علم ہی نہیں تھا...... لہٰذا...... جیسا کہ مقولہ مشہور ہے کہ ''لکل مقام مقال'' یعنی ہر موقع کیلئے گفتگو جدا ہوا کرتی ہے، ایک ہی بات ہر موقع پر اور ہر مقام پر نہیں کی جاسکتی، موقع ومحل کی

مناسبت سے ہی گفتگو کی جاتی ہے۔

اور پھر یہ کہ رسول اللہ ﷺ کے مقاصدِ بعثت میں سے ایک مقصد یہ بھی تھا کہ آپؐ دنیا کو ''حکمت ودانش'' کی تعلیم دیں(۱) لہٰذا خود آپؐ کا اپنا ہر اقدام اور ہر قول وعمل کس قدر حکمت ودانائی سے بھرپور ہوگا...... چنانچہ اسی حکمت اور فہم وفراست کا مظاہرہ ہمیں آپؐ کی طرف سے مختلف فرمانرواؤں کے نام تحریر فرمودہ ان خطوط میں بھی نظر آتا ہے' کہ ان سب کا بنیادی مضمون اگرچہ ایک ہی تھا، تاہم خط کا عام مضمون ہر مکتوب الیہ کی مذہبی' فکری وسماجی کیفیت کے مطابق جدا جدا تھا۔

☆......ان خطوط میں ہر فرمانروا پر یہ بات واضح کردی گئی تھی کہ اس کے قبولِ اسلام کی صورت میں بھی اس کی یہ بادشاہت' نیز اس کے ملک میں اوراس کی رعیت میں اس کی یہ حیثیت اور یہ رتبہ بدستوراسی طرح برقرار رہے گا، کیونکہ رسول اللہ ﷺ کو' یا آپؐ کے جاں نثار ساتھیوں کواس مکتوب الیہ کے ملک اوراس کی دولت اور مال ومتاع سے کوئی غرض نہیں تھی، دنیا کی ہوس یالالچ کا وہاں کوئی تصور نہیں تھا...... وہاں مالِ غنیمت یا کشورکشائی کا کوئی جذبہ نہیں تھا...... بلکہ اصل مقصود توان فرمانرواؤں کودعوتِ حق پہنچانا...... اورخود انہی کوراہِ نجات پرلانا تھا......خود انہی کی بھلائی اور دنیاوآخرت میں ان کی صلاح وفلاح مقصود تھی، نہ کہ ان کے ملک اور مال ومتاع پر قبضہ جمانا۔

یقیناً یہ بھی رسول اللہ ﷺ کی طرف سے ''استغناء عن الدنیا'' کی اعلیٰ مثال' نیز حکمت ودانائی اورسیاسی بصیرت کا بہت بڑا مظاہرہ تھا۔

(۱) جیسا کہ قرآن کریم میں ارشاد ہے ﴿وَيُعَلِّمُهُمُ الكِتَابَ وَالحِكمَة......﴾ یعنی ''تاکہ وہ (یعنی نبی ﷺ) انہیں سکھادیں کتاب اور حکمت......(البقرہ:۱۲۹)

دعوتِ اسلام کے سلسلے میں رسول اللہ ﷺ نے متعدد حکمرانوں اورفرمانرواؤں کے نام خطوط ارسال فرمائے، البتہ ان میں سے سلطنتِ روم اورسلطنتِ فارس خاص طور پرقابلِ ذکر ہیں، کیونکہ اُس زمانے میں روئے زمین پریہی دو بہت عظیم قوتیں تھیں، ان کی بڑی شان وشوکت تھی، بڑارعب اوردبدبہ تھا، دنیاکے باقی ممالک کی دینی' سیاسی' تمدنی' معاشرتی' ومعاشی صورتِ حال پران دونوں سلطنتوں کی بہت مضبوط گرفت تھی، علاقے کی باقی تمام قوتیں ہرلحاظ سے ان کے زیرِ اثرتھیں، چنانچہ ان عظیم سلطنتوں کے فرمانرواؤں کے ساتھ خط وکتابت کا حال درجِ ذیل ہے:

☆......قیصرِ روم:

دعوتِ اسلام کے سلسلے میں پہلا خط قیصرِ روم کے نام لکھا گیا، اُس زمانے میں سلطنتِ روم کا جوکوئی بھی بادشاہ ہوتا اسے ''قیصر'' کے لقب سے یاد کیا جاتا، اُس دور میں ''ہرقل'' نامی شخص قیصرِ روم تھا، یعنی روئے زمین کی عظیم ترین قوت ''سلطنتِ روم'' کا بادشاہ تھا۔

رسول اللہ ﷺ کے صحابی حضرت دِحیہ بن خلیفہ الکلبی رضی اللہ عنہ قیصرِ روم کے نام آپؐ کا تحریرفرمودہ نامۂ مبارک لے کرمدینہ منورہ سے سفرکرتے ہوئے سلطنتِ روم کے دارالحکومت ''قُسطَنطِینیہ'' کی جانب عازمِ سفرہوئے (۱) (۲) دورانِ سفرانہیں یہ اطلاع ملی کہ قیصر آجکل ''ایلیاء'' (یعنی بیت المقدس) آیاہواہے، جس پرانہوں نے قُسطَنطِینیہ کی بجائے اپنے سفرکا رُخ ایلیاء کی جانب موڑ دیا۔

---

(۱) حضرت دحیہ بن خلیفہ الکلبی رضی اللہ عنہ کے بارے میں یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ جبریل امین علیہ السلام جب بھی انسانی شکل میں رسول اللہ ﷺ کے پاس تشریف لاتے تو ہمیشہ انہی کی شکل میں آیا کرتے تھے۔

(۲) اُس زمانے میں سلطنتِ روم کا دارالحکومت ''قسطنطینیہ'' تھا، یعنی موجودہ ''استنبول'' جوکہ اب ترکی کا مشہورومعروف شہرہے۔

دراصل سلطنتِ روم اور سلطنتِ فارس میں باہم سالہا سال سے مختلف محاذوں پر خونریز قسم کی جنگوں کا سلسلہ چلا آرہا تھا، کبھی ایک فریق کو غلبہ نصیب ہوتا، اور کبھی دوسرے فریق کو...... یوں سالہا سال سے یہ سلسلہ جاری تھا......اور چونکہ خطے کے دیگر تمام ممالک اور ان میں بسنے والے عوام ان دونوں میں سے کسی ایک کے تابعِ فرمان اور زیرِ اثر تھے' لہٰذا فریقین میں سے کسی ایک کی فتح اور دوسرے کی شکست کے دینی' سیاسی' سماجی واقتصادی اثرات صرف انہی دونوں تک محدود نہیں رہتے تھے، بلکہ اس چیز کا اثر دور دراز کے علاقوں تک پہنچتا تھا، حتیٰ کہ اس چیز کا اثر مکہ تک بھی پہنچتا تھا...... فارسی چونکہ مشرک (آتش پرست) تھے، لہٰذا جب کسی محاذ پر انہیں غلبہ نصیب ہوتا تو مشرکینِ مکہ خوشیاں مناتے اور مسلمان غمگین ہوجاتے......جبکہ رومی چونکہ اہلِ کتاب تھے' لہٰذا ان کی کامیابی پر مسلمان خوش ہوتے' جبکہ مشرکین غمزدہ ہوجاتے......اس چیز کا تذکرہ قرآن کریم میں بھی ''سورۃ الروم'' کی بالکل ابتدائی آیات میں موجود ہے۔

جن دنوں حضرت دِحیہ بن خلیفہ الکلبی رضی اللہ عنہ رسول اللہ ﷺ کا نامۂ مبارک قیصرِ روم تک پہنچانے کی غرض سے محوِ سفر تھے' دراصل انہی دنوں کسی اہم محاذ پر رومیوں کو فارسیوں کے مقابلے میں کوئی بڑی فتح نصیب ہوئی تھی، اور اہلِ کتاب کے نزدیک ''ایلیاء'' یعنی بیت المقدس کا بڑا تقدس تھا اور اسے خاص مذہبی حیثیت حاصل تھی، لہٰذا اس عظیم فتح کے موقع پر بطورِ شکر عبادت کی غرض سے قیصر ان دنوں اپنے دارالحکومت ''قُسطَنطِینیہ'' سے ''ایلیاء'' یعنی بیت المقدس آیا ہوا تھا، چنانچہ رسول اللہ ﷺ کے قاصد کو جب یہ خبر ملی تو وہ بھی قسطنطینیہ کی بجائے ایلیاء پہنچ گئے اور نامۂ مبارک قیصر کے حوالے کیا۔

قیصر نے رسول اللہ ﷺ کا نامۂ مبارک پڑھا، اور پھر غور و فکر کے بعد اس نے اس بارے

میں کسی بھی طرح مزید معلومات حاصل کرنے کا فیصلہ کیا۔

اُس زمانے میں مشرکینِ مکہ کے تجارتی قافلوں کی بکثرت ملکِ شام آمد و رفت رہا کرتی تھی چنانچہ رسول اللہ ﷺ کا نامۂ مبارک موصول ہونے پر قیصرِ روم نے حکم دیا کہ مکہ کا کوئی باشندہ اگر نظر آئے تو اسے فوراً اس کے سامنے پیش کیا جائے۔ چنانچہ اس حکم کی تعمیل میں تلاش کا سلسلہ شروع کیا گیا تو جلد ہی مشرکینِ مکہ کا ایک قافلہ وہاں مل گیا، جسے بغیر کسی تاخیر کے قیصر کے روبرو پیش کیا گیا۔ قیصر نے اس وفد میں موجود افراد سے دریافت کیا کہ تمہارے شہر مکہ میں نبوت کا دعویٰ کرنے والے اس شخص کا تم میں سے قریبی رشتے دار کون ہے؟ اس پر ابوسفیان (جو کہ اُس وقت تک مسلمان نہیں ہوئے تھے) نے جواب دیا کہ ''میں ہوں''۔ اس کے بعد قیصر اور ابوسفیان کے درمیان کچھ اس طرح سوال و جواب کا سلسلہ ہوا:

☆......قیصر: محمد کا خاندان کیسا ہے؟

ابوسفیان: شریف ہے

☆......قیصر: کیا اس خاندان میں کسی اور نے بھی کبھی نبوت کا دعویٰ کیا ہے؟

ابوسفیان: نہیں

☆......قیصر: اس خاندان میں کبھی کوئی بادشاہ گذرا ہے؟

ابوسفیان: کبھی نہیں

☆......قیصر: جن لوگوں نے ان کا دین قبول کیا وہ امیر ہیں یا غریب؟

ابوسفیان: غریب لوگ ہیں

☆......قیصر: ان کے ماننے والے گھٹ رہے ہیں یا بڑھ رہے ہیں؟

ابوسفیان: بڑھ رہے ہیں

☆......قیصر: کیا اس کے ماننے والوں میں سے کبھی کوئی اس سے منحرف بھی ہوا ہے؟

ابوسفیان: کبھی نہیں

☆......قیصر: کبھی تم لوگوں سے اس نے جھوٹ بھی بولا ہے؟

ابوسفیان: نہیں، بلکہ ہمارے علاقے میں وہ ''صادق'' اور ''امین'' کے لقب سے مشہور ہے

☆......قیصر: وہ کبھی اپنے وعدے یا اقرار سے پھرا ہے؟

ابوسفیان: نہیں ، ایسا کبھی نہیں ہوا، حال ہی میں اس سے ہمارا معاہدۂ صلح (۱) ہوا ہے، دیکھیں' اس پر وہ قائم رہتا ہے یا نہیں

☆......قیصر: تم لوگوں نے کبھی اس سے جنگ بھی کی ہے؟

ابوسفیان: ہاں

☆......قیصر: نتیجہ کیا رہا؟

ابوسفیان: کبھی ہم غالب آئے اور کبھی وہ (۲)

☆......قیصر: اس کی تعلیمات کیا ہیں؟

ابوسفیان: کہتا ہے کہ ''ایک اللہ کی عبادت کرو، کسی کو اس کا شریک نہ ٹھہراؤ، نماز پڑھو، سچ بولو، پاکیزہ اور باحیاء زندگی اختیار کرو، رشتے داروں کے ساتھ اچھا سلوک کرو، اور نیکی کے

(۱) یعنی صلحِ حدیبیہ (۲) یعنی اُس وقت تک مسلمانوں اور مشرکینِ مکہ کے مابین تین بڑی جنگوں کی نوبت آئی تھی ، بدر، اُحد، اور خندق (جسے احزاب کے نام سے بھی یاد کیا جاتا ہے) بدر کے موقع پر مسلمانوں کو غلبہ نصیب ہوا، اُحد کے موقع پر ابتداء میں مسلمان غالب رہے، لیکن بعد میں اپنی ہی ایک غلطی کی وجہ سے جیتی ہوئی جنگ ہار گئے، جبکہ خندق کے موقع پر تو باقاعدہ جنگ کی نوبت ہی نہیں آئی......ابوسفیان کے اس جواب سے اسی بات کی طرف اشارہ مقصود تھا کہ ''کبھی ہم غالب آئے اور کبھی وہ''۔

راستے پر چلو‘‘۔

رسول اللہ ﷺ کے بارے میں ابوسفیان کی زبانی یہ گفتگو سن کر قیصر بولا:

☆......’’تم کہتے ہو کہ وہ شریف خاندان میں سے ہیں...... نبی ہمیشہ شریف خاندان میں ہی پیدا ہوتے ہیں۔

☆......تم کہتے ہو کہ ان کے خاندان میں پہلے کبھی کسی نے نبوت کا دعویٰ نہیں کیا اور نہ ہی ان میں کوئی بادشاہ گذرا ہے......اگر ایسا ہوتا تو ہم سمجھتے کہ یہ خاندانی وقار کا اثر ہے(۱)

☆......تم نے کہا کہ وہ جھوٹ نہیں بولتے......جو شخص انسانوں کے سامنے جھوٹ نہیں بولتا وہ اللہ کے بارے میں کس طرح جھوٹ بول سکتا ہے؟(۲)

☆......تم نے بتایا کہ ان کے ماننے والوں میں غریب زیادہ ہیں......پیغمبروں پر سب سے پہلے غریب ہی ایمان لایا کرتے ہیں۔

☆......تم مانتے ہو کہ ان کے پیروکار بڑھتے جارہے ہیں......سچے دین کا یہی حال ہوتا ہے۔

☆......تم نے بتایا کہ ان کے پیروکاروں میں سے کبھی کوئی ان سے منحرف نہیں ہوا......سچے دین کی یہی شان ہوتی ہے کہ ایک بار جب دل کی گہرائیوں میں پیوست ہوجاتا ہے تو پھر اس سے انحراف ممکن نہیں ہوتا۔

☆......تم قبول کرتے ہو کہ وہ کبھی اپنے وعدے یا اقرار سے نہیں پھرتے......سچا نبی ایسا ہی

(۱) یعنی ہم یہ سمجھتے کہ اس شخص نے اس لالچ کی وجہ سے نبوت کا یہ جھوٹا دعویٰ کیا ہے کہ اس طرح شاید اسے بھی وہی عزت وعظمت اور مقام ومرتبہ نصیب ہوجائے......

(۲) یعنی جب وہ انسانوں کے بارے میں کبھی جھوٹ نہیں بولتا تو اللہ کے بارے میں وہ کس طرح یہ جھوٹا دعویٰ کرسکتا ہے کہ اس نے مجھے نبی بنا کر بھیجا ہے......؟

ہوتا ہے۔

☆......تم نے اقرار کیا کہ وہ نماز اور نیکی کی تاکید وتلقین کرتے ہیں......سچے نبیوں کی تعلیمات ایسی ہی پاکیزہ ہوا کرتی ہیں۔

اور پھر قیصر کچھ دیر کسی سوچ میں میں گم رہا......پھر......قدرے توقف کے بعد یوں کہنے لگا......فَاِن کَانَ مَا تَقُولُ حَقّاً ...... فَسَیَمْلِكُ مَوضِعَ قَدَمَيَّ هَاتَین ...... یعنی نبوت کا دعویٰ کرنے والے اس شخص کے بارے میں جو کچھ تم بتا رہے ہو......اگر یہ سب درست ہے......تو بہت جلد میرے پایۂ تخت تک ان کا قبضہ ہو جائے گا(۱)

اور پھر مزید کہنے لگا''وَقَد کُنتُ أعلَم أنّهٗ خَارِج ، وَلَم أکُن أظُنّهٗ مِنکُم''یعنی مجھے اس بات کا علم تھا کہ وہ عنقریب ظاہر ہونے والے ہیں، لیکن مجھے یہ توقع نہیں تھی کہ وہ تم میں ظاہر ہو جائیں گے(۲)

اور پھر مزید کہنے لگا''فَلَو أنّي أعلَمُ أنّي أخلُص اِلَیهِ لَتَجَشَّمتُ لِقَاءَهٗ ، وَلَو کُنتُ عِندَهٗ لَغَسَلتُ عَن قَدَمَیهِ''(۳)یعنی''اگر میں یہ جان سکوں کہ میرے لئے کسی طرح ان تک رسائی ممکن ہے تو میں ضرور بڑی بیتابی کے ساتھ ان کی خدمت میں

(۱) یعنی جب وہ سچے نبی ہیں تو پھر یقیناً ان کے ساتھ اللہ کی طرف سے تائید ونصرت بھی ہوگی، لہٰذا ان کے دین کو پھلنے پھولنے سے کوئی نہیں روک سکتا، اور نتیجہ یہ ہوگا کہ عنقریب بہت جلد یہاں ہمارے ملک اور پایۂ تخت تک ان کا قبضہ ہو جائے گا۔

(۲) یعنی چونکہ گذشتہ آسمانی کتابوں میں رسول اللہ ﷺ کے بارے میں تذکرہ اور بشارتیں موجود تھیں، نیز آپؐ کے ظہور کی علامات بھی بیان کی گئی تھیں، اہلِ کتاب یہ سب کچھ اپنی کتابوں میں پڑھا کرتے تھے، لہٰذا انہیں اس بارے میں خوب علم تھا، البتہ انہیں یہ امید نہیں تھی کہ وہ آخری نبی ان اہلِ کتاب کی بجائے مکہ میں عربوں میں ظاہر ہو جائیں گے۔

(۳) صحیح بخاری[۷] باب بدء الوحی۔

حاضر ہوتا......اور اگر میں ان تک پہنچ سکتا تو ضرور میں خود ان کے پاؤں دھوتا''۔
یعنی اتنی بڑی سلطنت کا اس قدر عظیم بادشاہ......رسول اللہ ﷺ کے بارے میں یہ الفاظ کہنے لگا......کہ......اگر میرے بس میں ہوتا تو میں بڑی بیتابی اور شوق کے ساتھ ان کی خدمت میں حاضری دیتا......اور میں خود ان کے پاؤں دھوتا۔
شاہی دربار میں موجود تمام بڑی بڑی شخصیات......مشیروں' وزیروں' ودیگر درباریوں نے جب اپنے بادشاہ کی زبانی یہ باتیں سنیں تو وہ حیران و پریشان اور انگشت بدنداں رہ گئے......اور اس سوچ میں پڑ گئے کہ ہمارے بادشاہ کو کیا ہو گیا......؟ اور تب وہاں آوازیں بلند ہونے لگیں، ایک شور وغل برپا ہو گیا، افراتفری کا ماحول پیدا ہو گیا، اتنے بڑے بادشاہ کا وہ دربار کہ جہاں شاہی جاہ وجلال اور رعب ودبدبے کی وجہ سے ہمہ وقت بڑی ہیبت طاری رہتی تھی، اور پُر وقار فضاء بنی رہتی تھی......اب وہاں یہ شور وغل...... یہ بدنظمی اور یہ افراتفری...... یہ منظر دیکھ کر قیصر پریشان ہو گیا، اور معاملے کی نزاکت کو محسوس کرتے ہوئے اس نے کسی بھی طرح اس معاملے کو ٹالنے کی کوشش کی، اور دینِ اسلام نیز پیغمبرِ اسلام کی صداقت وحقانیت کو خوب جان لینے اور سمجھ لینے کے باوجود محض اپنی حکومت اور تاج وتخت بچانے کی خاطر اس نے دینِ اسلام قبول نہیں کیا......اور یوں اس نے آخرت کی ابدی ودائمی سعادتمندی وکامیابی کے مقابلے میں دینا کی عارضی وفانی شان وشوکت کو ترجیح دی اور دینِ برحق قبول کرنے کی ابدی سعادت سے محروم رہ گیا۔

☆......کسریٰ:

دعوتِ اسلام کے سلسلے میں دوسرا خط روئے زمین کی دوسری بڑی سلطنت اور عظیم قوت ''فارس'' کے بادشاہ کے نام لکھا گیا، اُس دور میں سلطنتِ فارس کا جو بھی بادشاہ ہوتا اُسے

''کسریٰ'' کے لقب سے یاد کیا جاتا تھا، اُس زمانے میں ''خسرو پرویز'' نامی شخص کسریٰ تھا، یعنی فارس کا بادشاہ تھا۔

سلطنتِ فارس کا اگرچہ بڑا جاہ وجلال تھا، نیز یہ کہ خسرو پرویز ہی کا (ساسانی) خاندان ایک ہزار سال سے مسلسل نسل در نسل وہاں حکمرانی کر رہا تھا، لیکن بالخصوص خسرو پرویز کے دورِ حکومت میں سلطنتِ فارس کو جو جاہ وجلال اور عروج حاصل ہوا' نیز وہاں کے شاہی دربار کو جو شان وشوکت اور رعب ودبدبہ نصیب ہوا...... یہ چیز اس سے قبل کبھی نصیب نہیں ہوئی تھی غرضیکہ خسرو پرویز انتہائی شان وشوکت اور جاہ وجلال والا بادشاہ تھا۔

رسول اللہ ﷺ کے قاصد کی حیثیت سے مشہور صحابی حضرت عبداللہ بن حذافہ السہمی رضی اللہ عنہ(۱) نے ایک روز اپنے اہل وعیال کو الوداع کہا......اور آپ ﷺ کا نامۂ مبارک کسریٰ تک

(۱) عبداللہ بن حذافہ السہمی رضی اللہ عنہ کسی بھی عام انسان کی طرح مکہ کے گلی کوچوں میں کھیلتے کودتے ہوئے جوان ہوئے تھے......لیکن دینِ اسلام قبول کرنے کے بعد ان کے ساتھ ''قیصر وکسریٰ'' کے حوالے سے ایسے حالات وواقعات پیش آئے کہ جن کی وجہ سے ان کا تذکرہ ہمیشہ کیلئے تاریخ کے صفحات میں بلکہ کتبِ حدیث میں محفوظ ہوگیا، اُس وقت روئے زمین کی دونوں عظیم ترین قوتوں کے بادشاہوں کے ساتھ ان کی ملاقات ہوئی، اور عجیب وغریب حالات وواقعات پیش آئے، کسریٰ خسرو پرویز کے ساتھ تو ان کی ملاقات اسی موقع پر یعنی سنہ سات ہجری میں رسول اللہ ﷺ کی طرف سے مختلف فرمانرواؤں کے نام دعوتی خطوط ارسال کئے جانے کے موقع پر ہوئی، جبکہ سنہ ۱۹ ہجری میں خلیفۂ دوم حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ کے دورِ خلافت میں جب مشرق ومغرب میں ہر طرف اسلامی فتوحات کا ایک سیلاب جاری تھا......تب یہ ملکِ شام میں سلطنتِ روم کے خلاف برسرِ پیکار اسلامی لشکر میں شامل تھے، وہاں ایک بار عجیب وغریب قسم کے حالات میں ایک ''قیدی'' کی حیثیت سے انہیں قیصرِ روم کے سامنے پیش کیا گیا...... اور تب کس کس طرح اس نے ان کی دینی استقامت کا امتحان لیا......اور کیا کیا واقعات پیش آئے......اور کس طرح یہ سرخ رو ہو کر وہاں سے واپس مدینہ پہنچے......ان واقعات کی وجہ سے تاریخ میں ان کا نام ہمیشہ روشن رہے گا......اگر اللہ کی طرف سے توفیق شاملِ حال رہی......اور زندگی نے وفاء کی......تو ان شاء اللہ کبھی ان کے حالات مفصل تحریر کروں گا، وما توفیقی الا باللہ، علیہ توکلت والیہ اُنیب۔

پہنچانے کی غرض سے یکہ وتنہا...... اپنے اللہ پر بھروسہ کئے ہوئے، مدینہ سے ہزاروں میل کی مسافت پر واقع سلطنتِ فارس کے دارالحکومت "مدائن" کی جانب محوِ سفر ہو گئے...... اور وہاں پہنچنے کے بعد شاہی دربار میں جا کر نامۂ مبارک خسرو پرویز کے حوالے کیا، جسے پڑھنے کیلئے خسرو نے اپنے مترجم کو طلب کیا۔

اُس دور میں فارس کے شاہی دربار میں یہ دستور تھا کہ خسرو پرویز کے نام جو بھی خط تحریر کیا جاتا اُس میں سب سے اوپر خسرو کا نام لکھا جاتا، جبکہ رسول اللہ ﷺ کے نامۂ مبارک میں جب خسرو کو سب سے اوپر اللہ عزوجل کا نام نظر آیا...... تو وہ انتہائی غضبناک اور آگ بگولہ ہو گیا...... اور خط پڑھے بغیر ہی اسے چاک کر ڈالا...... اور پھر رسول اللہ ﷺ کے قاصد کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اس نے اپنے درباریوں کو حکم دیا کہ اسے دھکے دے کر یہاں سے نکال دیا جائے...... نیز اس بدبخت نے اپنے کچھ کارندوں کو مدینہ بھی بھیجا تا کہ نعوذ باللہ رسول اللہ ﷺ کو گرفتار کر کے اس کے سامنے پیش کیا جائے (۱)

رسول اللہ ﷺ کے قاصد عبداللہ بن حذافہ السہمی رضی اللہ عنہ سلطنتِ فارس سے واپس سفر کرتے ہوئے مدینہ پہنچے، رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور تمام صورتِ حال بیان کی، نیز یہ بھی بتایا کہ بدبخت خسرو پرویز نے آپ ﷺ کا نامۂ مبارک پرزے پرزے کر ڈالا...... محض اس لئے کہ اُس میں سب سے اوپر اللہ عزوجل کا نام لکھا ہوا تھا...... یہ سن کر آپ ﷺ نے فقط اتنا فرمایا "مَزَّقَ اللّٰهُ مُلْكَهٗ" یعنی "اللہ کرے اس کا ملک بھی ٹکڑے ٹکڑے ہو جائے" یعنی جس طرح اس نے اس خط کو پھاڑ کر ٹکڑے ٹکڑے کر دیا......

(۱) ان کارندوں کی مدینہ آمد، اور پھر رسول اللہ ﷺ کے ساتھ گفتگو...... اور پھر اس کا نتیجہ...... یہ الگ موضوع ہے، جو کہ تفصیل طلب ہے۔

اللہ کرے اسی طرح اس کی بادشاہت اور اس کے ملک کے بھی ٹکڑے ٹکڑے ہو جائیں......

اللہ کی قدرت ملاحظہ ہو کہ اس واقعے کے بعد ابھی چند روز ہی گذرے تھے کہ اس قدر جاہ وجلال اور رعب ودبدبے والا بادشاہ جو کہ خود کو ''شہنشاہ'' یعنی بادشاہوں کا بادشاہ کہلاتا تھا' مارا گیا...... اور اس سے بھی بڑی بدبختی یہ ہوگئی کہ خود اپنے ہی بیٹے ''شیرویہ'' کے ہاتھوں مارا گیا، اس کا اپنا ہی بیٹا اسے قتل کر کے اس کے ملک اور تخت وتاج کا مالک بن بیٹھا۔

☆......نجاشی شاہِ حبشہ:

دعوتِ اسلام کے سلسلے میں ایک خط ملکِ حبشہ کے بادشاہ کے نام تحریر کیا گیا، اُس زمانے میں حبشہ کے بادشاہ کو ''نجاشی'' کے لقب سے پکارا جاتا تھا، اور جس دور میں یہ خط ارسال کیا گیا اُن دنوں ''اَصحمہ'' نامی شخص نجاشی تھا، یعنی ملکِ حبشہ کا بادشاہ تھا، رسول اللہ ﷺ کے قاصد کی حیثیت سے یہ نامۂ مبارک حضرت عمرو بن اُمیہ الضمری رضی اللہ عنہ لے کر گئے۔

نجاشی تو دراصل بہت پہلے سے ہی دینِ اسلام اور پیغمبرِ اسلام کی حقانیت وصداقت کا معترف تھا، دینِ اسلام کے بالکل ابتدائی دور میں جب نبوت کا پانچواں سال چل رہا تھا، مشرکینِ مکہ کی طرف سے مسلمانوں کے ساتھ ظلم وزیادتی اور ایذاء رسانیوں کا سلسلہ اپنے عروج پر تھا......تب رسول اللہ ﷺ کے مشورے پر بہت سے مسلمان مکہ سے ملکِ حبشہ کی جانب ہجرت کر گئے تھے، اور تب مشرکینِ مکہ کا ایک وفد بھی ان کے تعاقب میں حبشہ پہنچا تھا، اور نجاشی کے سامنے ان مسلمانوں پر اپنے آباؤ اجداد کے دین سے غداری اور فتنہ وفساد پھیلانے کا الزام عائد کرتے ہوئے ان کی واپسی کا مطالبہ کیا تھا، نجاشی نے اس موقع پر ان مسلمانوں کا موقف بھی سنا تھا اور دینِ اسلام کے بارے میں ان سے بہت

کچھ معلومات حاصل کی تھیں اور بہت متأثر ہوا تھا،اور پھراس نے مشرکینِ مکہ کے وفد کو وہاں سے واپس لوٹ جانے کاحکم دیا تھا،جبکہ مسلمانوں کیلئے یہ فیصلہ سنایا تھا کہ یہ جب تک چاہیں یہاں ہمارے ملک میں راحت وسکون اورامن وامان کے ساتھ بے خوف وخطر زندگی بسر کرسکتے ہیں(۱)

لہٰذانجاشی توتبھی سے رسول اللہ ﷺ نیز دینِ اسلام کی حقانیت سے واقف تھااوراس چیز کامعترف بھی تھا،البتہ اب رسول اللہ ﷺ کی طرف سے اسے با قاعدہ دعوتِ اسلام کے سلسلے میں نامۂ مبارک موصول ہواتو اب اس نے با قاعدہ اپنے قبولِ اسلام کااعلان کیا،اور رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں جوابی خط تحریر کرکےاس چیز کی با قاعدہ اطلاع بھی دی،جس پرآپؐ نےنہایت مسرت کااظہارفرمایااوراس کیلئے دعائے خیربھی فرمائی۔

☆......مقوقس شاہِ مصر:

ایک خط مقوقس شاہِ مصرکولکھا گیا، رسول اللہ ﷺ کے قاصد کی حیثیت سے مقوقس کو یہ خط حاطب بن ابی بلتعہ رضی اللہ عنہ نے پہنچایا،مقوقس نے رسول اللہ ﷺ کے قاصد کا بہت زیادہ احترام کیااورخوب مہمان نوازی کی ،نیز دینِ اسلام اورپیغمبرِ اسلام کے بارے میں بہت سےسوالات کیۓ اور بہت سی معلومات حاصل کیں،جس پروہ انتہائی متأثر ہوا،رسول اللہ ﷺ کی اوردینِ اسلام کی بہت زیادہ تعریفیں کرتا رہااوراپنی عقیدت ومحبت کااظہار کرتا رہا......البتہ اصل مقصد جس کی خاطر یہ نامۂ مبارک تحریر کیا گیا تھا......یعنی اسے قبولِ اسلام کی دعوت دی گئی تھی‘ اس بارے میں وہ کچھ نہیں بولا......مکمل خاموشی اختیار کیۓ رکھی......

اورآخرچندروز بعدرسول اللہ ﷺ کیلئے بہت سے قیمتی ہدایا وتحائف اورنیک تمناؤں کے

(۱)اس بارے میں تفصیل ’’ہجرتِ حبشہ‘‘ کے بیان میں گذرچکی ہے،صفحہ:۱۷۔

اظہار کے ساتھ اس نے آپؐ کے قاصد کوواپس روانہ کردیا۔

☆......ان بڑی بڑی سلطنتوں کے علاوہ متعدد چھوٹی بڑی ریاستوں کے حکمرانوں اور فرمانرواؤں کوبھی دعوتی خطوط تحریر کیے گئے، مثلاً بحرین اورعُمان وغیرہ......جس کے نتیجے میں ان میں سے کسی نے دینِ اسلام قبول کیا، کسی نے انکارکیا، اورکسی نے محض نیک تمناؤں کے اظہار پراکتفاء کیا۔

غرضیکہ ان مختلف فرمانرواؤں کے نام ان دعوتی خطوط کے ذریعے ارشادِ ربانی: ﴿قُـل يَـا أيُّهَـا الـنَّـاسُ اِنّـِي رَسُـوْلُ الـلّـهِ اِلَيْـكُـم جَمِيْعاً الّذي لَهٗ مُلْكُ السَّمَاوَاتِ وَ الأرضِ لَااِلٰـهَ اِلّاَهُوَ يُحْيِي وَيُمِيْتُ﴾ (۱) یعنی’’آپ کہہ دیجئے کہ اے لوگو! میں تم سب کی طرف اس اللہ تعالیٰ کا بھیجا ہوا ہوں جس کی بادشاہی تمام آسمانوں اورزمین میں ہے، اس کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں، وہی زندگی دیتاہے اوروہی موت دیتاہے‘‘ کی تعمیل بھی ہوگئی۔

نیز یہ کہ اس طرح دینِ اسلام کی نشرواشاعت کا سلسلہ اب جزیرۃ العرب کی حدود سے نکل کربیرونی دنیاتک وسعت اختیارکرگیا، اوراب وہاں بھی دینِ اسلام کے بارے میں چرچے ہونے لگے......یوں مجموعی طورپرمسلمانوں کے حق میں یہ چیز بہت ہی مفید ثابت ہوئی اوراس کے خوشگوارنتائج برآمد ہوئے۔

---

(۱)الاعراف[۱۵۸]

الحمدللہ آج بتاریخ ۲/ ذوالحجہ ۱۴۳۴ھ، مطابق ۷/ اکتوبر ۲۰۱۳ء بروز پیر یہ باب مکمل ہوا۔

رَبَّنَا تَقَبَّل مِنَّا اِنّكَ أنتَ السَّمِيْعُ العَلِيمُ ، وَتُبْ عَلَينَا اِنَّكَ أنتَ التَوَّابُ الرَّحِيم

غزوۂ خیبر:

ہجرت کے چھٹے سال جب صلحِ حدیبیہ کے نتیجے میں رسول اللہ ﷺ اپنے جاں نثار ساتھیوں کے ہمراہ عمرہ کئے بغیر مکہ سے واپس مدینہ پہنچے، تو وہاں کچھ اس قسم کی خبریں موصول ہوئیں کہ خیبر کے یہودی بڑے لشکر کے ساتھ اور پوری تیاری کے ساتھ مدینہ پر حملے کی منصوبہ بندی کر رہے ہیں۔

اس سے قبل آپؐ یہودیوں کو ان کی مسلسل ریشہ دوانیوں اور مسلمانوں کے خلاف مسلسل سازشوں کی وجہ سے مدینہ سے نکال چکے تھے(۱) خیبر میں ان کی بڑی تعداد آباد تھی اور وہ ان کی قوت کا مرکز تھا، مزید یہ کہ مدینہ سے نکالے گئے ان کے بعض مشہور اور طاقتور قبیلے خصوصاً ''بنونضیر'' اور ''بنوقریظہ'' بھی اب خیبر میں ان سے آ ملے تھے۔

صلحِ حدیبیہ کے نتیجے میں رسول اللہ ﷺ اور آپؐ کے جاں نثار ساتھیوں کو مشرکینِ مکہ کی طرف سے جب قدرے بے فکری نصیب ہوئی تو اب اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے آپؐ نے یہود کی سرکوبی کی غرض سے مناسب کارروائی کا فیصلہ فرمایا، چنانچہ اسی سلسلے میں طے یہ پایا کہ بجائے اس کے کہ یہیں مدینہ میں بیٹھ کر یہودی فوج کی یہاں آمد کا انتظار کیا جائے ...... بہتر یہ ہے کہ خود ان کی طرف کوچ کیا جائے اور انہیں مزید مہلت نہ دی جائے۔

(۱) مدینہ سے یہود کے اخراج یا جلاوطنی کیلئے قرآن کریم میں ''حشر'' کا لفظ استعمال کیا گیا ہے اور ان کے اس حشر کا مفصل تذکرہ ''سورۃ الحشر'' میں موجود ہے۔

چنانچہ سن سات ہجری میں رسول اللہ ﷺ اپنے چودہ سو جاں نثاروں کے ہمراہ مدینہ سے سفر کرتے ہوئے تقریباً ایک سو پچاسی کلومیٹر کی مسافت پر واقع شہر ''خیبر'' پہنچے، مسلمانوں کی وہاں آمد پر وہ لوگ قلعہ بند ہو کر بیٹھ گئے، جس پر مسلمانوں نے ان کا محاصرہ کر لیا، مرورِ وقت کے ساتھ متعدد چھوٹے بڑے قلعے فتح ہوتے چلے گئے، کہیں معمولی مزاحمت ہوئی، کہیں بڑی جنگ کی نوبت بھی آئی، البتہ ایک بہت بڑا قلعہ تھا جہاں کارروائی آگے نہیں بڑھ رہی تھی، محاصرہ کافی طول پکڑ چکا تھا اور یہ چیز خود مسلمانوں کیلئے بھی کافی تشویش کا باعث بنی ہوئی تھی...... آخر ایک روز رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ''لَأُعْطِيَنَّ الرَّايَةَ غَداً رَجُلًا يُحِبَّ اللّٰهَ وَ رَسُولَهُ وَ يُحُبُّهُ اللّٰهُ وَ رَسُولُهُ '' یعنی ''کل میں جھنڈا ایسے شخص کو دوں گا جو اللہ اور رسول سے محبت کرتا ہے، اور اللہ اور رسول بھی اس سے محبت کرتے ہیں''۔

ظاہر ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی طرف سے یہ بہت بڑی خوشخبری تھی...... اور بہت بڑی گواہی تھی...... اُس شخص کے بارے میں کہ جسے کل علم سونپا جانا تھا اور سپہ سالاری و قیادت کی ذمہ داری جس کے حوالے کی جانی تھی...... اس کے حق میں یہ بہت بڑی گواہی تھی کہ وہ اللہ اور رسول سے محبت کرتا ہے، نیز اللہ اور رسول بھی اس سے محبت کرتے ہیں۔

چنانچہ لشکر میں موجود بڑے بڑے صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین نے وہ رات اسی آرزو میں گذاری کہ کاش کل صبح رسول اللہ ﷺ میرا نام پکاریں...... اور جب صبح کا سورج طلوع ہوا تو رسول اللہ ﷺ کی آواز گونجی ''أَينَ عَلي '' یعنی ''علی کہاں ہیں؟'' تب حضرت علی رضی اللہ عنہ حاضرِ خدمت ہوئے، رسول اللہ ﷺ نے اپنے دستِ مبارک سے انہیں علَم عطاء فرمایا، نیز فتح اور خیر و برکت کی دعائیں دیتے ہوئے انہیں رخصت فرمایا۔

رسول اللہ ﷺ کے حکم کی تعمیل میں حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ اسلامی لشکر کی قیادت کرتے ہوئے دشمن کی جانب پیش قدمی کرنے لگے، آمنا سامنا ہوا، کافی سنسنی خیزاوراعصاب شکن قسم کی جنگ لڑی گئی۔

اس موقع پر یہودی فوج کی قیادت ''مرحب'' نامی شخص کرر ہاتھا' جس کا بڑا رعب اور دبدبہ تھا...... جس کی بہادری کے بڑے چرچے تھے...... مزید یہ کہ وہ اُس دور کا بڑا نامی گرامی پہلوان بھی تھا...... چنانچہ اس نے انتہائی غرور وتکبر کے ساتھ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو للکارا، جواب میں حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اس پر ایسا بھرپور وار کیا کہ غرور وتکبر کا وہ پتلا...... پلک جھپکتے میں ہی زمیں بوس ہوگیا...... اور پھر آخر تمام شہر ''خیبر'' مسلمانوں کے ہاتھوں فتح ہوگیا، اور رسول اللہ ﷺ اپنے لشکر سمیت کامیاب وکامران واپس مدینہ تشریف لے آئے۔

☆☆☆

الحمدللہ آج بتاریخ ۳/ ذوالحجہ ۱۴۳۴ھ، مطابق ۸/ اکتوبر ۲۰۱۳ء بروز منگل یہ باب مکمل ہوا۔

رَبَّنَا تَقَبَّل مِنَّا اِنّكَ أنتَ السَّمِيعُ العَلِيمُ ، وَتُب عَلَينَا اِنَّكَ أنتَ التَوَّابُ الرَّحِيم

فتحِ مکہ:

مدنی زندگی کے تیسرے دور کا آغاز:

''صلحِ حدیبیہ'' کے بعد تقریباً دوسال امن سے گذرے ، لیکن قریشِ مکہ کو یہ امن پسند نہ آیا......اورانہوں نے عہد شکنی کی،ان کے ایک حلیف قبیلے ''بنوبکر'' نے مسلمانوں کے حلیف قبیلے ''بنوخزاعہ'' پرایک رات اچانک حملہ کردیا، بہت سے لوگوں کوقتل کرڈالا، بے حد نقصان پہنچایا،اور بڑی تعداد میں مویشی (۱) بھی ہنکالے گئے......صلحِ حدیبیہ کی رو سے قریش کوچاہئے تھا کہ وہ اپنے حلیف قبیلےکواس خونریزی اورشرانگیزی سے روکتے ،لیکن ایسا کرنے کی بجائے خودانہوں نے بھی اپنی فطری شرپسندی کا ثبوت دیتے ہوئے جان ومال سے انہیں پوری طرح مددفراہم کی ، جوکہ اس معاہدۂ صلح کی صریح خلاف ورزی تھی اور بہت بڑی عہد شکنی تھی۔

مسلمانوں کے حلیف قبیلے کا ایک وفد مکہ سے سفر کرتا ہوامدینہ پہنچا،رسول اللہ ﷺ کے سامنے اس بارے میں فریاد کی ،اور مدد کا طلبگار رہوا۔

اس پر رسول اللہ ﷺ نے فوری اقدام کے طور پر اپنا ایک قاصد قریشِ مکہ کی جانب روانہ فرمایا،تاکہ وہ انہیں یاددہانی کرائے کہ ان کی یہ حرکت معاہدۂ صلح کی کھلی خلاف ورزی ہے۔

نیز اس موقع پر اس قاصد نے ان کے سامنے وہ تین تجاویز پیش کیں جوکہ رسول اللہ ﷺ

(۱) یہاں یہ وضاحت ہوجائے کہ اصل میں یہ لفظ ''مواشی'' ہے،لیکن چونکہ اردو میں بڑے پیمانے پر ''مویشی'' مشہور چکا ہے......لہٰذا میں نے بھی مویشی ہی لکھنا مناسب سمجھا۔

نے اس قاصد کے ذریعے ان کیلئے بھجوائی تھیں:

☆ پہلی تجویز یہ کہ قریشِ مکہ اپنے حلیف قبیلے کو اس بات پر مجبور کریں کہ وہ مسلمانوں کے حلیف قبیلے کو پہنچنے والے نقصان کی مکمل تلافی کرے اور ''خون بہا'' وغیرہ ادا کرے۔

☆ دوسری تجویز یہ کہ اگر وہ اپنے اس حلیف قبیلے کو نقصان کی تلافی پر مجبور نہیں کر سکتے تو پھر ان سے لاتعلقی اور مکمل براءت و بیزاری کا اعلان واظہار کریں۔

☆ اگر وہ ان مذکورہ دونوں تجویزوں میں سے کسی پر بھی عمل نہیں کرتے تو پھر تیسری اور آخری تجویز یہ کہ اس معاہدۂ صلح کو ختم کر دیا جائے...... کیونکہ جس صلح کی نہ تو کوئی پابندی ہو' اور نہ ہی اس کا کوئی فائدہ ہو...... تو پھر ایسی صلح کا کیا فائدہ......؟ کہ جس کی پابندی ہی نہیں کرنی۔

قریشِ مکہ نے اس قاصد کی زبانی رسول اللہ ﷺ کی طرف سے پیش فرمودہ یہ تینوں تجاویز سنیں، اور تب انہوں نے گھمنڈ میں آ کر تیسری تجویز قبول کی، یعنی معاہدۂ صلح کے خاتمے کا اعلان کر دیا، اور قاصد کو یہ کہتے ہوئے واپس چلے جانے کو کہا کہ ''آج کے بعد ہماری تمہاری صلح ختم......'' اس کا صریح مطلب یہ تھا کہ اب مشرکینِ مکہ کی طرف سے مسلمانوں کیلئے دوبارہ یہ ''اعلانِ جنگ'' تھا۔(۱)

رسول اللہ ﷺ کا قاصد واپس مدینہ پہنچا، اور رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر تمام صورتِ حال سے مطلع کیا...... اس پر آپؐ نے بھی اپنے جان نثار صحابۂ کرام کو جنگ کیلئے تیاری کا حکم دیا، اور پھر سن آٹھ ہجری میں جب رمضان کا مبارک مہینہ چل رہا تھا...... تب

(۱) اور یوں مدنی زندگی کا دوسرا دور جس کی ابتداء ''صلحِ حدیبیہ'' سے ہوئی تھی' دو سال جاری رہنے کے بعد اپنے اختتام کو پہنچا، اور اب تیسرے اور آخری دور کا آغاز ہوا۔

رسول اللہ ﷺ دس ہزار جاں نثاروں پر مشتمل لشکر کی قیادت کرتے ہوئے مدینہ سے مکہ کی جانب محوِسفر ہو گئے۔

اور جب یہ لشکر سینکڑوں میلوں کی طویل مسافت طے کرنے کے بعد مکہ کے مضافات میں پہنچا، تب مشرکینِ مکہ نے اس خدائی فوج کا جوش وجذبہ اور جاہ وجلال دیکھا......تو وہ حیران وپریشان اور دم بخود رہ گئے، انہیں اپنی آنکھوں پر یقین ہی نہیں آرہا تھا......اور تب انہیں اس لشکر کا مقابلہ کرنے کی، یا آگے بڑھ کر کسی قسم کی مزاحمت یا مقابلہ کرنے کی جرأت ہی نہ ہوسکی......اور یہ خدائی فوج اندرونِ مکہ کی جانب مسلسل پیش قدمی کرتی چلی گئی۔

رسول اللہ ﷺ آج مکہ میں فاتح کی حیثیت سے داخل ہورہے تھے، آٹھ سال قبل آپؐ جہاں سے خفیہ طور پر انتہائی کسمپرسی و بےبسی کے عالم میں نکلے تھے......آج وہاں عظیم فاتح وغالب کی حیثیت سے داخل ہوتے وقت کوئی جشنِ فتح نہیں تھا......کوئی جوشِ انتقام نہیں تھا......کوئی دھوم دھڑکا نہیں تھا......کوئی شادیانے نہیں بج رہے تھے......کوئی فخر نہیں تھا......کوئی غرور نہیں تھا......اور کوئی لوٹ مار نہیں تھی......وہاں تو بس یہ کیفیت تھی کہ......آپؐ اپنے رب کے سامنے انتہائی خشوع وخضوع کا مظاہرہ کرتے ہوئے......اور اپنے رب کی تسبیح اور حمد وثناء بیان کرتے ہوئے......آگے بڑھ رہے تھے، اور اس قدر عجز وانکسار تھا کہ بار بار آپؐ کی پیشانی مبارک آپؐ کی اونٹنی کی گردن سے ٹکرانے لگتی تھی......(۱)

(۱) اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کی طرف سے اس عظیم نعمت اور اتنی بڑی فتح کے موقع پر کہ جسے قرآن کریم میں ''فتحِ مبین'' کے نام سے یاد کیا گیا......اس موقع پر آپؐ کا اپنے رب کے سامنے اس قدر عجز وانکسار اور خشوع وخضوع......یقیناً اس میں امت کیلئے بھی یہ اہم ترین سبق ہے کہ جس قدر اللہ کی طرف سے نعمتوں کا سلسلہ بڑھتا جائے اسی قدر بندۂ مؤمن کی گردن بھی اپنے خالق ومالک کے سامنے جھکتی چلی جائے......اور اسی قدر اس منعم ومحسن کی عبادت اور اطاعت وفرمانبرداری کا جذبہ بڑھتا چلا جائے......

اس کیفیت میں آپؐ اپنے جاں نثار ساتھیوں کی معیت میں مکہ شہر میں داخل ہوئے......
اوراس موقع پر مکہ شہر کے گلی کوچوں سے گذرتے وقت آپؐ نے اعلان فرمایا ''جوکوئی اپنے گھر کا دروازہ بند رکھے گا' اُس کیلئے امان ہے، جوکوئی بغیر ہتھیار کے خالی ہاتھ نظر آئے گا اس کیلئے بھی امان ہے، جوکوئی کعبۃ اللہ میں داخل ہوجائے' اس کیلئے بھی امان ہے''۔
اس موقع پر سردارانِ قریش میں سے مشہور شخصیت ابوسفیان نے دینِ اسلام قبول کرنے کا اعلان کیا، تب رسول اللہ ﷺ نے شہر مکہ میں ان کے مقام ومرتبے کا لحاظ کرتے ہوئے ان کی دلجوئی کی خاطر یہ اعلان بھی فرمایا کہ ''جوکوئی ابوسفیان کے گھر میں داخل ہوجائے' اس کیلئے بھی امان ہے''۔
قابلِ غور ہے یہ بات کہ فتحِ مکہ کے اس تاریخی موقع پر کہ جب رسول اللہ ﷺ مکمل بااختیار اور غالب وفاتح تھے......جبکہ قریشِ مکہ مغلوب ولاچار تھے......لیکن اس کے باوجود آپؐ نے اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے کوئی ایسا اعلان نہیں کیا کہ '' آج جوکوئی مسلمان ہوجائے' فقط اسی کیلئے امان ہے......''ایسی کوئی دھمکی نہیں دی کہ '' آج جان بچانے کا بس ایک ہی طریقہ ہے کہ سب مسلمان ہوجاؤ......'' بلکہ بس یہ فرمایا کہ جوکوئی اپنے گھر کا دروازہ بند رکھے...... یا بغیر ہتھیار کے نظر آئے......اس کیلئے امان ہے......یعنی جوہمیں تنگ نہیں کرے گا......ہم بھی اسے تنگ نہیں کریں گے......!!
☆......اس موقع پر رسول اللہ ﷺ کے جاں نثار ساتھیوں میں سے جومہاجرین تھے کہ جن کا اصل وطن یہی شہر مکہ ہی تھا، آج وہ آٹھ سال بعد اپنے وطن' اپنے شہر' اور اپنے آباؤاجداد کے گھروں کو دیکھ رہے تھے...... جہاں وہ پیدا ہوئے...... جہاں کھیلے کودے...... جہاں بچپن گذارا......اور پھر آج سے آٹھ سال قبل انتہائی بے سروسامانی اور کسمپرسی کی کیفیت میں

مجبورولا چار......سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر......بس خالی ہاتھ......چل دیئے تھے......یوں پرانی یادیں تازہ ہوگئیں......اوران کے دل بھر آئے......مگراس موقع پران سب نے مکمل نظم وضبط کا مظاہرہ کیا......جذبات کی شدت کے باوجودان میں سے کسی نے آگے بڑھ کر یہ تقاضا نہیں کیا کہ یہ میرا اپنا گھر......اب میرے حوالے کردیا جائے......کسی نے اپنے آبائی گھر......زمین جائیداد......یامال واسباب کی واپسی کا کوئی مطالبہ نہیں کیا......اب ان کیلئے اللہ اوراس کے رسول ﷺ کی محبت اوراطاعت وفرمانبرداری ہی سب سے بڑی دولت تھی......!

☆......اسی طرح شہرمکہ کے ان گلی کوچوں سے گذرتے ہوئے انہیں ہجرت سے پہلے کا وہ دوربھی یادآیا......مشرکینِ مکہ کی طرف سے وہ بدسلوکیاں......وہ اذیت رسانیاں......کس طرح ان ظالموں اوروحشیوں نے انہیں تیرہ سال مسلسل اپنے ظلم وستم کا نشانہ بنائے رکھا......ان کے ظلم وستم کی ایک ایک داستان......اورایک ایک نقش ابھرکر......آج ان کی آنکھوں کے سامنے گھومنے لگا......مگراس کے باوجود......آج تمامتر قدرت کے باوجود......انہوں نے کسی سے کوئی انتقام نہیں لیا......کوئی قتل وغارتگری نہیں مچائی......کوئی لوٹ کھسوٹ کا بازارگرم نہیں کیا......

☆......رسول اللہ ﷺ اپنے جاں نثار ساتھیوں کے ہمراہ اسی طرح مسلسل پیش قدمی کرتے رہے......حتیٰ کہ آخری منزل یعنی ’’بیت اللہ‘‘ تک جاپہنچے......وہاں پہنچنے کے بعد آپؐ نے رُک کر اِدھراُدھر نگاہ دوڑائی......تب کیا منظر نظرآیا......؟ ہرطرف وہی پرانے چہرے......بڑے بڑے مجرم......خونی اورقاتل......وہی پرانے دشمن......آج بے بس......شرمندہ......سرجھکائے ہوئے اورنگاہیں نیچی کئے ہوئے نظرآئے......یہ وہی لوگ جوآپ ﷺ

کے خون کے پیاسے تھے...... جانی دشمن تھے...... جنہوں نے مکہ میں آپؐ کے قتل کی سازش کی...... آپؐ کے ساتھیوں کے ساتھ ہر قسم کا ظلم روا رکھا...... ہر قسم کی بدسلوکی کیلئے انہیں تختۂ مشق بنائے رکھا...... اور پھر جب آپؐ نیز آپؐ کے ساتھی اپنے آبائی شہر مکہ کو...... نیز اپنے آبائی گھروں کو چھوڑ کر پناہ کی تلاش میں ان مشرکینِ مکہ سے بہت دور چلے گئے...... ایک نئی جگہ...... اجنبی اور نامانوس جگہ...... تب وہاں سینکڑوں میل دور مدینہ میں بھی ان مشرکینِ مکہ نے ان مسلمانوں کے خلاف اپنی شرارتوں ...... اپنی سازشوں...... اور ایذاء رسانیوں کا سلسلہ جاری رکھا...... وہاں مدینہ جا کر ان پر جنگیں مسلط کرتے رہے، انہیں نیست و نابود کر ڈالنے کے منصوبے بناتے رہے، وہاں اندرونی چھپے ہوئے دشمنوں اور منافقوں کے ساتھ مل کر یہ بیرونی دشمن ہمیشہ ریشہ دوانیوں میں مشغول و منہمک رہے......

اور اس سے بھی قبل جب نبوت کے پانچویں سال ان کے ظلم و ستم سے تنگ آکر پناہ کی تلاش میں بہت سے مسلمان مکہ سے بہت دور ملکِ حبشہ میں جا بسے تھے...... تب بھی یہ مشرکینِ مکہ وہاں اپنے وفود بھیجتے رہے...... وہاں کے بادشاہ کو مسلمانوں کے خلاف مسلسل بھڑکاتے اور ورغلاتے رہے...... تاکہ وہ دوبارہ ان مسلمانوں کو ان ظالموں کے حوالے کر دے......

☆...... رسول اللہ ﷺ ہجرت سے قبل مکہ میں قیام کے دوران کس قدر محبت، نرمی، اور پیار کے ساتھ تیرہ سال مسلسل انہیں اللہ کے دین کی طرف بلاتے رہے...... تیرہ سال مسلسل ان پر ''اخلاق کے پھول'' برساتے رہے...... جبکہ جواب میں یہ مشرکینِ مکہ تو بس ہمیشہ پتھر ہی برساتے رہے تھے......

لیکن اس کے باوجود اب فتحِ مکہ کے اس یادگار اور تاریخی موقع پر رسول اللہ ﷺ نے تمام تر قدرت اور اختیار کے باوجود...... ان بدترین دشمنوں اور مجرموں سے کوئی انتقام یا کوئی سزا

تو در کنار......انہیں کوئی ملامت تک نہیں کی......

''عفوودرگذر'' کی تعلیم دینا بہت آسان ہے،لیکن عملی زندگی میں ان تعلیمات کو اپنانا......اپنے قاتلوں' بدخواہوں' اورستانے والوں کو مکمل قدرت واستطاعت کے باوجود یوں کسی ملامت کے بغیر معاف کردینا......یقیناً یہ توبس ''نبیٔ رحمت'' ہی کی شان تھی......''عفوودرگذر'' کے باب میں ایسی روشن مثال دنیا کی تاریخ میں کہیں اورنہیں مل سکے گی......!

فتحِ مکہ کے اس تاریخی موقع پر رسول اللہ ﷺ کی طرف سے اپنے بدترین دشمنوں کے ساتھ اس ''حسنِ سلوک'' سے یہ حقیقت بھی واضح وثابت ہوتی ہے کہ دینِ اسلام تلوار کے زور سے نہیں پھیلا......رسول اللہ ﷺ نے تلوار چلا چلا کر......اورتلوار کی نوک سے ڈرا ڈرا کر کسی کو مسلمان نہیں بنایا...... یہ دین تو آپؐ کی شب وروز اورصبح وشام دعوتی واصلاحی کوششوں سے......نیز آپؐ کے ''حسنِ اخلاق'' سے......مشرق ومغرب میں اوردنیا کے کونے کونے میں پھیلا ہے......

ہاں البتہ دشمنوں نے ہمیشہ تلوار کے ذریعے دینِ اسلام کا راستہ روکنے کی مذموم کوششیں کیں......مگر......دینِ اسلام تلوار کے مقابلے میں ہمیشہ پھلتا پھولتا ہی رہا......اگر دینِ اسلام تلوار کے زور سے پھیلا ہوتا......توفتحِ مکہ کے موقع پر ان تمام بدترین دشمنوں کو تہِ تیغ کرنے کیلئے ......اور......ان کے سرقلم کرنے کیلئے ......رسول اللہ ﷺ کی طرف سے فقط ایک اشارہ ہی بہت کافی تھا......لیکن ایسا نہیں ہوا......اس کے برعکس آپؐ نے اس موقع پر اپنے عمل سے ہمیشہ کیلئے دنیا کو بتادیا کہ دینِ اسلام ''دینِ رحمت'' ہے۔

☆......انصارِ مدینہ کی تشویش......اور پھر مسرت......:

فتحِ مکہ کے بعد رسول اللہ ﷺ متعدد دنوں تک مکہ میں ہی مقیم رہے، ایک روز آپؐ بیت اللہ کے قریب اپنے دونوں ہاتھ بلند کئے ہوئے......انتہائی خشوع وخضوع اور انہماک کے ساتھ اپنے رب کے ساتھ دعاء ومناجات میں مشغول تھے، اس موقع پر وہاں موجود صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین میں سے کچھ انصارِ مدینہ بھی تھے، جو بڑی ہی عقیدت ومحبت کے ساتھ انتہائی والہانہ انداز میں آپؐ کی جانب دیکھ رہے تھے......دنیاومافیہا سے بے خبر......بس اسی نظارے میں محو تھے......انہیں یہ منظر بہت ہی اچھا لگ رہا تھا......اور وہ دل ہی دل میں رسول اللہ ﷺ کی اس کیفیت پر......اور اس ادا پر...... فدا ہوئے جا رہے تھے......کہ اچانک اسی لمحے ان میں سے کسی کے دل میں یہ خیال آیا کہ مکہ تو رسول اللہ ﷺ کا آبائی شہر ہے، جو کہ اب فتح ہو چکا ہے، اپنے آبائی شہر اور آبائی وطن سے محبت اور اس کے ساتھ جذباتی تعلق تو ہر انسان کیلئے فطری چیز ہے......کہیں اب ایسا نہ ہو کہ رسول اللہ ﷺ سوچیں کہ ''میرا اپنا شہر تو اب فتح ہو چکا، لہٰذا اب واپس مدینہ جانے کی بجائے یہیں مستقل قیام کر لیا جائے......''اور تب ہمارا کیا بنے گا......؟ ہمارا کیا حال ہوگا......؟ رسول اللہ ﷺ کی جدائی کا دکھ ہم کس طرح سہہ سکیں گے......؟

دل میں یہ خیال آتے ہی وہ شخص پریشان ہو گیا......کچھ تردد کے بعد اس نے اپنے برابر والے کے ساتھ سرگوشی کے انداز میں اپنی اس پریشانی کا اظہار کیا......تب وہ بھی پریشان اور اداس ہو گیا......اس نے کسی اور کے ساتھ سرگوشی کی......اور یوں حضرات انصار جو تھوڑی دیر قبل تک رسول اللہ ﷺ کی اس ادا پر فریفتہ ہوئے جا رہے تھے......اور بہت زیادہ مسرور نظر آ رہے تھے......اب یک بیک وہ سب اداس ہو گئے......اور یہی بات سوچ کر

اب ان کی آنکھیں ڈبڈبانے لگیں......

رسول اللہ ﷺ جو ابتک اپنی اسی کیفیت کے ساتھ دعاء ومناجات میں مشغول تھے، جب حضرات انصار کی سرگوشیاں کچھ بڑھ گئیں......تو آپؐ نے مڑ کر پیچھے کی جانب دیکھا، اوران کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے دریافت فرمایا کہ کیا بات ہے......؟ اس پر وہ سب گھبرا گئے اور یوں کہنے لگے کہ اے اللہ کے رسول! کوئی بات نہیں ہے......ہم تو بس یوں ہی آپس میں کچھ بات چیت کر رہے تھے......لیکن رسول اللہ ﷺ ان کے چہروں پر پھیلی ہوئی اداسی ......اوران کی آنکھوں سے چھلکتے ہوئے آنسو......دیکھ چکے تھے......لہٰذا آپؐ نے بار بار اصرار فرمایا کہ مجھے بتاؤ......کیا معاملہ ہے......؟ آخر ڈرتے ڈرتے ان انصارِ مدینہ نے اپنے اس خدشے کا اظہار کیا......تب رسول اللہ ﷺ نے ان کی جانب دیکھتے ہوئے تبسم فرمایا......اور پھر انہیں مخاطب کرتے ہوئے یہ تاریخی جملہ ارشاد فرمایا: ''اے جماعتِ انصار! میرا جینا مرنا......تمہارے ہی ساتھ ہے......'' رسول اللہ ﷺ کی زبانِ مبارک سے یہ جملہ سننے کے بعد وہ انصاری حضرات خوشی سے سرشار ہوگئے......گویا ان کے دل جھوم جھوم اٹھے ہوں......اورتھوڑی ہی دیر قبل تک غم اور پریشانی کی وجہ سے ان کی جو آنکھیں ڈبڈبا رہی تھیں......اب انہی آنکھوں میں ''خوشی کے آنسو'' چھلکنے لگے......!!

الحمدللہ آج بتاریخ ۷/ ذوالحجہ ۱۴۳۴ھ، مطابق ۱۲/ اکتوبر ۲۰۱۳ء بروز ہفتہ یہ باب مکمل ہوا۔

رَبَّنَا تَقَبَّل مِنَّا اِنّکَ أنتَ السَّمِيعُ العَلِيمُ ، وَتُب عَلَينَا اِنَّكَ أنتَ التَوَّابُ الرَّحِيم

غزوۂ حُنین:

ماہِ رمضان المبارک سن آٹھ ہجری میں ''فتحِ مکہ'' کا اہم ترین تاریخی واقعہ پیش آیا، اس کے فوری بعد جب رسول اللہ ﷺ اپنے جاں نثار ساتھیوں سمیت ابھی مکہ میں ہی مقیم تھے کہ ماہِ شوال میں ''غزوۂ حنین'' کی نوبت آئی۔

اس غزوے کے موقع پر چونکہ بہت سے عجیب وغریب اور بالکل غیر متوقع قسم کے حالات وواقعات پیش آئے، اس لئے مفسرین ومحدثین، نیز مؤرخین نے اس واقعے کو بڑی تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے، اس تمامتر تفصیل کا خلاصہ یوں بیان کیا جاسکتا ہے:

☆......مکہ سے تقریباً ساٹھ میل (سوکلومیٹر) کے فاصلے پر مشہور تاریخی شہر ''طائف'' آباد ہے، اُس دور میں طائف نیز اس کے مضافات میں چھوٹے بڑے بہت سے مشرک قبائل آباد تھے، جن میں سے بالخصوص ''ہوازن'' اور ''ثقیف'' نامی دو قبیلے بہت معروف تھے اور انتہائی طاقتور بھی تھے، فتحِ مکہ کے فوری بعد ان قبائل کو یہ اندیشہ لاحق ہوا کہ ایسا نہ ہو کہ فتحِ مکہ کے بعد اب مسلمان ان کی طرف متوجہ ہوجائیں اور ان پر حملہ آور ہوجائیں......

لہٰذا اس اندیشے کی وجہ سے ان کے ذمے دار اور بااثر قسم کے لوگ باہم مشاورت میں مشغول ہوگئے، اور اس بارے میں خوب غور وفکر کے بعد آخر انہوں نے یہ فیصلہ کیا کہ بجائے اس کے کہ مسلمان خوب بے فکر اور بے غم ہوکر ہم پر حملے کے منصوبے بناتے رہیں اور پھر اپنی پسند اور مرضی کے مطابق جب مناسب سمجھیں ہمارے سروں پر آدھمکیں......قبل اس کے کہ ایسی نوبت آئے، ہمیں چاہئے کہ ہم خود آگے بڑھ کر مسلمانوں پر بھرپور طریقے

سے حملہ آور ہو جائیں......اور پھر بڑے زور وشور کے ساتھ ہنگامی طور پر انہوں نے اس حملے کی تیاری شروع کردی۔

☆......اُن دنوں ''مالک بن عوف'' نامی ایک شخص ان کا سپہ سالار تھا، جوکہ بہت جوشیلا اور طاقتور قسم کا انسان تھا، اُس وقت وہ جوان تھا، تیس سال عمر تھی، لہٰذا ''ہوازن'' و ''ثقیف'' ودیگر متعدد چھوٹے بڑے قبائل کی طرف سے مشترکہ طور پر مسلمانوں کے خلاف اس حملے کے سلسلے میں وہی سب سے زیادہ بڑھ چڑھ کر گرمجوشی اور بیتابی کا مظاہرہ کر رہا تھا، البتہ یہ کہ اس میں جوش تو بہت زیادہ تھا، لیکن ہوش اور تجربے کی کمی تھی......بہت سے تجربہ کار افراد نے اسے اس بارے میں سمجھانے کی بہت کوشش کی، لیکن اس جوشیلے انسان نے کسی کی ایک نہ سنی، ان میں دُرَید بن الصُّمہ نامی ایک شخص جوکہ کافی عمر رسیدہ تھا اور بہت زیادہ تجربہ کار بھی تھا اور اس سے قبل مختلف جنگوں کے مواقع پر وہ ان قبائل کے سپہ سالار کی حیثیت سے بھی فرائض انجام دے چکا تھا......آخر اس نے مالک بن عوف سے ملاقات کی، اور اسے مسلمانوں کے خلاف جنگ چھیڑنے سے باز رہنے کی تلقین کی، کیونکہ بقول اس کے مسلمان اب بہت زیادہ طاقتور ہو چکے تھے، لہٰذا اب ان کے ساتھ چھیڑ چھاڑ اور دشمنی مول لینا کسی صورت مناسب نہیں تھا، مزید اس نے یہ اصرار بھی کیا کہ جب تک ہمیں مسلمانوں کی طرف سے جارحیت کے ٹھوس قرائن وشواہد نظر نہ آئیں اُس وقت تک یہ بات ہرگز ہمارے حق میں نہیں ہے کہ ہم خود ان پر حملہ آور ہو کر اپنے لئے بہت بڑا خطرہ مول لیں......

لیکن مالک نے نہ تو اس کی بزرگی اور تجربہ کاری کا کوئی لحاظ کیا......اور نہ ہی اس کی نصیحت کو قابلِ توجہ سمجھا......آخر اُس شخص نے مالک کی اس بے اعتنائی پر خفگی کا اظہار کرتے ہوئے

کہا کہ ''مالک! میری یہ بات یادرکھنا...... کہ مسلمانوں کے خلاف تم یہ جنگ کبھی نہیں جیت سکتے......''اس پر مالک اورزیادہ بگڑ گیا،اس نے اس عمررسیدہ شخص کا......اوراس کے ہمنواؤں کا مذاق اڑایااورانہیں بزدلی کا طعنہ بھی دیا......اوراپنے جنگ کے اس فیصلے پر قائم رہا۔

نیزاس موقع پر مالک نے یہ بھی کہا کہ ''ان مسلمانوں کو کیاخبرکہ جنگ کس طرح لڑی جاتی ہے......؟ انہوں نے تو ابتک کوئی جنگ لڑی ہی نہیں ہے......کیونکہ ابتک جو ہوا وہ محض دکھاوااورکھیل تماشا تھا...... یہ مسلمان دراصل مکہ ہی کے باشندے تھے......اوران کے مقابلے میں مشرکین بھی مکہ ہی کے باشندے تھے......دونوں کا تعلق قبیلہ ''قریش'' سے تھا، آپس میں رشتے داریاں تھیں اور ہمدردیاں تھیں......اس لئے بس دکھاوے کیلئے یہ آپس میں جھوٹ موٹ کی جنگیں لڑتے رہے......اب ہم سے جب ٹکر ہوگی......تب انہیں پتہ چلے گا کہ جنگ کیا چیز ہوتی ہے......؟''

اورپھر مزید یوں بھی کہنے لگا کہ ''یہ مسلمان تو مکہ سے ہی گئے تھے......اوراب اپنے ہی شہرمکہ واپس آگئے ہیں...... بھلا یہ بھی کوئی جنگ ہوئی......؟اپنے ہی شہرسے گئے تھے...... اوراپنے ہی شہرواپس آگئے......؟

اورپھرشب وروزکی تیاری کے بعد چوبیس ہزارجنگجوؤں پرمشتمل لشکرِجرارتیارکیا گیا،اس موقع پران کے سپہ سالارمالک بن عوف نے یہ حکم جاری کیا کہ محاذِجنگ پرروانگی کے وقت ہرشخص اپنے اہل وعیال'سونے چاندی کے زیورات' اموال واسباب'نیزاپنے تمام مویشیوں سمیت جنگ کیلئے روانہ ہوگا،تا کہ دورانِ جنگ ہرکوئی مکمل استقامت وبہادری کے ساتھ اورخوب ڈٹ کر......جان توڑطریقے سے لڑے......صورتِ حال کتنی ہی نازک

کیوں نہ ہو جائے......مگر یہ سوچ کر کسی کو میدانِ جنگ سے بھاگنے کی جرأت نہ ہو کہ " آج اگر میں بھاگ کھڑا ہوا تو میرے بعد میرے بیوی بچوں کا کیا بنے گا......؟ یہ تو دشمن کے ہاتھ لگ جائیں گے......پھر نہ جانے ان کے ساتھ کیا سلوک ہو گا......؟ " اور یوں اس کے اپنے ہی بیوی بچے اور اموال واسباب اس کیلئے قدموں کی زنجیر بن جائیں۔

اس موقع پر دُرید بن الصِّمہ نامی اُس تجربہ کار اور عمر رسیدہ جنگجو نے دوبارہ اپنے جوان اور جوشیلے سپہ سالار مالک بن عوف سے ملاقات کر کے اسے یہ سمجھانے کی بہت کوشش کی کہ میدانِ جنگ میں اگر صورتِ حال نازک شکل اختیار کر گئی تو ایسے میں بھاگتے ہوئے اور شکست خوردہ سپاہی کو شاید تلوار اور نیزے سے تو کچھ فائدہ پہنچ سکے......لیکن بیوی بچوں سے اسے کیا فائدہ پہنچ سکے گا......؟ بلکہ ایسے نازک موقع پر تو وہ مزید دردِ سر بن جائیں گے......ایسے میں بے چارہ سپاہی اپنی فکر کرے گا......یا بیوی بچوں کی......؟

لیکن جوان اور جوشیلا سپہ سالار حسبِ معمول اس بار بھی اس تجربہ کار اور سمجھدار بوڑھے جنگجو کی بات کو لمحہ بھر کیلئے بھی خاطر میں نہ لایا......اور یوں مسلمانوں کو ہمیشہ کیلئے نیست و نابود کر ڈالنے کا عزم لئے ہوئے اپنے لشکرِ جرار کی قیادت کرتا ہوا طائف سے مکہ کی جانب رواں دواں ہو گیا۔

اُدھر مکہ میں جب رسول اللہ ﷺ کو ہوازن اور ثقیف کے ان خطرناک عزائم کے بارے میں علم ہوا تو آپؐ نے بھی یہ فیصلہ فرمایا کہ یہاں مکہ میں بیٹھ کر دشمن کا انتظار کرنے کی بجائے ہمیں بھی دشمن کی جانب کوچ کرنا چاہئے تا کہ یہاں تک پہنچنے سے قبل ہی اس کا راستہ روکا جاسکے۔

چنانچہ سن آٹھ ہجری میں بتاریخ ۶/ شوال رسول اللہ ﷺ اپنے لشکر کی قیادت کرتے ہوئے

مکہ سے طائف کی جانب رواں دواں ہوگئے، یہ لشکر آپ ﷺ کے اُن دس ہزار جاں نثار ساتھیوں پر مشتمل تھا جو مدینہ سے ہی فتحِ مکہ کے موقع پر آپؐ کے ہمراہ آئے تھے، جن میں مہاجرین وانصار دونوں شامل تھے، مزید یہ کہ فتحِ مکہ کے موقع پر بڑی تعداد میں مکہ کے باشندوں نے دینِ اسلام قبول کیا تھا، اب ان میں سے بھی دو ہزار افراد اس لشکر میں شامل ہوگئے تھے، یوں اب یہ اسلامی لشکر کل بارہ ہزار افراد پر مشتمل تھا۔

مکہ سے روانگی کے بعد ''حُنین'' نامی مقام پر دونوں لشکروں کا آمنا سامنا ہوگیا، اس موقع پر باقاعدہ اور بھرپور جنگ کے آغاز سے قبل یہ صورتِ حال پیش آئی کہ یہاں پہاڑی درّوں اور تنگ وتاریک پہاڑی راستوں میں بہت بڑی تعداد میں دشمن کے تیرانداز چھپے بیٹھے تھے، وہ اسی موقع کے انتظار میں یہاں چھپے بیٹھے تھے کہ مسلمانوں کا لشکر جب یہاں پہنچے گا تو اس پر ان تنگ وتاریک راستوں میں اچانک تیروں کی برسات کردی جائے گی...... چنانچہ مسلمان جب ان تنگ وتاریک اور انتہائی دشوار گذار اور خطرناک قسم کے پہاڑی راستوں سے گذر رہے تھے......تب وہاں چھپے ہوئے دشمنوں نے منصوبے کے عین مطابق اچانک ان پر بہت بڑے پیمانے پر تیراندازی شروع کردی......جس کی وجہ سے مسلمان فوری طور پر سنبھل نہ سکے، پریشان اور منتشر ہوکر اِدھر اُدھر بھاگنے لگے......اتنا بڑا لشکر...... بارہ ہزار اِس طرف......چوبیس ہزار اُس طرف......اور پھر لاتعداد اور بے شمار اونٹ گھوڑے اور دیگر مویشی جو کہ وہ طائف والے اپنے سپہ سالار کے حکم پر اپنے ہمراہ لائے تھے......اب یہ سب سرپٹ اِدھر اُدھر دوڑتے ہوئے تباہی پھیلانے لگے......اس تمامتر بدنظمی، افراتفری، انتشار اور بھاگ دوڑ کے نتیجے میں اس قدر گرد وغبار اُڑا......کہ دن کے وقت رات کا گمان ہونے لگا......اور ہر طرف اندھیرا چھا گیا......جو کہ مسلمانوں کیلئے مزید

پریشانی وسراسیمگی کا سبب بنا......آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ رابطہ بھی برقرار نہ رہ سکا......اوریوں وہ سب ایک دوسرے سے بے خبر......ان انجان اورگمنام راستوں میں اِدھراُدھربکھر گئے......

اس موقع پررسول اللہ ﷺ نے بار بار بآوازِ بلند اپنے پرانے ساتھیوں کوپکارا کہ ''یہاں چلے آؤ......میں یہاں ہوں''

مزید یہ کہ اس نازک ترین صورتِ حال میں کہ جب رسول اللہ ﷺ کے ساتھیوں میں سے محض اکادکا چندافراد آپؐ کے ہمراہ تھے......اوراس نادرموقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے آپؐ تک رسائی دشمن کیلئے بہت آسان تھی ......ایسے میں آپؐ دشمن سے خوفزدہ ہونے اور چھپنے کی بجائے......بار بار بآوازِ بلند یہ اعلان فرماتے رہے'' أناالنبی لاکذب''یعنی ''میں سچا نبی ہوں......اوراس بات میں کوئی جھوٹ نہیں ہے''۔

اس پُراسراراوروحشتناک ماحول میں رسول اللہ ﷺ کی یہ صداجب بار بارفضامیں بلند ہوئی اورآپؐ کی مبارک آواز جب آپؐ کے جاں نثارساتھیوں کی سماعت سے ٹکرائی توان کے شعوروو جدان پرعجب کیفیت طاری ہوگئی،ان کے دلوں میں ایک نیاولولہ اور نیاجذبہ پیدا ہوا،جولوگ سراسیمہ 'بدحواس' اورمنتشر ہوچکے تھے اب وہ ''لبیک......لبیک'' کی صدائیں بلند کرتے ہوئے دیوانہ واراُس جانب بڑھنے لگے کہ جہاں سے یہ آواز آرہی تھی......

نیزاس موقع پرآپؐ کے چچاحضرت عباس بن عبدالمطلب رضی اللہ عنہ بھی آپؐ کے ہمراہ تھے،جن کی آوازقدرتی طورپرکافی بلندتھی،آپؐ کے ساتھ اب وہ بھی باربارمسلمانوں کو بآوازِ بلند پکارپکارکرآگاہ کرنے لگے کہ ''اِدھرآؤ......رسول اللہ ﷺ یہاں ہیں''۔

آخران حضرات نے رسول اللہ ﷺ کے اردگرد جمع ہوکراپنی صفوں کودوبارہ منظّم کیا،اورپھر

ایسا زوردار حملہ کیا کہ دشمن کے پاؤں اکھڑ گئے، اور وہ اپنی تمامتر قوت اور عددی برتری کے باوجود ہزیمت کے داغ دل پر لئے ہوئے ......میدان چھوڑ کر یوں بھاگا......کہ پھر پلٹ کر پیچھے نہیں دیکھا......!

☆......اس جنگ کے موقع پر دشمن فوج کا وہ انتہائی جوشیلا اور جذباتی قسم کا سپہ سالار ''مالک بن عوف'' جو کہ دراصل اس جنگ کا سرغنہ تھا، اور اس تمامتر مصیبت اور لشکر کشی کا اصل سبب اور اصل محرک تھا......اب جنگ کے اختتام پر رسول اللہ ﷺ نے اس کے بارے میں دریافت فرمایا کہ اُس کا کیا بنا؟ کیا وہ مارا گیا؟ یا کہیں زندہ سلامت موجود ہے......؟ چنانچہ اس کے انجام کے بارے میں معلومات حاصل کی گئیں، اور تحقیق وجستجو کے بعد یہ بات معلوم ہوئی کہ جب اسے اپنی شکست یقینی نظر آنے لگی تھی تب وہ میدان چھوڑ کر بھاگ کھڑا ہوا تھا، اور یہ کہ اب وہ طائف میں کسی جگہ روپوش ہے۔

یہ اطلاع ملنے پر رسول اللہ ﷺ نے اس کی تلاش کا اور اس تک یہ پیغام پہنچانے کا حکم دیا کہ ''اگر وہ مسلمان ہوجائے تو اسے معاف بھی کر دیا جائے گا، نیز یہ کہ بڑی مقدار میں اس کا جو مال واسباب مسلمانوں کے ہاتھ لگا ہے' وہ بھی اسے لوٹا دیا جائے گا''۔ چنانچہ اسے تلاش کیا گیا، اور پھر آپ ﷺ کی طرف سے یہ پیغام بھی اس کے گوش گذار کر دیا گیا، جس پر وہ مکہ کے قریب ''جعرانہ'' کے مقام پر رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا، اور قبولِ اسلام کا اعلان کیا، تب آپ ﷺ نے نہ صرف یہ کہ حسبِ وعدہ اسے معاف فرمایا......اس کا تمام مال واسباب اسے لوٹایا......بلکہ اس کے علاوہ یہ کہ اسے مزید سواونٹ بھی عطاء فرمائے......آپ ﷺ کی اس خوش اخلاقی وفیاضی سے مالک بن عوف انتہائی متأثر ہوا اور وقتاً فوقتاً آپ ﷺ کی مدح میں قصیدے کہتا رہا......اس سلسلے میں اس کے متعدد قصائد مشہور' نیز

کتبِ تاریخ میں مذکور ہیں(مثلاً: اُسد الغابۃ فی معرفۃ الصحابۃ،حرف المیم ۔۴۶۲۶)

اور یوں وہ جوشیلا سپہ سالار جو کہ اب تک محض مالک بن عوف تھا......اب وہ رسول اللہ ﷺ کے جاں نثار صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اُجمعین میں شامل ہوگیا اور محض ''مالک بن عوف'' کی بجائے اب وہ حضرت مالک بن عوف رضی اللہ عنہ بن گئے۔(۲)

☆......قرآن کریم میں غزوۂ حنین کے موقع پر پیش آنے والی صورتِ حال کا یوں تذکرہ کیا گیا ہے:﴿لَقَد نَصَرَکُمُ اللّٰهُ فِي مَوَاطِنَ کَثِیرَةٍ وَّ یَومَ حُنَینٍ اِذ أَعجَبَتکُم کَثْرَتُکُم فَلَم تُغنِ عَنکُم شَیئاً وَّضَاقَت عَلَیکُمُ الأرضُ بِمَا رَحُبَتْ ثُمَّ وَلَّیتُم مُدبِرِینَ ثُمَّ أَنزَلَ اللّٰهُ سَکِینَتَهٗ عَلَیٰ رَسُولِهٖ وَعَلَی المُؤمِنِینَ وَ أَنزَلَ جُنُوداً لَم تَرَوهَا وَعَذَّبَ الَّذِینَ کَفَرُوا وَذٰلِكَ جَزَاؤُ الکَافِرِینَ ثُمَّ یَتُوبُ اللّٰهُ مِن بَعدِ ذٰلِكَ عَلَیٰ مَن یَّشَآءُ وَاللّٰهُ غَفُورٌ رَّحِیمٌ﴾(۳)

ترجمہ:(یقیناً اللہ نے بہت سے مواقع پر تمہاری مدد کی ہے اور حنین کے دن بھی کہ جب تمہیں اپنی کثرتِ تعداد پر ناز ہونے لگا تھا،لیکن یہ چیز تمہارے کسی کام نہ آئی،اور زمین اپنی کشادگی کے باوجود تم پر تنگ ہوگئی،پھر تم پیٹھ پھیر کر مڑ گئے،پھر اللہ نے اپنی طرف سے تسکین نازل کی اپنے رسول پر اور مؤمنین پر،اور ایسے لشکر بھیجے جنہیں تم دیکھ نہیں رہے تھے (۴)اور کافروں کو پوری سزا دی،ان کافروں کا یہی بدلہ تھا،پھر اس کے بعد بھی اللہ جس پر

(۱)خلیفۂ دوم حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ کے دورِ خلافت میں رومیوں اور فارسیوں کے خلاف لڑی جانے والی بڑی جنگوں کے موقع پر یہی حضرت مالک بن عوف رضی اللہ عنہ ہمیشہ پیش پیش رہے،خصوصاً''جنگ قادسیہ'' کے یادگار موقع پر انہوں نے بڑی خدمات انجام دیں اور اسلامی لشکر کے سپہ سالار حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کی مشاورت ومعاونت کے فرائض بھی انجام دیتے رہے(اُسد الغابہ[۴۶۲۶]وغیرہ)۔

(۲)التوبہ[۲۵-۲۷] (۳)یعنی فرشتوں کا لشکر۔

چاہے اپنی رحمت کی توجہ فرمائے گا، اور اللہ تو بخشنے والا مہربان ہے)

دراصل اس جنگ کے موقع پر ایک قابلِ ذکر صورتِ حال یہ پیش آئی کہ اُس روز مسلمان اپنی کثرتِ تعداد کی وجہ سے بہت خوش تھے، اور ہنسی خوشی نہایت بے فکری کے ساتھ مکہ سے میدانِ جنگ کی طرف رواں دواں تھے، اگرچہ انہیں اس بات کا خوب علم تھا کہ دشمن کی تعداد چوبیس ہزار ہے...... جبکہ یہ خود بارہ ہزار تھے...... لیکن اس کے باوجود بہت ہی مسرور و مطمئن تھے، کیونکہ اتنی بڑی تعداد پہلے کبھی نہیں ہوئی تھی، پہلے تو ہمیشہ مسلمانوں کی تعداد اس سے بھی کم ہی رہی تھی، مثلاً غزوۂ بدر کے موقع پر مسلمان صرف تین سو تیرہ تھے اور مشرکین ایک ہزار تھے...... یعنی دشمن کے مقابلے میں مسلمان آدھے سے بھی کم تھے...... لیکن اس کے باوجود ہمیشہ مسلمانوں کو ہی غلبہ نصیب ہوا تھا...... جبکہ آج تو مسلمان پہلی بار دشمن کے مقابلے میں آدھے تو تھے...... دشمن کی تعداد ہے چوبیس ہزار...... اور مسلمان ہیں بارہ ہزار...... لہٰذا اپنی اس کثرتِ تعداد کی وجہ سے اس روز مسلمان بہت خوش اور بے فکر تھے، اور یوں ہنسی خوشی میدانِ جنگ کی طرف رواں دواں تھے...... حالانکہ مؤمن کی شان یہ ہونی چاہئے کہ ظاہری اسباب کی بجائے اس کی نظر ہمیشہ صرف اللہ پر ہو، تمام تر اعتماد صرف اللہ کی طرف سے مدد و نصرت پر ہو، اسی کے ساتھ ہمیشہ لَو لگائی جائے، اور اسی سے فریاد کی جائے، اسباب کو اختیار تو ضرور کیا جائے، لیکن نظر مسبب الأسباب پر ہو......

اللہ عزوجل کی طرف سے مسلمانوں کیلئے فوری تنبیہ کا اور ہمیشہ کیلئے ایمانی تربیت کا یوں انتظام کیا گیا کہ اُس روز ان کی یہ کثرتِ تعداد ان کے کسی کام نہ آئی...... کثرتِ تعداد کے باوجود وہ دشمن کی طرف سے تیروں کی اس اچانک بوچھاڑ کے موقع پر ثابت قدم نہیں رہ

سکے......اور بھاگ کھڑے ہوئے......

اور پھر اس فوری سبق اور عملی وواقعاتی تنبیہ اور تربیت کے بعد اللہ کی طرف سے رحمت اور مدد ونصرت کا انتظام بھی فرمادیا گیا کہ مسلمانوں کے دلوں میں ''سکون واطمینان'' کی نعمت ڈال دی گئی ،ان کے دلوں سے دشمن کا خوف جاتا رہا،اور وہ دوبارہ منظّم ہوئے اور خوب شجاعت وثابت قدمی کے ساتھ لڑے،اور پھر اللہ کی طرف سے ان کیلئے مزید مدد کے طور پر فرشتوں کا لشکر بھی بھیجا گیا......تا کہ کافروں کوخوب اچھی طرح سزا دی جاسکے......

☆ گذشتہ سطور میں بیان کردہ اس تفصیل سے اس غزوے کی ایک خاص بات تو یہ واضح ہوگئی کہ اس موقع پر مسلمانوں کی طرف سے اپنی کثرتِ تعداد پر نظر کی وجہ سے جو بے فکری کا اظہار تھا...... یہ بات اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کو پسند نہیں آئی ،جس کی وجہ سے فوری اور نقد سبق سکھادیا گیا کہ ظاہری اسباب کو اختیار تو ضرور کیا جائے ،لیکن بھروسہ صرف اللہ سبحانہ وتعالیٰ پر ہی کیا جائے جو کہ مسبب الاسباب ہے،اور اسی سے مدد ونصرت طلب کی جائے۔

اس کے علاوہ مزید یہ کہ اس غزوے کے موقع پر کچھ اور ایسے مخصوص حالات وواقعات پیش آئے کہ جن کی وجہ سے حضرات مفسرین ومحدثین ٗ نیز مؤرخین نے بڑی اہمیت کے ساتھ اس غزوے کا تذکرہ کیا ہے،اس بارے میں خلاصہ درجِ ذیل ہے:

☆......یہ غزوہ فتحِ مکہ کے بعد بالکل ہی اچانک اور غیر متوقع پیش آ گیا......کسی کے وہم وگمان میں بھی یہ بات نہیں تھی کہ اس غزوے کی نوبت آئے گی۔

☆......اسلامی لشکر اصل میں تو ان دس ہزار صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین پر مشتمل تھا جو رسول اللہ ﷺ کے ہمراہ فتحِ مکہ کے موقع پر مدینہ سے آئے تھے،لیکن چونکہ فتحِ مکہ کے

موقع پر بہت بڑی تعداد میں مکہ کے باشندے مسلمان ہوگئے تھے (حالانکہ رسول اللہ ﷺ نے کسی کو قبولِ اسلام پر مجبور نہیں کیا تھا) اب یہ لشکر جب غزوۂ حنین کیلئے مکہ سے روانہ ہوا تو اس میں ان نومسلموں میں سے بھی دو ہزار افراد شامل ہوگئے، یوں کل تعداد بارہ ہزار ہوگئی۔

☆ ...... یہ نومسلم اگرچہ جسمانی طور پر تو یقیناً صحتمند' بہترین جنگجو' اور فنونِ سپہ گری سے بخوبی واقف اور آزمودہ کار سپاہی ہوں گے...... لیکن ان کی ایمانی واخلاقی تربیت ابھی نہیں ہوئی تھی، کیونکہ یہ بالکل نومسلم تھے، ان میں سے کوئی اسی دن مسلمان ہوا تھا...... کوئی ایک دو روز قبل ...... کوئی ہفتہ یا دس روز قبل ...... لہٰذا ذہنی وفکری تربیت اور ایمانی واخلاقی کیفیت کے لحاظ سے ان میں اور اصل لشکر والوں میں زمین وآسمان کا فرق تھا...... کہاں یہ لوگ جو محض ایک دو روز قبل ہی مسلمان ہوئے ...... اور کہاں وہ ''السابقین الاولین'' ...... وہ ابتدائی دور کے مسلمان...... وہ مہاجرین وانصار...... وہ ''بدری'' حضرات...... وہ ''بیعتِ رضوان'' والے...... اور ''بیعتِ عقبہ'' والے......

جبکہ کسی بھی لشکر کی کامیابی اور عمدہ کارکردگی کیلئے یہ بات انتہائی ضروری ہوا کرتی ہے اس لشکر میں شامل تمام افراد کی جسمانی صلاحیت اور تربیت کے ساتھ ساتھ...... ان کی اخلاقی' فکری اور ذہنی تربیت اور کیفیت بھی ایک ہی جیسی ہو...... ان کے ذہنی وفکری معیار میں یکسانیت ومماثلت ہو...... جبکہ فتحِ مکہ کے بعد یہ لشکر جب حُنین کی جانب روانہ ہوا...... تب یہ یگانگت اور مماثلت کافی حد تک مفقود ومجروح ہوچکی تھی...... ذہنی وفکری توازن بگڑ چکا تھا......

☆ ...... اس کے علاوہ مکہ کے باشندوں میں سے بہت بڑی تعداد میں ایسے لوگ بھی لشکر

کے ہمراہ ہولئے تھے جو محض ''تماشائی'' بنے ہوئے تھے، جن کی دینی کیفیت کے بارے میں کسی کو کچھ اندازہ ہی نہیں تھا کہ ان میں سے کون دینِ اسلام قبول کر چکا ہے......؟ اور کون ابھی تک کفروشرک پر ہی قائم ہے......؟ متعدد مفسرین ومحدثین' اوراسی طرح مؤرخین نے ان تماش بینوں کیلئے ''طُلَقاء'' کا لفظ استعمال کیا ہے، جس کے لفظی معنیٰ ہیں ''آزاد......بے لگام......جوخودکوکسی ضابطے یاکسی قاعدہ وقانون کے پابندنہ سمجھتے ہوں''۔(۱)

چنانچہ ان ''طُلَقاء'' کی ذہنی کیفیت اورسوچ یہی تھی کہ انہیں حق وباطل کے مابین معرکے سے کوئی غرض نہیں تھی، بلکہ ان کا اصل مقصود یہی تھا کہ دونوں فریقوں میں سے جس کسی کی بھی جیت ہوجائے گی بس اسی کے ساتھ مل جائیں گے......جہاں فائدہ نظر آئے گا اسی طرف لڑھک جائیں گے......اور جہاں کوئی خطرہ نظر آئے گا تو وہاں سے بھاگ کھڑے ہوں گے......

بلکہ اس سے بڑھ کر یہ کہ ان ''طلقاء'' میں بہت سے ایسے افراد بھی شامل تھے کہ جن کے متعدد رشتے دار گذشتہ جنگوں کے موقع پر مسلمانوں کے ہاتھوں مارے گئے تھے، اورانہیں یہ علم بھی تھا کہ ہمارے ''فلاں'' رشتے دار کو ''فلاں'' جنگ کے موقع پر ''فلاں'' مسلمان نے قتل کیا تھا، اور یہ کہ وہ ''فلاں'' مسلمان اِس وقت رسول اللہ ﷺ کے ہمراہ اسلامی لشکر میں موجود ہے......لہٰذا ان کے دلوں میں ''انتقام'' کی آگ بھڑک رہی تھی، فتحِ مکہ سے قبل کوئی

(۱) بہت سے مؤرخین کے بقول یہ لفظ ''طلقاء'' دراصل رسول اللہ ﷺ کے اُس جملے سے مأخوذ ہے جو آپؐ نے فتحِ مکہ کے موقع پر مکہ والوں کو مخاطب کرتے ہوئے ارشاد فرمایا تھا: ''اذهبوا أنتم الطُلَقاء'' یعنی ''جاؤ، آج تم سب آزاد ہو'' لہٰذا ''غزوۂ حنین'' کے موقع پر یہ تمامتر نامناسب رویہ وسلوک دکھانے والے یہ لوگ دراصل وہی تھے......واللہ أعلم۔

ایسی صورت ممکن نہیں تھی کہ مسلمانوں اور مشرکینِ مکہ کے مابین یوں آزادانہ میل جول ہو سکے......لیکن اب فتحِ مکہ کے فوری بعد صورتِ حال ایسی بن گئی تھی کہ حالات نے اب ان سب کو یکجا کر دیا تھا، لہٰذا ان کینہ پرور مشرکین کیلئے انتقام کی آگ بجھانے کا یہ نادر موقع تھا......اور اپنے اسی ناپاک مقصد کی تکمیل کے ارادے سے یہ لوگ ہمراہ ہو لئے تھے کہ جب جنگ عروج پر ہوگی...... ہر طرف افراتفری ہوگی......کسی کو کسی کا ہوش نہیں ہوگا...... ایسے میں موقع پا کر ہم اس ''فلاں'' کو ٹھکانے لگا دیں گے......!

☆......اور پھر جب تنگ و تاریک پہاڑی راستوں میں چھپے ہوئے ان انتہائی ماہر اور نشانے باز تیراندازوں کی طرف سے تیروں کی زبردست بوچھاڑ کا سلسلہ شروع ہوا...... تو ایسے میں سب سے پہلے یہی ''طلقاء'' پیٹھ پھیر کر بھاگے......اور اس طرح غیر منظّم طریقے سے بھاگے کہ باقی صفوں کو بھی خراب کیا......جو راستے میں آیا اُسے روند ڈالا......یوں یہ لوگ انتہائی بدنظمی اور افراتفری کا سبب بنے، تمام لشکر میں گڑبڑاہی کی وجہ سے پھیلی اور بھگدڑ انہوں نے ہی مچائی......

اور پھر جب رسول اللہ ﷺ نے 'بآوازِ بلند بار بار پکارا......نیز حضرت عباس رضی اللہ عنہ بھی بار بار پکارتے رہے ......تب مخلص لوگ تو اس پکار پر ''لبیک......لبیک'' کی صدائیں بلند کرتے ہوئے دیوانہ وار وہاں حاضر ہو گئے......جبکہ یہ 'طلقاء'' یہ پکار سن کر بھی نہیں پلٹے ......اور مستقل میدان چھوڑ کر ہی بھاگ گئے......حتیٰ کہ رُکے بغیر سیدھے واپس مکہ جا پہنچے اور اپنے گھروں میں آرام سے بیٹھ گئے......

☆......چنانچہ ان ''طلقاء'' کے بغیر ہی جنگ کے باقی تمام مراحل طے ہوئے، حتیٰ کہ یہ ''غزوۂ حنین'' اپنے اختتام کو پہنچا، اور اس اختتام کے موقع پر کیفیت یہ تھی کہ مسلمانوں کے

ہاتھوں ان طائف والوں کو انتہائی بدترین اور رُسوا کن شکست و ہزیمت سے دوچار ہونا پڑا، ان کے بڑے بڑے اور نامور قسم کے سرداروں میں سے ستر مارے گئے، بہت سے قیدی بنائے گئے، جبکہ عام سپاہیوں میں سے چھ ہزار کو قیدی بنا لیا گیا، نیز چونکہ اس جنگ کے موقع پر اپنے جوشیلے سپہ سالار کے حکم کی تعمیل میں یہ لوگ اپنے بیوی بچے اور مویشی وغیرہ سبھی کچھ بہت بڑی مقدار میں ہمراہ لائے تھے، اس لئے بڑی مقدار میں مختلف قسم کا مال ومتاع' سونا چاندی' نیز چوبیس ہزار اونٹ اور چالیس ہزار بکریاں بطورِ ''مالِ غنیمت'' مسلمانوں کے ہاتھ لگیں۔

☆......جنگ ختم ہونے کے بعد رسول اللہ ﷺ نے مالِ غنیمت کی تقسیم فوری شروع نہیں کی، بلکہ چند دن انتظار فرمایا کہ شاید یہ ''طلقاء'' واپس آجائیں اور اپنے بھاگ کھڑے ہونے پر معذرت کریں......لیکن وہ نہ آئے......اور پھر جب آپؐ نے تقسیم کا کام شروع فرمایا......تب یہ لوگ فوراً ہی موقع پر پہنچ گئے ......اور خوب زور وشور کے ساتھ مانگنے لگے......اور ان کے اس نامناسب رویے کے باوجود آپؐ ان کے مطالبات کے جواب میں انہیں بہت کچھ عطاء فرماتے رہے......

دراصل آپؐ کی مثال کسی ماہر ترین معالج اور نبض شناس کی مانند تھی کہ جو پہلے خوب مہارت کے ساتھ مرض کی تشخیص کرتا ہے، اور پھر خوب کارگر اور مؤثر قسم کا علاج تجویز کرتا ہے...... آپؐ کو ان کے مرض کے بارے میں خوب علم تھا......آپؐ اس حقیقت سے بخوبی آگاہ تھے کہ انہوں نے ابتک اپنی تمام عمر دنیا کے حقیر مال ودولت پر لپکنے اور جھپٹنے میں گذاری ہے......بس یہی ان کا سب سے بڑا روگ ہے......لہٰذا آپؐ ان کیلئے کارگر اور مؤثر ترین علاج سے بھی بخوبی واقف تھے......اور وہ علاج یہ تھا کہ فی الحال ان کی تألیفِ قلب کیلئے

جو کچھ مال و دولت یہ مانگتے ہیں، انہیں دے دیا جائے، تاکہ اس ''دلجوئی'' کے ذریعے ابتدائی طور پر ان کے دلوں میں کسی نہ کسی درجے میں دینِ اسلام کے ساتھ تعلق اور ''وابستگی'' پیدا کی جا سکے......!

چنانچہ وقت نے ثابت کیا کہ آپؐ کی طرف سے تجویز فرمودہ یہ علاج انتہائی کارگر ثابت ہوا، یہ لوگ آپ ﷺ کے اس حسنِ سلوک اور فیاضی سے انتہائی متأثر ہوئے......جس کے نتیجے میں باہمی میل جول کے سلسلے بڑھے تو رفتہ رفتہ ان کے دلوں میں ایمان بھی راسخ ہونے لگا......اور آخر آئندہ چل کر یہ لوگ اچھے اور سچے مسلمان ثابت ہوئے۔

☆......''طلقاء'' میں مالِ غنیمت کی بڑے پیمانے پر تقسیم کے علاوہ اُسی موقع پر ایک اور بڑی عجیب و غریب اور غیر متوقع قسم کی صورتِ حال یہ پیش آگئی کہ یہ ہوازن اور ثقیف والے جنگجو جن کے چھوٹے بڑے قبائل بڑی تعداد میں طائف اور مکہ کے مابین پھیلے ہوئے تھے......اور جو کہ اس جنگ اور اس کے نتیجے میں پیدا ہونے والی تمام تر مشکلات و مصائب کے اصل ذمہ دار تھے......مالِ غنیمت کی تقسیم کے موقع پر جب رسول اللہ ﷺ نے مخصوص مصلحت کی بناء پر ''طلقاء'' کو بہت کچھ عطاء فرمایا......تو اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ اب انہی قبائل ''ہوازن'' اور ''ثقیف'' کے (یعنی طائف والوں کے) بڑے بڑے سردار بھی بڑی تعداد میں آپہنچے، انہی سرداروں میں رسول اللہ ﷺ کا رضاعی چچا ''ابو برقان'' بھی موجود تھا(۱) ان لوگوں نے رسول اللہ ﷺ کے سامنے بڑے زور و شور کے ساتھ......اور انتہائی دردانگیز

(۱) رسول اللہ ﷺ کی رضاعی والدہ حلیمہ سعدیہ کا تعلق قبیلہ ''بنوسعد'' سے تھا اور اسی نسبت کی وجہ سے انہیں ''سعدیہ'' کہا جاتا تھا، اور یہ قبیلہ بنوسعد دراصل اسی بڑے قبیلے ''ہوازن'' ہی کا ذیلی قبیلہ تھا، لہٰذا ''بنوسعد'' والے بھی ''ہوازن'' ہی کے ایک جزء کے طور پر مسلمانوں کے خلاف لڑی جانے والی اس جنگ میں شامل تھے۔

طریقے سے فریاد کا سلسلہ شروع کیا، اور یوں کہنے لگے کہ ہمارے گھربار' ہمارے جانور اور مویشی' ہمارے اموال واسباب......سبھی کچھ لُٹ گیا......اب ہمارا کیا بنے گا......؟ ہم پر رحم کیا جائے......اگر قیصر یا کسریٰ کے سامنے ہم اس طرح گڑگڑاتے اور وہ لوگ ہماری یہ حالتِ زار دیکھتے......تو وہ بھی ہمیں ہرگز خالی ہاتھ نہ لوٹاتے......تو پھر آپ کو تو اللہ نے اخلاقِ فاضلہ میں سب سے ممتاز فرمایا ہے......لہٰذا ہمیں خالی ہاتھ نہ لوٹائیے گا......'' ان کی یہ فریاد اور یہ گریہ وزاری دیکھ کر رسول اللہ ﷺ کیلئے انہیں خالی ہاتھ لوٹانا بہت مشکل ہو گیا......چنانچہ آپؐ نے انہیں بھی بہت کچھ عطاء فرما دیا......!

اور پھر وقت نے یہ ثابت کیا کہ آپؐ نے اس بصیرت اور فراست کی بناء پر انہیں خالی ہاتھ نہ لوٹانے کا جو مدبرانہ فیصلہ فرمایا تھا' وہ بہت ہی مفید ثابت ہوا اور اس کے مثبت نتائج فوری طور پر ہی ظاہر ہونے لگے......چنانچہ آپؐ کی اس سخاوت وفیاضی اور خوش اخلاقی سے متأثر ہو کر یہ بڑے بڑے سردار اور رؤساء قسم کے لوگ بڑی تعداد میں مسلمان ہو گئے، اور چونکہ اپنی اپنی قوم میں اور اپنے علاقے میں ان کا بہت زیادہ اثر ورسوخ تھا......لہٰذا ان کے قبولِ اسلام کے بعد اب ان کی قوم کے افراد بھی فوج در فوج مسلمان ہونے لگے اور یوں بڑی سرعت کے ساتھ وہاں دینِ برحق کی نشر واشاعت ہونے لگی۔

اور یہ بھی اس بات کا واضح اور قطعی ثبوت تھا کہ رسول اللہ ﷺ کی طرف سے ان لوگوں کے اصل مرض کی تشخیص بالکل درست تھی......اور پھر آپؐ کی طرف سے ان کیلئے جو ''علاج'' تجویز کیا گیا وہ بھی انتہائی مفید ومؤثر اور تیر بہدف ثابت ہوا......!

☆......لیکن اس بہت بڑی کامیابی کے ساتھ ساتھ اس موقع پر رسول اللہ ﷺ کیلئے ایک بہت بڑی آزمائش بھی پیش آئی جو کہ بڑی نفسیاتی کشمکش کا سبب بھی بنی، شاید اس انتہائی

مہلک اور خونریز قسم کی جنگ کے موقع پر عین میدانِ جنگ میں بھی صورتِ حال اس قدر نازک اور مشکل نہیں ہوئی ہوگی کہ جس قدر معاملہ اب جنگ کے خاتمے کے بعد اس مالِ غنیمت کی تقسیم کے موقع پر نازک ہو گیا......!

ہوا یہ کہ ''مالِ غنیمت'' کی تقسیم کے موقع پر جب ''طلقاء'' خوب بڑھ چڑھ کر مانگ رہے تھے......تو آپؐ نے اپنی بصیرت کی بناء پر انہیں بہت کچھ عطاء فرما دیا تھا، یہ چیز دیکھ کر ہوازن وثقیف کے سردار بھی آ پہنچے تھے...... تب آپ ﷺ نے ان کی ''تألیفِ قلب'' کیلئے انہیں بھی بہت کچھ عطاء فرما دیا تھا......جو کہ دینِ اسلام کی نشر و اشاعت کی راہ ہموار کرنے کیلئے یقیناً بالکل درست اور بجا اقدام تھا......!

لیکن اس موقع پر ایک بہت بڑا اشکال یہ پیدا ہو گیا کہ یہ تمامتر مالِ غنیمت تو دراصل خالصۃً رسول اللہ ﷺ کے اپنے ساتھیوں کا جائز اور شرعی حق تھا......جنہوں نے اس سے قبل بھی ہمیشہ، نیز اس جنگ کے موقع پر بھی بڑی بڑی تکلیفیں اور صعوبتیں برداشت کی تھیں...... بڑی قربانیاں دی تھیں......لیکن ''طلقاء'' کو اور پھر ''ہوازن اور ثقیف'' والوں کو جب بہت کچھ دے دیا گیا تو اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ یہ پرانے ساتھی جو کہ اصل حقدار تھے، محروم رہ گئے......

اب سوال یہ تھا کہ انہیں کس طرح راضی اور مطمئن کیا جائے......؟

رسول اللہ ﷺ کے ان اصلی ساتھیوں میں حضرات مہاجرین بھی شامل تھے اور حضرات انصار بھی، حضرات مہاجرین کا تعلق تو چونکہ مکہ شہر سے اور قبیلۂ قریش سے تھا، جبکہ خود رسول اللہ ﷺ کا تعلق بھی مکہ شہر سے اور قبیلۂ قریش سے ہی تھا، لہٰذا ان میں سے ہر ایک کے ساتھ آپؐ کی کسی نہ کسی شکل میں ''قرابت داری'' تھی، اور جہاں ''قرابت داری'' ہوا کرتی ہے......وہاں بہت کچھ کہنے سننے کی نوبت نہیں آتی...... بلکہ بہت سے نازک اور حساس

مواقع پر ''خاموشی'' اور ''بے زبانی'' ہی بہترین زبان ہوا کرتی ہے......لہٰذا رسول اللہ ﷺ نے ان مہاجرین حضرات کے ساتھ اس بارے میں کسی بات چیت کی ضرورت محسوس نہیں فرمائی۔

جبکہ حضرات انصار کا تعلق مدینہ سے تھا، یقیناً ان کے ساتھ بھی رسول اللہ ﷺ کی بہت زیادہ ''قربتیں'' تھیں، لیکن ان تمامتر ''قربتوں'' کے باوجود باقاعدہ ''قرابت داری'' نہیں تھی، اگرچہ آپؐ اس حقیقت سے بخوبی آگاہ تھے کہ پرانے مہاجرین کی طرح ان انصار کا مقام ومرتبہ بھی یقیناً بہت بلند ہے......انصار کا مقام ومرتبہ بھی دنیا کے اس حقیر مال ومتاع سے بہت بڑھ کر ہے......ان کے نزدیک دنیاوی مال واسباب کی کوئی حیثیت نہیں، ان کی اصل پونجی تو بس اللہ اور رسولؐ کی محبت ہے......مزید یہ کہ یہ انصارِ مدینہ اس سے قبل متعدد مواقع پر اپنی اسی ایمانی واخلاقی کیفیت' اپنے اسی جذبے' اور اپنے اسی بے مثال ''ایثار'' کا عملی طور پر اظہار بھی کر چکے تھے......لیکن اس تمامتر مقام ومرتبے کے باوجود...... اور ان تمامتر حقائق کے باوجود......آخر وہ بھی گوشت پوست کے انسان ہی تھے......کوئی فرشتے نہیں تھے......کوئی آسمانی مخلوق نہیں تھے......ان کے دلوں میں بھی انسانی جذبات تھے......ان کی بھی ''مالی ضروریات'' تھیں......لہٰذا عین ممکن تھا کہ شاید ان میں سے کسی کے دل میں اس ''تقسیم'' کے بارے میں کوئی ''وسوسہ'' پیدا ہونے لگے......!

لہٰذا آپؐ نے مناسب سمجھا کہ اس بارے میں ان کے ساتھ مناسب ''گفتگو'' کر لی جائے......چنانچہ آپؐ کی فرمائش پر تمام انصارِ مدینہ ''جعرّانہ'' (۱) نامی بستی میں ایک جگہ

(۱) اسی ''جعرانہ'' میں ہی تمامتر مالِ غنیمت کی تقسیم کا کام انجام دیا گیا تھا، یہ بستی مکہ شہر سے کچھ فاصلے پر (طائف کے راستے میں) واقع ہے۔

جمع ہوئے، اور تب رسول اللہ ﷺ نے انہیں مخاطب کرتے ہوئے اپنی گفتگو کا آغاز فرمایا:

''اے جماعتِ انصار! یہ نومسلم لوگ ہیں، ان کے دل ابھی تک دنیاوی مال ودولت کے ساتھ ہی لٹکے ہوئے ہیں، جبکہ تمہارے دل اللہ اور اس کے رسول پر ایمان کی دولت سے منور ہیں''

اور پھر آپ ؐ نے مزید فرمایا: ''اللہ کی قسم! تمہارے دلوں میں جو ایمان کی دولت ہے' وہ بہت بہتر ہے دنیا کی اس حقیر دولت سے کہ جو وہ اپنے ہمراہ لے گئے ہیں......''

رسول اللہ ﷺ کی یہ گفتگو سُن کر انصارِ مدینہ خاموش رہے، تب آپ ؐ نے انہیں مخاطب کرتے ہوئے فرمایا: ''اے جماعتِ انصار! کیا تم میری بات کا کوئی جواب نہیں دو گے؟''

تب انصار نے عرض کیا: ''بِمَا ذَا نُجِيبُكَ يَا رَسُولَ اللّٰه؟ لِلّٰه ولِرَسُولِهٖ المَنُّ وَ الفَضلُ ''یعنی ''اے اللہ کے رسول ؐ! ہم کیا جواب دیں......؟ ہم پر اللہ اور اس کے رسول ؐ کے جو احسانات ہیں......ہم تو ان کا اقرار واعتراف کرتے ہیں''

اور تب قدرے توقف کے بعد رسول اللہ ﷺ نے مزید ارشاد فرمایا: ''اے جماعتِ انصار! کیا تمہیں یہ بات پسند نہیں کہ لوگ اونٹ اور بکریاں لے کر اپنے گھروں کو جائیں' اور تم ''محمد'' کو اپنے ساتھ اپنے گھر لے جاؤ......''

کس قدر سادگی تھی رسول اللہ ﷺ کی اس بات میں......کتنی معصومیت تھی......اور کتنا اثر تھا ......یہ بات انصار کے دل میں پیوست ہوگئی......اور تب وہ اپنے جذبات پر قابو نہ رکھ سکے......ضبط کے سبھی بندھن ٹوٹ گئے......اور بے اختیار وہ سب رونے لگے......یہاں تک کہ روتے روتے ان کی داڑھیاں آنسوؤں سے بھیگ گئیں(۱)

(۱) جیسا کہ مسند امام احمد (۴۰۲) وغیرہ میں تذکرہ ہے ''حتیٰ أخضلُوا لِحَاهم'' راوی: ابوسعید خدریؓ۔

اوروہ سب بیک زبان بولے ''رَضِینَا بِاللّٰہِ رَبّاً ، وَبِرَسُولِہٖ قِسماً وَ حَظّاً ''یعنی''ہم نے اللہ کو اپنا رب پسند کرلیا، اوراس کے رسولؐ کی طرف سے ہمیں جو کچھ بھی ملا' اس پر ہم راضی ہو گئے''۔

یہ تھا انصارِ مدینہ کا''ایثار''اور یہ تھا اُن کا مقام ومرتبہ......جیسا کہ خود قرآن کریم میں اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ نے ان کے''ایثار'' کی تعریف بیان فرمائی ہے،ارشادِربانی ہے: ﴿وَیُؤثِرُونَ عَلَیٰ أنفُسِھِم وَلَوکَانَ بِھِم خَصَاصَةٌ......﴾ (۱)یعنی''وہ خود اپنے اوپر ترجیح دیتے ہیں دوسروں کو،خواہ وہ خود کتنے ہی محتاج ہوں......''

نیز حضرات انصار کی منقبت وفضیلت اورمقام ومرتبہ رسول اللہ ﷺ کے اس ارشاد سے بھی خوب واضح ہوتا ہے کہ''لَو أنّ النَّاسَ سَلَکُوا شِعُباً وَ سَلَکَتِ الأنصَارُ شِعُباً لَسَلَکتُ شِعُبَ الأنصَارِ ''یعنی''اگر تمام لوگ کسی راستے پر چل رہے ہوں،اور انصار کسی دوسرے راستے پر چل رہے ہوں......تو میں ضرور اسی راستے پر ہی چلوں گا جس پر انصار چل رہے ہوں گے''۔

نیز آپؐ نے حضرات انصارِ مدینہ کیلئے ان الفاظ میں دعاء فرمائی''اَللّٰھُمّ ارحَمِ الأَنصَار، وَأبنَاءَ الأَنصَار، وَأَبنَاءَ أَبنَاءِ الأَنصَار ''یعنی''اے اللہ!تو انصار پر رحم فرما،اور انصار کے بچوں پر بھی رحم فرما،اور انصار کے بچوں کے بچوں پر بھی رحم فرما''(۲)

انصارِ مدینہ کیلئے رسول اللہ ﷺ کی طرف سے اس والہانہ انداز کا اظہار......اوراس قدر جذباتی انداز میں ان کیلئے' نیز ان کی نسلوں کیلئے یہ دعاء......یقیناً اس سے حضرات انصار کی شان اور منقبت وفضیلت ظاہر ہوتی ہے۔

(۱)سورۃ الحشر[۹] (۲)السیرۃ النبویہ لابن ہشام/ ج۴/ص۱۶۱۔وغیرہ۔

☆......**شیماء بنت حارث السعدیہ:**

رسول اللہ ﷺ نے اپنی حیاتِ طیبہ کے ابتدائی پانچ سال مکہ شہر سے باہر بادیۂ بنی سعد میں گذارے تھے، اُس دور میں یہ رواج تھا کہ ''شرفاء'' اور صاحبِ حیثیت قسم کے لوگ اپنے شیر خوار بچوں کو تربیت کیلئے بادیہ بھجوایا کرتے تھے، تاکہ شہر کے مصنوعی ماحول سے دور بادیہ میں قدرتی آب وہوا میں' نیز فطری ماحول میں بچے کی بہتر نشو ونما ہو سکے۔

اسی دستور کے مطابق رسول اللہ ﷺ کی والدہ ماجدہ آمنہ بنت وہب نے بھی اپنے اس نومولود نورِ نظر کو ''حلیمہ'' نامی بادیہ نشیں خاتون کے حوالے کر دیا تھا جس کا تعلق ''بنوسعد'' سے تھا، اور اسی نسبت کی وجہ سے وہ ''حلیمہ سعدیہ'' کہلاتی تھیں۔

چنانچہ رسول اللہ ﷺ پانچ سال تک وہیں بادیۂ بنی سعد میں مقیم رہے، اس دوران وقتاً فوقتاً حلیمہ سعدیہ اس نونہال کو اس کی ماں سے ملانے کی خاطر مکہ لاتی رہتی تھیں۔

اُس زمانے میں ہر بڑے قبیلے میں بہت سے ذیلی قسم کے چھوٹے چھوٹے قبائل اور خاندان ہوا کرتے تھے، مثلاً شہر مکہ میں ''قریش'' بڑا مشہور اور طاقتور قبیلہ تھا، جس کے بہت سے ذیلی قبائل تھے، مثلاً بنوہاشم، بنوزہرہ، بنوعدی......وغیرہ......اسی طرح طائف اور اس کے مضافات میں آباد بڑے مشہور اور طاقتور قبیلے ''ہوازن'' کے بھی متعدد ذیلی قبائل تھے' جو کہ طائف اور مکہ کے درمیان پھیلے ہوئے تھے، انہی میں ایک ذیلی قبیلہ ''بنوسعد'' بھی تھا، ''ہوازن'' نے مسلمانوں کے خلاف جس جارحیت کا آغاز کیا تھا' جس کے نتیجے میں ''غزوۂ حنین'' کا تاریخی واقعہ پیش آیا تھا' اس جارحیت میں ''ہوازن'' کے دیگر ذیلی قبائل کی طرح ''قبیلۂ بنوسعد'' بھی شامل تھا۔

غزوۂ حنین سے فراغت کے بعد اسی غزوے سے متعلق چھوٹے بڑے بہت سے انتظامی قسم

کے معاملات نمٹانے کی غرض سے رسول اللہ ﷺ اپنے لشکر سمیت چند دن اسی جگہ مقیم رہے۔

اس موقع پر یہ بات آپؐ کے ذہن میں تھی کہ آپؐ نے اپنے بچپن میں جو پانچ سال کا عرصہ اپنی رضاعی والدہ ''حلیمہ سعدیہ'' کے گھر میں گذارا تھا...... وہ یہی علاقہ تھا...... حلیمہ سعدیہ کا گھر یہیں کہیں آس پاس ہی تھا...... نیز آپؐ کو یہ بات بھی یاد تھی کہ حلیمہ سعدیہ کی ایک بیٹی ہوا کرتی تھی جس کا نام تھا ''شیماء'' اور جو کہ عمر میں آپؐ سے کچھ بڑی تھی...... اور دن بھر اپنے اس چھوٹے بھائی ...... اس معصوم نونہال...... یعنی ''محمدؐ'' کو گود میں لئے ہوئے اپنے محلے کے دیگر بچوں کے ہمراہ گلی کوچوں میں کھیلتی رہتی تھی......

اس غزوۂ حنین کے موقع پر چونکہ ''ہوازن'' والوں کی کیفیت یہ تھی کہ ہر کوئی اپنے اس جوشیلے سپہ سالار مالک بن عوف کے حکم پر اپنے بیوی بچوں کو بھی ''میدانِ جنگ'' میں ہمراہ لایا تھا...... لہٰذا ''ہوازن'' کی شکست وپسپائی کے نتیجے میں مسلمانوں کے ہاتھ جو چھ ہزار قیدی لگے تھے، ان میں بڑی تعداد میں عورتیں اور بچے بھی شامل تھے۔

ایک روز رسول اللہ ﷺ جب اپنے چند ساتھیوں کے ہمراہ وہیں کسی جگہ تشریف فرما تھے، کہ اس دوران ''بنوسعد'' سے تعلق رکھنے والی چند عورتوں کا اس جگہ سے گذر ہوا...... اس موقع پر ان میں سے ایک عورت کی جب رسول اللہ ﷺ پر نگاہ پڑی تو وہ ٹھٹک کر رہ گئی، اس کے بڑھتے ہوئے قدم وہیں رک گئے...... اور تب وہ آپؐ سے مخاطب ہو کر یوں کہنے لگی: ''میں شیماء ہوں...... مجھے دیکھئے...... میں آپ کی بہن شیماء...... حلیمہ سعدیہ کی بیٹی......''

یہ آواز سن کر...... اور اس عورت کی زبانی یہ بات سن کر...... رسول اللہ ﷺ چونک اٹھے...... آپؐ کے رُخِ انور پر خوشی کے آثار نمایاں ہونے لگے...... لیکن فوراً ہی آپؐ نے اس عورت

کومخاطب کرتے ہوئے فرمایا’’اس بات کا ثبوت کیا ہے کہ......تم واقعی شیماء ہی ہو......؟‘‘ تب اس عورت نے بہت سی باتیں یاددلائیں، بہت سی نشانیاں بتائیں......جن کے نتیجے میں رسول اللہ ﷺ نے اسے پہچان لیا کہ واقعی یہ میری رضاعی بہن ’’شیماء‘‘ ہی ہے...... اورتب آپؐ نے نہایت گرمجوشی کے ساتھ اس کا استقبال کیا، خوب عزت افزائی فرمائی...... اور بہت زیادہ احترام کیا......حتیٰ کہ آپؐ نے اپنے کندھے پر رکھی ہوئی اپنی چادر اتارکر زمین پر بچھائی اور شیماء کواس پر بٹھایا(۱) نیز عرصۂ دراز کے بعد ہونے والی اس اچانک ملاقات پرآپؐ نے انتہائی مسرت کا اظہار فرمایا۔(۲)

جس طرح رسول اللہ ﷺ اپنی رضاعی بہن کے ساتھ اس ملاقات پر بہت زیادہ مسرور تھے، اسی طرح ’’شیماء‘‘ بھی بہت خوش تھی......خصوصاًاس نے جب اپنے بھائی کی یہ اتنی بڑی قدرومنزلت......اوراتنا عظیم مقام ومرتبہ دیکھا......تو وہ بے حدخوش ہوئی اور انتہائی مسرت کا اظہار کیا......اپنے بھائی کواس قدر باعزت دیکھ کروہ مسلمانوں کے ہاتھوں اپنی قوم کی اس بدترین شکست اور اتنے بڑے نقصان کا غم بھی بھول گئی......نیز یہ کہ اس موقع پر وہ مسلمان بھی ہوگئی......اور پھر جب وہ وہاں سے رخصت ہونے لگی تو رسول اللہ ﷺ نے

(۱) اُس دور میں معززاورشرفاءقسم کے لوگ اپنے کندھے پرکوئی چادر یارومال رکھا کرتے تھے،جس کسی کا بہت زیادہ احترام مقصود ہوتا......اسے اپنی اس چادر پر بٹھایا کرتے تھے۔

(۲) رسول اللہ ﷺ نے اپنی حیاتِ مبارکہ کے ابتدائی پانچ سال حلیمہ سعدیہ کے یہاں گذارے تھے،جبکہ غزوہ حنین سنہ آٹھ ہجری میں پیش آیا تھا،جبکہ اس کے تقریباً دوسال بعد سنہ گیارہ ہجری کے آغاز (ماہِ ربیع الاول) میں آپؐ کا تریسٹھ سال کی عمر میں انتقال ہوگیا تھا......اس کا مطلب یہ ہوا کہ غزوۂ حنین کے موقع پرآپؐ کی عمر مبارک تقریباً ساٹھ یا اکسٹھ برس ہوگی......جبکہ پانچ سال کی عمر میں آپؐ بادیہ بنی سعد سے واپس مکہ چلے آئے تھے...... اوراب اس قدر طویل کے عرصے کے بعد ’’شیماء‘‘ سے یہ ملاقات ہوئی تھی۔

اسے یہ پیشکش فرمائی کہ اگر وہ چاہے تو عزت واحترام کے ساتھ اب مسلمانوں میں ہی رہے......اور اگر واپس اپنے علاقے کی طرف جانا چاہے تب بھی اسے روکا نہیں جائے گا، اس پر اس نے اپنے علاقے کی طرف واپس جانے کی خواہش ظاہر کی......تب رسول اللہ ﷺ نے اسے انتہائی عزت واحترام کے ساتھ......نیز بہت سے ہدایا وتحائف کے ساتھ......وہاں سے رخصت فرمایا۔

☆......طائف کی جانب پیش قدمی:

غزوۂ حنین کے موقع پر مسلمانوں کے ہاتھوں شکست سے دوچار ہونے کے بعد مشرکین بڑی تعداد میں طائف کی طرف بھاگ کھڑے ہوئے تھے، جس پر رسول اللہ ﷺ نے ان کے تعاقب کی غرض سے طائف کی جانب پیش قدمی فرمائی، لیکن اس موقع پر وہ طائف والے بڑے مضبوط قلعوں کے اندر قلعہ بند ہو کر بیٹھ گئے۔

رسول اللہ ﷺ نے اپنے لشکر کے ہمراہ ان کا محاصرہ کیا، پندرہ روز اسی کیفیت میں گذر گئے......آخر رسول اللہ ﷺ نے اپنے ساتھیوں کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا کہ ''ان طائف والوں کے ساتھ اب سختی برتنے کی کوئی ضرورت باقی نہیں رہی......لہٰذا اب ہمیں یہ محاصرہ ختم کر کے واپس لوٹنا چاہئے''۔

چنانچہ یہ محاصرہ ختم کر دیا گیا، رسول اللہ ﷺ کا یہ فیصلہ' نیز طائف والوں کے بارے میں آپ ؐ کا یہ اندازہ بالکل درست تھا، کیونکہ غزوۂ حنین کے بعد اب ان میں کوئی دم خم باقی نہیں رہا تھا......اور پھر آپ ؐ کے اس فیصلے کا نتیجہ یہ ظاہر ہوا کہ رفتہ رفتہ وہ سبھی خود ہی دینِ اسلام قبول کرتے چلے گئے......اور آئندہ چل کر دین کے علمبردار ثابت ہوئے۔

☆......واپسی کا سفر:

طائف کا محاصرہ ختم کرنے کے بعد رسول اللہ ﷺ نے اب واپسی کا فیصلہ فرمایا، واپسی کے اس سفر کے دوران جب آپؐ اپنے لشکر سمیت مکہ کے قریب ''جِعِرّ انہ'' نامی مقام پر پہنچے تو عمرے کی نیت سے وہاں احرام باندھا، اور مکہ مکرمہ پہنچ کر آپؐ نے اپنے جاں نثار ساتھیوں کے ہمراہ ''عمرہ'' ادا کیا، اور پھر وہاں سے مدینہ کی جانب واپسی کے سفر کا آغاز فرمایا، اس موقع پر آپؐ نے ''عتّاب بن اُسید'' نامی ایک نوجوان کو ''امیرِ مکہ'' مقرر فرمایا، نیز اس موقع پر آپؐ نے سرکاری بیت المال سے ان کیلئے یومیہ ایک درہم وظیفہ بھی مقرر فرمایا، تاکہ وہ کسی کے دستِ نگر اور محتاج نہ رہیں......اور یوں ذہنی سکون اور خوب دلجمعی کے ساتھ اپنے فرائضِ منصبی ادا کر سکیں۔(۱)

جبکہ اسی موقع پر آپؐ نے فتحِ مکہ کے نتیجے میں اب وہاں نومسلموں کی بڑی تعداد کے پیشِ نظر ان کی دینی تعلیم وتربیت کی غرض سے اپنے جلیل القدر انصاری صحابی حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کو وہاں بطورِ ''معلم'' مقرر فرمایا۔

☆اور پھر رسول اللہ ﷺ اپنے جاں نثار ساتھیوں کے ہمراہ مکہ سے واپس مدینہ کی جانب روانہ ہوگئے، آپؐ کا یہ سفر کافی طویل ثابت ہوا تھا، فتحِ مکہ کے موقع پر آپؐ ماہِ رمضان میں مدینہ سے مکہ کی جانب روانہ ہوئے تھے، اس کے بعد شوال کا پورا مہینہ گذر گیا تھا، اور اب ماہِ ذوالقعدہ کے بالکل آخری دن چل رہے تھے، جب آپؐ مدینہ کیلئے واپس روانہ ہوئے۔

(۱) عتاب بن اُسید رضی اللہ عنہ کی عمر اس وقت محض بیس سال تھی، یہ مکہ کے ہی باشندے تھے اور قبیلہ قریش کے مشہور خاندان ''بنوامیہ'' سے ان کا تعلق تھا، بالکل نومسلم تھے، فتحِ مکہ کے موقع پر مسلمان ہوئے تھے، رسول اللہ ﷺ ان کی شرافت ونجابت سے متأثر ہوئے تھے اور انہیں ''امیرِ مکہ'' یعنی مکہ کا گورنر مقرر فرمایا تھا، البتہ رسول اللہ ﷺ کے انتقال کے بعد انہوں نے خود ہی اس منصب سے کنارہ کشی اور گوشہ نشینی اختیار کر لی تھی۔

☆اس موقع پر یقیناً رسول اللہ ﷺ کے قلبِ مبارک میں کتنی ہی یادیں گردش کررہی ہوں گی......تقریباً ڈھائی ماہ قبل جب مکہ آمد ہوئی تھی......اُس وقت کے مناظر......فتحِ مکہ کے یادگار اور تاریخی موقع پر پیش آنے والے حالات وواقعات کے مناظر......اور پھر ''حُنین'' میں کیا ہوا......؟''جِعرّانہ'' کے مقام پر تقسیمِ غنائم کے وقت خلافِ توقع کیسے کیسے معاملات پیش آئے......''ہوازن'' اور ''ثقیف'' کے ساتھ معاملات اور تعلقات میں کیسے کیسے موڑ آئے......شَیماء سے کس طرح عجیب وغریب قسم کے حالات میں اچانک ملاقات ہوئی......اور پھر طائف کا محاصرہ کس طرح طول پکڑتا چلا گیا......وغیرہ وغیرہ......اسی کیفیت میں آپ ﷺ اپنے جاں نثار ساتھیوں کے ہمراہ اب مکہ سے مدینہ کی جانب رواں دواں تھے......

☆آج سے تقریباً آٹھ سال قبل بھی آپ ﷺ اسی طرح مکہ سے مدینہ کی جانب محوِ سفر تھے......اور آج بھی......لیکن آٹھ سال قبل آپؐ مکہ سے خفیہ طور پر روانہ ہوئے تھے......دشمنوں اور تعاقب کرنے والوں کی عقابی نگاہوں سے بچتے بچاتے اور چھپتے چھپاتے......اُس وقت آپؐ مدینہ کی جانب رواں دواں تھے پناہ کی تلاش میں......لیکن اب آٹھ سال بعد صورتِ حال یکسر مختلف تھی......اب آپ ﷺ کا یہ سفر خفیہ نہیں تھا......اب آپؐ کسی پناہ کی تلاش میں نہیں جارہے تھے......بلکہ آج تو آپؐ اپنے ہزاروں جاں نثاروں کی معیت میں......بلکہ ان کی قیادت کرتے ہوئے ان راستوں پر گامزن تھے......اور پھر یہ طویل سفر طے کرنے کے بعد آپؐ جب مدینہ پہنچے تو آج آپؐ وہاں اجنبی نہیں تھے......مکہ سے خفیہ طور پر نہیں آئے تھے......بلکہ آج تو آپؐ ''فاتحِ مکہ'' کی حیثیت سے وہاں تشریف لائے تھے......اپنے شہر مدینہ میں......کہ جو اولین اسلامی ریاست کا دارالحکومت تھا، اور آپؐ خود

ہی اس شہر مدینہ کے، اور اس وسیع و عریض اسلامی ریاست کے فرمانروا تھے۔
مزید یہ کہ ''فتحِ مکہ'' کے بعد اب اگر آپ ﷺ چاہتے تو وہیں مکہ میں ہی مستقل طور پر مقیم ہو جاتے......لیکن آپؐ نے ایسا نہیں کیا تھا......بلکہ آپؐ تو مدینہ کی محبت میں......نیز اہلِ مدینہ کی محبت میں واپس چلے آئے تھے......یقیناً یہ بھی آپؐ کی ''وفاء'' کی ایک اعلیٰ مثال تھی......!!

الحمدللہ آج بتاریخ ۲۷/ ذوالحجہ ۱۴۳۴ھ، مطابق یکم نومبر ۲۰۱۳ء بروز جمعہ
یہ باب مکمل ہوا۔

رَبَّنَا تَقَبَّل مِنَّا اِنّكَ أنتَ السَّمِيعُ العَلِيمُ ، وَتُب عَلَينَا اِنَّكَ أنتَ التَوَّابُ الرَّحِيم

جزیرۃ العرب میں مختلف شورشیں......اوران کی سرکوبی:

فتحِ مکہ اور پھر غزوۂ حنین وطائف کے بعد جب رسول اللہ ﷺ اپنے جاں نثار ساتھیوں کے ہمراہ واپس مدینہ منورہ تشریف لائے تو اب بظاہر اگرچہ جزیرۃ العرب میں عمومی کیفیت یہ تھی کہ مشرکین کی قوت ٹوٹ چکی تھی، اوران میں اب کوئی دم خم باقی نہیں رہا تھا......لیکن اس کے باوجود بعض اوقات دور دراز کے علاقوں میں شر پسند اب بھی وقتاً فوقتاً کوئی نہ کوئی شورش اورفتنہ برپا کئے رکھتے تھے......کوئی نہ کوئی قبیلہ سرکشی دکھاتا رہتا تھا...... اور پھر خصوصاً یہ کہ اسلامی ریاست اب بہت زیادہ وسعت بھی اختیار کر چکی تھی......لہٰذا اس قدر وسیع رقبے پر پھیلی ہوئی اس ریاست کے اطراف واکناف میں نظم وضبط اورامن وامان قائم رکھنا بہت ضروری تھا، اور یہ کوئی آسان کام نہیں تھا......لہٰذا فتحِ مکہ کے بعد سر اٹھانے والی ایسی مختلف شورشوں کی بیخ کنی اورسرکوبی کی غرض سے رسول اللہ ﷺ جزیرۃ العرب کے طول وعرض میں مختلف مقامات پر اورمختلف قبائل کی جانب فوجی مُہمات (۱) ارسال فرماتے رہے......فتحِ مکہ کا تاریخی واقعہ ہجرت کے آٹھویں سال پیش آیا تھا، اس کے اگلے ہی سال یعنی ہجرت کے نویں سال رسول اللہ ﷺ نے مدینہ منورہ سے ایسی جو فوجی مہمات ارسال فرمائیں ان کی تعداد سولہ تھی۔

ایسی ہی ایک فوجی مُہم اُن دنوں رسول اللہ ﷺ نے حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کی زیرِ قیادت قبیلہ ''طَی'' کی جانب روانہ فرمائی تاکہ اس قبیلے کی طرف سے برپا کردہ شورش کا خاتمہ کیا جاسکے، یہ وہی قبیلہ تھا کہ جس کا سردار کسی زمانے میں 'حاتم طائی' نامی شخص ہوا

(۱) یعنی مسلح فوجی دستے۔

کرتا تھا(۱) جس کی سخاوت وفیاضی، انسان دوستی، ہمدردی، مہمان نوازی اور غریب پروری کی داستانیں ملکِ عرب کے طول وعرض میں ضرب المثل بنی ہوئی تھیں (۲) حاتم طائی خود تو رسول اللہ ﷺ کی بعثت اور دینِ اسلام کا سورج طلوع ہونے سے قبل ہی اس جہانِ فانی سے کوچ کر چکا تھا......البتہ اب اُس کا لائق وفائق بیٹا ''عدی بن حاتم'' اپنے اس قبیلے ''طی'' کا سردار تھا۔

ظہورِ اسلام سے قبل جب حاتم طائی اس قبیلے کا سردار تھا تب اس نے شرک اور بت پرستی سے تائب ہوکر دینِ نصرانیت اختیار کرلیا تھا (۳) اور یہی وجہ تھی کہ اس کا بیٹا ''عدی'' بھی نصرانی مذہب ہی کا پیروکار تھا۔

اس قبیلہ ''طی'' کی جانب سے جب ''شورش'' کا آغاز ہوا تو اس کی سرکوبی کی غرض سے رسول اللہ ﷺ کے حکم پر حضرت علی رضی اللہ عنہ اسلامی دستے کی قیادت کرتے ہوئے مدینہ سے اس علاقے کی جانب رواں دواں ہوگئے کہ جو اس قبیلے کا مسکن تھا (۴) وہاں پہنچنے کے بعد اسلامی لشکر اور قبیلہ ''طی'' والوں میں جنگ کی نوبت آئی، جس کے نتیجے میں مسلمانوں کو غلبہ نصیب ہوا، جبکہ قبیلہ ''طی'' والے شکست کھا گئے، بڑی تعداد میں وہ اِدھر اُدھر بھاگ کھڑے ہوئے، نیز ان کی بہت بڑی تعداد مسلمانوں کے ہاتھوں قیدی بنی،

(۱) قبیلہ ''طی'' کی طرف نسبت کی وجہ سے ''طائی'' کہلاتا تھا۔

(۲) بلکہ آج بھی مہمان نوازی اور سخاوت وفیاضی میں ''حاتم طائی'' کی مثالیں دی جاتی ہیں......اور یہ کیفیت صرف ملکِ عرب تک ہی محدود نہیں ہے، بلکہ عرب وعجم میں ہر جگہ یہی صورتِ حال موجود ہے۔

(۳) ظہورِ اسلام سے قبل دینِ نصرانیت ہی آسمانی اور الہامی دین تھا۔

(۴) یہ علاقہ آجکل سعودی عرب میں ''حائل'' کے نام سے مشہور ہے، جو کہ مدینہ منورہ سے تقریباً چار سو کلومیٹر کی مسافت پر واقع ہے۔

جبکہ ان کا سردار ''عدی بن حاتم الطائی'' اپنے علاقے سے بچ نکلنے میں کامیاب رہا، اور وہاں سے فرار ہونے کے بعد وہ مسلسل سفر کرتا ہوا ملکِ شام جا پہنچا، جہاں اس نے اپنے ہم مذہب لوگوں یعنی ''رومیوں'' کی پناہ حاصل کر لی (۱)

دوسری جانب مسلمان جب کامیاب و کامران وہاں سے واپس مدینہ کی جانب عازمِ سفر ہوئے تو اب ان کے ہمراہ اس شکست خوردہ قبیلہ ''طی'' سے تعلق رکھنے والے قیدی بھی بڑی تعداد میں موجود تھے، اور اسی کیفیت میں مسلسل سفر کرتے ہوئے یہ اسلامی لشکر آخر واپس مدینہ منورہ آ پہنچا۔

☆......سَفّانہ بنت حاتم الطائی:

ایک روز رسول اللہ ﷺ جب مسجدِ نبوی کے قریب سے گذر رہے تھے تب وہاں ان قیدیوں میں سے کچھ لوگ موجود تھے، انہی میں سے ایک عورت نے آگے بڑھ کر رسول اللہ ﷺ سے رُکنے کی درخواست کی، اور اپنی طرف متوجہ کرتے ہوئے یوں کہنے لگی: ''مجھے دیکھئے...... میں اپنے قبیلے ''طی'' کے سابق سردار ''حاتم طائی'' کی بیٹی ہوں......اور قبیلے کے موجودہ سردار ''عدی بن حاتم'' کی بہن ہوں......میرا باپ ملکِ عرب کا انتہائی سخی، مہمان نواز اور مہربان ترین انسان تھا......جس کی سخاوت وفیاضی اور انسان دوستی وہمدردی ضرب المثل تھی......لیکن وہ تو اب اس دنیا میں نہیں رہا ......اور میرا بھائی بھی اس وقت بہت دور ہے......وقت بدل چکا......حالات بدل گئے......سبھی کچھ بدل گیا......اے اللہ کے رسول!

(۱) ملکِ شام اس زمانے میں ''سلطنتِ روم'' کا حصہ تھا، اور ''رومی'' نصرانی مذہب کے پیروکار تھے، جبکہ عدی بن حاتم بھی اپنے باپ حاتم طائی کی طرح دینِ نصرانیت اختیار کر چکا تھا، لہٰذا مسلمانوں کے ہاتھوں شکست وپسپائی کے بعد اب وہ پناہ کی تلاش میں اپنے ان ہم مذہب لوگوں کے پاس آ پہنچا اور وہیں رہائش اختیار کر لی۔

مجھے دیکھئے......میں آپ کے سامنے کھڑی ہوں......سفّانہ......حاتم طائی کی بیٹی......میرا باپ جو ہمیشہ مجبور ولاچار لوگوں کی مدد کیا کرتا تھا......بے آسرا اور بے ٹھکانہ لوگوں کو ٹھکانہ فراہم کیا کرتا تھا......آج میں اس کی بیٹی خود مجبور ہوں......لاچار ہوں......اور بے ٹھکانہ ہوں......!

رسول اللہ ﷺ اس کی اس گفتگو سے بہت زیادہ متأثر ہوئے، اور چونکہ اس کا باپ انتہائی سخی انسان تھا......اور ظاہر ہے کہ سخاوت و مہربانی ' مہمان نوازی اور انسان دوستی......یہ سب کچھ تو یقیناً اعلیٰ ترین اخلاق میں سے ہے......لہٰذا آپؐ نے اس کی اس خوش اخلاقی کا لحاظ کیا......اور جب اس کی خوش اخلاقی کا لحاظ کیا تو پھر مزید یہ کہ آپؐ نے اس کی اس بیٹی کا بھی لحاظ کیا......کہ......عظیم باپ کی عظیم بیٹی ہے......اور پھر آپؐ نے اس کے ساتھ خوب اکرام کا معاملہ فرماتے ہوئے اسے بہت سے ہدایا و تحائف عنایت فرمائے، نیز اس کیلئے آزادی اور اس قید سے رہائی کا اعلان بھی فرمایا۔

رسول اللہ ﷺ کی طرف سے اس انعام و اکرام اور حسنِ سلوک اور پھر اپنی رہائی کی یہ خوشخبری سننے کے بعد اس نے نہایت گرمجوشی کے ساتھ آپؐ کا شکریہ ادا کیا......البتہ اس موقع پر اس نے اس بات کا عملی ثبوت پیش کیا کہ واقعی وہ عظیم باپ کی عظیم بیٹی تھی......چنانچہ رسول اللہ ﷺ کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے وہ یوں کہنے لگی کہ ''اے اللہ کے رسول! میں اکیلی آزاد ہو جاؤں......اور یہاں سے اپنے علاقے کی طرف چلتی بنوں......جبکہ یہ میرے قبیلے والے سبھی لوگ یہاں قید و بند کی صعوبتیں برداشت کرتے رہیں......میں ایسا نہیں کر سکتی......لہٰذا......یا تو میں بھی انہی کے ساتھ یہاں مسلسل قید میں ہی رہوں گی، اور یا یہ سب میرے ہمراہ جائیں گے''۔

اپنے قبیلے والوں کیلئے اس کا یہ جذبہ اوران کیلئے یہ اس قدر خلوص اور وفا دیکھ کر رسول اللہ ﷺ مزید متأثر ہوئے......اورتب آپؐ نے ان سبھی کی رہائی کا حکم صادر فرمایا......جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اب ''سفّانہ'' سمیت قبیلہ ''طی'' سے تعلق رکھنے والے یہ تمام افراد مسلمان ہوگئے......اور یوں نبیٔ رحمتﷺ کی خوش اخلاقی' انسان دوستی اور بے مثال حسنِ سلوک کی بدولت یہ لوگ اب دینِ برحق کی نعمت سے مالا مال ہونے کے بعد مدینہ منورہ سے اپنے علاقے کی جانب روانہ ہوگئے۔

سفّانہ نے اپنے گھر پہنچنے کے بعد بہت جلد وہاں سے ملکِ شام کی طرف رختِ سفر باندھا......اوروہاں پہنچنے کے بعداس نے اپنے بھائی عدی بن حاتم سے ملاقات کی، اوراسے رسول اللہﷺ کے اعلیٰ اخلاق اور بے مثال حسنِ سلوک کے بارے میں' نیز اپنے قبولِ اسلام کے بارے میں مطلع کیا، نیز اس موقع پر اس نے نہایت اصرار اور گرمجوشی کے ساتھ اسے بھی دینِ برحق قبول کرلینے کا مشورہ دیا، چنانچہ بہن کے اس مخلصانہ مشورے پر عمل کرتے ہوئے وہ ملکِ شام سے سفر کرتا ہوا مدینہ پہنچا، جہاں اسے رسول اللہﷺ کی خدمت میں حاضری اوردینِ اسلام کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کا موقع ملا، جس کے نتیجے میں وہ مسلمان ہوگیا......اور یوں وہ محض عدی بن حاتم سے اب رسول اللہ ﷺ کے صحابی حضرت عدی بن حاتم رضی اللہ عنہ بن گئے......اب ان کے شب وروز رسول اللہﷺ کی خدمت میں گذرنے لگے جہاں وہ نہایت ذوق وشوق کے ساتھ ہمہ وقت آپؐ سے کسبِ فیض اور تحصیلِ علمِ دین میں مشغول ومنہمک رہنے لگے......رسول اللہ ﷺ سے روایت کردہ ان کی متعدد احادیث صحاحِ ستہ میں موجود ہیں۔

الحمدللہ آج بتاریخ ۷/محرم ۱۴۳۵ھ، مطابق ۱۰/نومبر ۲۰۱۳ء بروز اتوار یہ باب مکمل ہوا۔

غزوۂ تبوک

رسول اللہ ﷺ اور آپ کے جاں نثار صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کو سالہا سال سے مشرکینِ مکہ کی جانب سے جارحیت اور مخالفت کا سامنا تھا، وقتاً فوقتاً مختلف جنگوں کے بعد بالآخر سن آٹھ ہجری میں فتحِ مکہ کا یادگار اور تاریخی واقعہ پیش آیا' جو کہ حق و باطل کے درمیان فیصلہ کن مرحلہ ثابت ہوا، جس کے نتیجے میں مشرکینِ مکہ کی تمامتر شان وشوکت داستانِ ماضی بن کر رہ گئی ......اس فتحِ مبین کے بعد مشرکینِ مکہ کی طرف سے چند معمولی جھڑپوں کے سوا باقاعدہ کوئی بڑی مشکل پیش نہیں آئی۔

لیکن مشرکینِ مکہ کی طرف سے اب اس بے فکری اور یکسوئی حاصل ہونے کے بعد جلد ہی' یعنی اگلے ہی سال سن ۹ ہجری میں ایک اور بڑی آزمائش سامنے آکھڑی ہوئی، وہ یہ کہ رسول اللہ ﷺ کو اور مسلمانوں کو مسلسل اس قسم کی خبریں موصول ہونے لگیں کہ روئے زمین کی سب سے بڑی قوت یعنی ''سلطنتِ روم'' نے مسلمانوں پر یلغار کرنے اور انہیں ہمیشہ کیلئے نیست و نابود کردینے کا قطعی فیصلہ کرلیا ہے......اور اس مقصد کیلئے ملکِ شام کی سرحدوں پر ''تبوک'' نامی مقام پر ان کا بہت بڑا لشکر جمع ہو چکا ہے......!

یہ خبر مسلمانوں کیلئے انتہائی تشویش کا باعث بنی، رسول اللہ ﷺ نے اپنے جاں نثار ساتھیوں کو تیاری کا حکم دیا۔

غزوۂ تبوک (جو کہ آپ ﷺ کی حیاتِ طیبہ میں آخری غزوہ ثابت ہوا تھا) کے موقع پر کچھ ایسے حالات وواقعات پیش آئے جو اس سے قبل کبھی کسی غزوے کے موقع پر پیش نہیں آئے

تھے، اور اسی وجہ سے یہ غزوہ بہت زیادہ اہمیت اختیار کر گیا تھا...... مثلاً یہ کہ:

☆ ...... یہ جنگ اُس دور میں تمام روئے زمین کی سب سے بڑی اور نہایت خطرناک قوت یعنی "سلطنتِ روم" کے خلاف لڑی جانے والی تھی۔

☆ ......اس سے قبل جتنے غزوات پیش آئے تھے وہ سب مشرکینِ عرب کے خلاف لڑے گئے تھے، اگرچہ چند غزوات یہود کے خلاف بھی لڑے گئے تھے، لیکن وہ یہود صدیوں سے جزیرۃ العرب میں ہی آباد تھے، لہٰذا زبان' لب ولہجہ' رہن سہن' نیز فنونِ حرب وغیرہ کے لحاظ سے وہ کافی حد تک مقامی عرب باشندوں جیسے ہی تھے۔

مقصد یہ کہ گذشتہ تمام جنگوں کے موقع پر اگرچہ عقیدہ وایمان کے لحاظ سے تو ظاہر ہے کہ مسلمانوں میں اور ان کے مدِ مقابل دشمنوں میں زمین وآسمان کا فرق تھا...... البتہ زبان' لب ولہجہ' فنونِ حرب' اور سامانِ جنگ وغیرہ کے لحاظ سے دونوں میں مکمل مماثلت تھی ...... جو اسلحہ مسلمانوں کے پاس تھا' وہی دشمن کے پاس بھی تھا، جنگ لڑنے کے جو طور طریقے مسلمانوں کے تھے' وہی دشمن کے بھی تھے...... جو زبان مسلمان بولتے تھے' وہی زبان دشمن بھی بولتے تھے...... البتہ فرق صرف تعداد کا تھا...... یعنی سامانِ جنگ کی نوعیت میں تو اگرچہ مماثلت تھی لیکن تعداد میں بہت فرق تھا...... مسلمانوں کی تعداد ہمیشہ کم رہی جبکہ دشمن ہمیشہ بڑے لشکرِ جرار کے ہمراہ یلغار کرتا رہا...... مسلمانوں کو ہمیشہ سامانِ جنگ کی قلت درپیش رہی' جبکہ دشمن کے پاس ہمیشہ سامانِ جنگ نیز ہر قسم کے اسباب ووسائل کی خوب فراوانی رہی......!

اب غزوۂ تبوک جب درپیش آیا تو یہ پہلا موقع تھا کہ دشمن بالکل نیا اور نامانوس تھا...... ایک بالکل نئے اور اجنبی دشمن کے ساتھ مقابلے کی نوبت آرہی تھی کہ جس کی زبان بھی مختلف تھی،

جس کے جنگ لڑنے کے انداز اور طور طریقے بھی یقیناً مختلف ہوں گے......شاید سامانِ جنگ اور فنونِ حرب بھی جدا ہوں گے(۱) رسول اللہ ﷺ کے جاں نثار صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین ایمانی کیفیت کے لحاظ سے جن بلندیوں پر تھے' یقیناً اس میں کسی شک وشبہ کی قطعاً کوئی گنجائش نہیں ہے......لیکن یہ بھی تو حقیقت ہے کہ وہ کوئی آسمانی مخلوق نہیں تھے......وہ بھی گوشت پوست کے انسان ہی تھے......لہٰذا یہ تمام باتیں ان کیلئے بھی یقیناً پریشانی کا باعث تھیں(۲)

☆......یہ سفر بہت زیادہ طویل تھا، مدینہ سے تبوک تک مسافت بہت زیادہ تھی اور راستہ کافی دشوار گذار بھی تھا، سفری سہولتوں کا فقدان تھا، اس سے قبل کبھی کسی غزوے کے موقع پر اس قدر طویل سفر کی نوبت نہیں آئی تھی۔

☆......یہ غزوہ ایسے موسم میں پیش آیا کہ جب قحط سالی چل رہی تھی، غلہ واناج کی کمی تھی،

(۱) اگر چہ اس سے صرف ایک سال قبل ہی یعنی سن آٹھ ہجری میں سلطنتِ روم کے خلاف مشہور ومعروف ''غزوۂ مؤتہ'' کی نوبت آئی تھی، اس موقع پر اگر چہ جنگ شروع ہونے کے بعد صورتِ حال یقیناً نازک اور خطرناک ہوگئی تھی......لیکن ابتداء میں وہ معاملہ دراصل اس قدر نازک نہیں تھا، کیونکہ وہ تو رومیوں کے ایک ظالم وجابر گورنر کے ہاتھوں رسول اللہ ﷺ کے ایک قاصد کو ناحق قتل کئے جانے کے بعد جوابی اور تادیبی کارروائی کی غرض سے ایک مہم ملکِ شام کی جانب روانہ کی گئی تھی......مزید یہ کہ اس موقع پر رسول اللہ ﷺ نے بھی شرکت نہیں فرمائی تھی......جبکہ باقاعدہ علی الاعلان سلطنتِ روم کے خلاف ایک بڑی جنگ کی حیثیت سے یہی ''غزوۂ تبوک'' ہی پہلا موقع تھا۔

(۲) بلکہ یہ تو ان کی مزید رفعتِ شان کا واضح ثبوت ہے کہ اس قدر نازک اور خطرناک ترین صورتِ حال اور اتنی زیادہ مشکلات کے باوجود ان کے قدم ڈگمگائے نہیں......اور نہ ہی ان کی استقامت میں کوئی لغزش آسکی......اور کس طرح اللہ پر توکل کئے ہوئے وہ حضرات بغیر کسی ٹال مٹول اور بغیر کسی تردد کے......جان ہتھیلی پر لئے ہوئے ......رسول اللہ ﷺ کے ہمراہ تبوک کی جانب رواں دواں ہوگئے......!!

نیز وسائل کی شدید قلت کا سامنا تھا،حتیٰ کہ جب یہ لشکرتبوک کی جانب روانہ ہوا تو کیفیت یہ تھی کہ اٹھارہ افراد باری باری ایک اونٹ پرسفرکررہے تھے...... یوں یہ طویل فاصلہ طے کیا گیا۔

☆ ......سخت گرمی کا موسم تھا،گرمی کی شدت کی وجہ سے منافقین ایک دوسرے کو یوں کہتے پھر رہے تھے کہ ''اس قدر شدید گرمی میں مت سفر کرنا'' قرآن کریم میں منافقین کی اسی بات کا یوں تذکرہ کیا گیا ہے:﴿وَقَالُوا لَاتَنفِرُوا فِي الحَرِّ﴾ یعنی یہ منافقین یوں کہتے ہیں کہ ''گرمی میں مت نکلو'' اس پر اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی جانب سے ان کیلئے یہ شدید وعید نازل ہوئی﴿قُل نَارُجَهَنَّمَ أَشَدُّ حَرّاً ، لَوكَانُوا يَفقَهُونَ﴾ (۱)یعنی''اے نبیؐ! آپ کہہ دیجئے کہ جہنم کی آگ تو بہت زیادہ گرم ہے،کاش وہ سمجھتے''

مطلب یہ کہ کاش وہ اس بات کو سمجھتے کہ دنیا کی جس گرمی سے بچنے کی خاطر وہ اللہ اور رسولؐ کے حکم کی خلاف ورزی کے مرتکب ہورہے ہیں اور یوں اپنے لئے جہنم کا سامان کررہے ہیں' کاش وہ اس بات کو سمجھتے کہ جہنم کی وہ گرمی تو دنیا کی اِس گرمی کے مقابلے میں بہت زیادہ شدید ہوگی......تب وہاں وہ کیا کریں گے......؟

الغرض منافقین کی طرف سے اس قسم کی باتوں کا نتیجہ یہ تھا کہ گرمی کے ساتھ ساتھ منافقین کی یہ باتیں بھی اس موقع پر پست ہمتی' حوصلہ شکنی اور بددلی پھیلانے کا سبب بن رہی تھیں۔

☆ ......کھجوریں پکنے کا موسم تھا،اُن لوگوں کی زندگی میں کھجوروں کی بہت زیادہ اہمیت تھی، کھجورہی ان کی خوراک تھی،کھجورہی ان کا ذریعۂ معاش تھی،کھجور کی تجارت بڑے پیمانے پرکی جاتی تھی،کھجور پرہی ان کی گذر بسر کا بڑی حد تک دارومدار تھا...... چنانچہ بڑی محنت

(۱)التوبہ[۸۱]

سے تیار کردہ کھجور کی یہ فصل جب تیار ہو رہی تھی اور سال بھر کی محنت کا جب پھل سامنے نظر آنے لگا تھا......ایسے میں اپنی محنت کے اس پھل کو یوں چھوڑ کر چلتے بننا......جبکہ یہ خبر بھی نہ ہو کہ واپسی کب ہوگی......؟ یقیناً یہ بہت ہی مشکل کام تھا۔

غرضیکہ اس غزوے کے موقع پر یہ تمام مشکلات درپیش تھیں، اور یہی وجہ تھی کہ خود قرآن کریم میں اس موقع کو ''ساعۃ العُسر ۃ''، یعنی ''مشکل کی گھڑی'' کے نام سے یاد کیا گیا ہے، چنانچہ ارشادِ ربانی ہے: ﴿لَقَد تَابَ اللّٰہُ عَلَیٰ النَّبِيِّ وَالمُھَاجِرِینَ وَالأنصَارِ الَّذِینَ اتَّبَعُوہُ فِي سَاعَۃِ العُسرَۃ......﴾ (۱) یعنی ''بے شک اللہ نے نبی کے حال پر توجہ فرمائی، اور مہاجرین وانصار کے حال پر بھی، جنہوں نے ''مشکل کے وقت'' نبی کا ساتھ دیا......''

☆......اس غزوے کیلئے روانگی کے موقع پر اس قدر مشکلات کا سامنا تھا کہ اُس معاشرے میں اسی چیز کو مؤمن اور منافق میں پہچان اور تمیز کیلئے ''معیار'' سمجھا جانے لگا، یعنی جو اس غزوے میں شریک ہوا وہی ''مؤمن'' ہے، اور جو کوئی [بغیر کسی شرعی عذر کے] اس غزوے میں شریک نہیں ہوا وہ ہمیشہ کیلئے ''منافق'' کہلایا (۲) کیونکہ اس قدر تکالیف اور مشکلات نیز انتہائی صبر آزما قسم کے حالات کے باوجود اللہ اور رسول ﷺ کے حکم کے سامنے سرِ تسلیم خم کرتے ہوئے اس غزوے کے موقع پر نکل پڑنا......یہ کام تو صرف اہلِ ایمان ہی انجام دے سکتے تھے......منافقین کے بس کی یہ بات نہیں تھی......!

☆......اس غزوے کے موقع پر جتنی بڑی تعداد میں قرآن کریم کی آیات نازل ہوئیں،

(۱) سورۃ التوبہ [۱۱۷]

(۲) ماسوائے تین حضرات، یعنی کعب بن مالک، ہلال بن امیہ اور مرارہ بن الربیع رضی اللہ عنہم......

کسی اورغزوے کے موقع پراتنی آیات نازل نہیں ہوئیں،اس سے بھی اس غزوے کی خاص اہمیت واضح ہوتی ہے۔(۱)

☆......رسول اللہ ﷺ کامعمول یہ تھا کہ اس سے قبل ہمیشہ احتیاطی تدبیر کے طور پرآپؐ ہرغزوے کے موقع پرراز داری سے کام لیا کرتے تھے،مثلاً یہ کہ لشکرکی روانگی کب ہوگی؟کس راستے پرسفرکیاجائے گا......؟وغیرہ وغیرہ......تاکہ دشمن کوآپؐ کے منصوبوں کے بارے میں کوئی پیشگی معلومات حاصل نہ ہوسکیں۔

لیکن اس غزوے کے موقع پر چونکہ مذکورہ بالاتمام مشکلات کی وجہ سے صورتِ حال کافی نزاکت اختیارکرچکی تھی اورمعاملہ بہت حساس ہوچکاتھا......لہٰذارسول اللہ ﷺ نے رازداری سے کام لینے اورمعاملات کوخفیہ رکھنے کی بجائے تیاری کاعام اعلان فرمادیا، نیز دوردراز کے علاقوں مثلاً مکہ اورطائف وغیرہ تک آپؐ نے قاصدروانہ فرمائے تاکہ وہاں جاکرلوگوں کواس غزوے میں شرکت سے متعلق آپؐ کی طرف سے پیغام پہنچائیں،جس پر دوردراز کے علاقوں سے بھی نہایت جوش وجذبے کے ساتھ بڑی تعداد میں دستے مدینہ پہنچنے لگے۔

آخراپنی طرف سے مناسب تیاری کرلینے کے بعدرسول اللہ ﷺ تیس ہزارجاں نثاروں پر مشتمل اپنے لشکرکی قیادت کرتے ہوئے مدینہ سے تبوک کی جانب رواں دواں ہوگئے اور تقریباًایک ہزارکلومیٹرکایہ سفرپندرہ دن میں طے کیاگیا۔

منزلِ مقصودیعنی''تبوک''کےمقام پرپہنچنے کے بعداللہ سبحانہ وتعالیٰ کی طرف سے مسلمانوں

(۲)اس غزوے سے متعلق نازل شدہ آیات سورہ''توبہ''میں ہیں،بلکہ اس سورت کانام''توبہ''جس واقعے کی طرف نسبت کی وجہ سے معروف ہوگیاُتوبہ کے اس واقعے کاتعلق بھی اسی غزوۂ تبوک ہی سے ہے۔

کیلئے غیبی امداد اس شکل میں ظاہر ہوئی کہ وہاں رومیوں کے کسی بڑے لشکر کا کوئی وجود ہی نظر نہیں آیا......جس کا مطلب یہ تھا کہ یا تو رومی فوج مدینہ سے اسلامی لشکر کی تبوک کی جانب روانگی کی اطلاع ملنے پر جنگ کا ارادہ ملتوی کرتے ہوئے اس سرحدی علاقے سے اب واپس جا چکی تھی ......یا پھر یہ کہ تبوک میں رومی فوج کے بڑے پیمانے اجتماع کے بارے میں مسلمانوں کو جو خبر دی گئی تھی، اس میں کوئی صداقت نہیں تھی اور وہ محض منافقین اور خفیہ بدخواہوں کی طرف سے اڑائی ہوئی افواہ تھی......تاکہ اس طرح مسلمانوں کو خوفزدہ اور پریشان کیا جائے، ذہنی ونفسیاتی صدمے سے دوچار کیا جائے، نیز یہ کہ کسی طرح انہیں بڑی تعداد میں مدینہ سے باہر دور دراز کے مقام پر بھیج دیا جائے تاکہ شاید وہاں خود بخود یہ کسی بڑی مصیبت میں پھنس کر رہ جائیں اور انہیں مدینہ کی جانب واپسی نصیب ہی نہ ہو سکے۔

بہرحال وجہ جو بھی ہو......غلط خبر اُڑائی گئی ہو......یا یہ کہ رومی واقعی بڑی تعداد میں وہاں جمع ہوئے تھے اور پھر واپس لوٹ گئے تھے......بہرصورت مسلمانوں کیلئے بہتری ہی بہتری تھی کہ جنگ کی کوئی نوبت ہی نہیں آئی۔

اسی کیفیت میں رسول اللہ ﷺ اپنے لشکر کے ہمراہ بیس روز مسلسل تبوک میں ہی مقیم رہے تاکہ صورتِ حال خوب اچھی طرح واضح ہو جائے......تاہم اس طویل قیام کے باوجود وہاں رومی فوج کا کوئی بڑا دستہ نظر نہیں آیا اور نہ ہی ان کی جانب سے کوئی ایسی مشکوک نقل وحرکت مشاہدے میں آئی کہ جس سے مسلمانوں کے خلاف ان کے جنگی عزائم کا اظہار ہوتا ہو......البتہ وقتاً فوقتاً ان کے چھوٹے اور معمولی قسم کے اکا دکا دستے نظر آتے رہے، لیکن ان کی طرف سے جب کسی شرارت یا جارحیت کے کوئی آثار نظر نہیں آئے تو آپ ﷺ نے بھی

ان کے ساتھ کسی چھیڑ چھاڑ اور تصادم سے گریز کیا، جس سے یقیناً آپؐ کی صلح پسندی ظاہر ہوتی ہے۔ آخر آپؐ نے واپسی کا فیصلہ فرمایا اور پھر تبوک سے مدینہ کی جانب سفر کرتے ہوئے آپؐ اپنے جاں نثار ساتھیوں سمیت بخیر و عافیت ماہِ رجب سن ۹ ہجری میں مدینہ منورہ واپس پہنچ گئے، یہ سفر کل پچاس دن کا تھا، جس میں سے بیس دن تبوک میں قیام رہا، جبکہ باقی تیس دن آمد و رفت میں صرف ہوئے۔

☆......نتائج:

غزوۂ تبوک کے موقع پر اگرچہ مسلمانوں کو بہت زیادہ مشکلات اور ظاہری و نفسیاتی ہر قسم کی پریشانیوں سے دوچار ہونا پڑا، حتیٰ کہ انہی مشکلات کی وجہ سے یہ غزوہ مؤمنین اور منافقین کے مابین تمیز اور پہچان کا معیار بن گیا...... تاہم نتائج کے اعتبار سے یہ غزوہ مسلمانوں کے حق میں بہت ہی بہتر اور انتہائی مفید ثابت ہوا، مثلاً یہ کہ:

☆......اس غزوے کے موقع پر اگرچہ مشکلات تو بہت زیادہ درپیش تھیں، لیکن منزلِ مقصود یعنی ''تبوک'' پہنچنے کے بعد نہ تو کوئی دشمن نظر آیا اور نہ ہی کسی جنگ کی نوبت آئی...... اس طرح اللہ سبحانہ و تعالیٰ کی طرف سے مسلمانوں کیلئے غیبی امداد کا انتظام اور بے فکری و مسرت کا سامان کیا گیا۔

☆......وہاں جزیرۃ العرب اور سلطنتِ روم کے مابین اس سرحدی علاقے میں بڑی تعداد میں ایسے جنگجو قبائل آباد تھے کہ جو اگرچہ عرب تھے، لیکن وہ نصرانی تھے، نیز سیاسی طور پر وہ سلطنتِ روم کے زیرِ اثر بھی تھے، یعنی عرب ہونے کے باوجود وہ رومیوں کے ہم مذہب بھی تھے اور ان کے زیرِ اثر بھی تھے، اور اسی وجہ سے ان کی تمام تر وفاداریاں بھی رومیوں کے ساتھ ہی تھیں، غرضیکہ دینی، سیاسی، واقتصادی، ہر لحاظ سے وہ رومیوں کے ہی

ساتھی اور ہمنوا تھے۔

لیکن اب رسول اللہ ﷺ کی وہاں تشریف آوری اور بیس روزہ قیام کے موقع پر ان میں سے متعدد قبائل کے سرکردہ افراد اور رہنما آپ کی خدمت میں ازخود حاضر ہوئے، اور اپنی طرف سے مسلمانوں کے خلاف ہر قسم کی جارحیت سے باز رہنے کا یقین دلاتے ہوئے صلح کی خواہش نیز جذبۂ خیرسگالی کا اظہار کیا...... یہ بات مسلمانوں کیلئے یقیناً باعثِ مسرت تھی۔

☆...... مدینہ اور اس کے مضافات میں اب تک منافقین کی بڑی تعداد موجود تھی، جو کہ چھپے ہوئے دشمن اور آستین کے سانپ کی حیثیت رکھتے تھے، مسلمانوں کی ان بڑھتی ہوئی فتوحات سے وہ انتہائی نالاں اور رنجیدہ تھے، دینِ اسلام اور پیغمبرِ اسلام کو نقصان پہنچانے کیلئے ہمیشہ موقع کی تلاش میں رہتے تھے، پہلے وہ مشرکینِ مکہ کے ساتھ مل کر مسلمانوں کے خلاف سازشوں کے تانے بانے بننے میں مصروف رہتے تھے، اب مزید یہ کہ انہوں نے مسلمانوں کے ایک اور بڑے دشمن اور روئے زمین کی بہت بڑی قوت یعنی "سلطنتِ روم" کے ساتھ بھی خفیہ تعلقات استوار کر لئے تھے، مسلمانوں کی خبریں وہ خفیہ طور پر رومیوں تک پہنچایا کرتے تھے، نیز مدینہ میں خفیہ مقامات پر وہ مسلمانوں کو نقصان پہنچانے اور ان کے خلاف سازشیں تیار کرنے اور خفیہ منصوبے تیار کرنے کی غرض سے خفیہ اجتماعات منعقد کیا کرتے تھے، چنانچہ غزوۂ تبوک کے موقع پر جو کچھ ہوا اس میں بھی انہی کی طرف سے پھیلائی گئی افواہوں کا بہت بڑا عمل دخل تھا، مسلمانوں میں تشویش اور افراتفری پھیلانے نیز انہیں خوفزدہ و پریشان کرنے کی غرض سے یہی منافقین، رومیوں کی طرف سے مدینہ پر بڑے تباہ کن حملے کیلئے تیاریوں کی جھوٹی خبریں پھیلاتے رہے، اور پھر جب رسول اللہ ﷺ اپنے لشکر کے ہمراہ تبوک کی جانب روانہ ہوئے تب یہ ایک دوسرے کو مبارکباد دیتے

رہے اور بہت خوشیاں مناتے رہے......کہ یہ مسلمان چلے ہیں اب اتنی بڑی قوت سے ٹکر لینے کیلئے......جب ان کا رومیوں کے ساتھ آمنا سامنا ہوگا اور جنگ کی نوبت آئے گی ......تو یقیناً یہ سب نیست ونابود ہوجائیں گے......ان میں سے کسی ایک کو بھی اپنی جان بچاکر زندہ واپس آنا نصیب نہیں ہوگا......یہ سب وہیں مارے جائیں گے......لہٰذا ان مسلمانوں سے ہمیشہ کیلئے ہماری جان چھوٹ جائے گی......!

لیکن رسول اللہ ﷺ اپنے جاں نثار ساتھیوں سمیت کامیاب وکامران ......اور ہنسی خوشی واپس مدینہ تشریف لائے ......وہاں تبوک میں کسی جنگ کی نوبت ہی نہیں آئی، لہٰذا کوئی جانی یا مالی نقصان بھی نہیں ہوا، مسلمانوں کی تمام قوت محفوظ رہی، بلکہ عزت وشوکت مزید بڑھ گئی......مزید یہ کہ وہاں بہت سے سرحدی قبائل کے سرداروں نے آکر خود مسلمانوں کے ساتھ صلح کرلی، اپنی طرف سے وفاداری اور عدمِ جارحیت کا یقین دلایا، اور خیرسگالی کا اظہار کیا......یوں مسلمانوں کیلئے یہ سفر تو بہت زیادہ کامیاب اور مفید ثابت ہوا......یہ صورتِ حال ان منافقوں اور بدخواہوں کیلئے بڑے صدمے کا باعث بنی......ان کے دل مرجھانے لگے......یوں ان کے ناپاک عزائم خاک میں مل گئے......ان کے حوصلے پست ہوگئے......جبکہ مسلمانوں کے حوصلے مزید بلند ہوگئے......!!

☆......حضرت ام کلثوم رضی اللہ عنہا کی وفات:

سن ۹ ہجری میں غزوۂ تبوک سے کامیاب وکامران اور ہنسی خوشی واپسی کے فوری بعد رسول اللہ ﷺ کی صاحبزادی حضرت ام کلثوم رضی اللہ عنہا اس جہانِ فانی سے کوچ کرگئیں، تمام مسلمانوں کیلئے عموماً، اور آپؐ کیلئے خصوصاً ایک باپ کی حیثیت سے فطری اور طبعی طور پر یہ سانحہ بہت زیادہ رنج اور صدمے کا باعث بنا، جبکہ اس سے محض ایک سال قبل ہی آپؐ کی

بڑی صاحبزادی حضرت زینب رضی اللہ عنہا کا بھی انتقال ہو چکا تھا، اور اس سے بھی پہلے ماہِ رمضان سن ۲ ہجری میں عین غزوۂ بدر کے روز آپ ﷺ کی دوسرے نمبر کی صاحبزادی یعنی حضرت رقیہ رضی اللہ عنہا بھی انتقال کر چکی تھیں......

یوں رسول اللہ ﷺ کی چار صاحبزادیوں میں سے یہ تین صاحبزادیاں خود آپؐ کی حیاتِ طیبہ کے دوران، اور آپؐ کی آنکھوں کے سامنے......اور عین جوانی کی عمر میں......اس جہانِ فانی سے کوچ کر گئیں......اللہ تعالیٰ جنت الفردوس میں ان کے درجات بلند فرمائیں......

اور ہمیں اللہ تعالیٰ اپنے خاص فضل وکرم سے وہاں جنت الفردوس میں اپنے حبیب ﷺ نیز آپؐ کی آل اور تمام صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی صحبت ومعیت عطاء فرمائیں۔

آمین برحمتک یا ارحم الراحمین۔

☆......☆......☆

الحمدللہ آج بتاریخ ۱۹/محرم ۱۴۳۵ھ، مطابق ۲۲/نومبر ۲۰۱۳ء بروز جمعہ یہ باب مکمل ہوا۔

رَبَّنَا تَقَبَّل مِنَّا اِنّكَ أنتَ السَّمِيعُ العَلِيمُ ، وَتُب عَلَينَا اِنَّكَ أنتَ التَوَّابُ الرَّحِيم

عام الوفود؛ یعنی وفود کی آمد کا سال:

ہجرت کے آٹھویں سال ماہِ رمضان میں فتحِ مکہ کا یادگار اور عظیم ترین تاریخی واقعہ پیش آنے کے بعد دینِ اسلام کو اور مسلمانوں کو بڑی تقویت نصیب ہوئی، جبکہ مشرکین اور مخالفین کی قوت اور شان وشوکت بری طرح متأثر ہوئی، اور پھر محض اگلے ہی سال یعنی جب ہجرت کا نواں سال چل رہا تھا' تبوک سے مسلمانوں کی یوں صحیح سالم اور بخیر وعافیت واپسی اسلام اور مسلمانوں کیلئے مزید عزت ونیک نامی اور شان وشوکت کا سبب بنی، جبکہ مشرکین ومنافقین مزید کمزور پڑ گئے اور دل برداشتہ ہو گئے، اس تمام صورتِ حال کا نتیجہ یہ ظاہر ہوا کہ اب جزیرۃ العرب میں دینِ اسلام اجنبی یا نامانوس نہیں رہا، بلکہ اب دور دور تک اسلام کا چرچا ہونے لگا اور بڑی سرعت کے ساتھ دینِ اسلام پھیلتا چلا گیا......لوگ بڑی تعداد میں فوج درفوج مسلمان ہونے لگے......حتیٰ کہ اطراف واکناف اور دور دراز کے علاقوں میں آباد قبائل کو بھی اب اس بدلی ہوئی صورتِ حال میں دینِ اسلام اور پیغمبرِ اسلام کے بارے میں زیادہ سے زیادہ معلومات حاصل کرنے کی جستجو ہونے لگی، اور اس مقصد کیلئے مختلف قبائل نے اپنے وفود مدینہ ارسال کئے، چنانچہ ان دو سالوں یعنی ہجرت کے نویں اور دسویں سال بڑی تعداد میں وفود کی مدینہ آمد ہوئی، بالخصوص نویں سال یہ سلسلہ کافی عروج پر رہا اور اس سال مدینہ آنے والے ان وفود کی تعداد ستر سے زائد تھی' جن میں سے بعض وفود پچاس یا ساٹھ سے زائد افراد پر مشتمل تھے۔

دور دراز کے علاقوں سے تعلق رکھنے والے افراد پر مشتمل ان وفود کی بڑی تعداد میں مدینہ

آمد کا مقصد یہی تھا کہ یہ لوگ دینِ اسلام اور پیغمبرِ اسلام کی تعلیمات اور طور طریقوں کو اپنی آنکھوں سے دیکھ سکیں، قریب رہ کر ان تعلیمات کو جان سکیں اور پھر جانچ سکیں......

چنانچہ مدینہ میں قیام کے دوران یہ لوگ رسول اللہ ﷺ کی' نیز آپؐ کے جاں نثار ساتھیوں کی سادہ اور پاکیزہ زندگی کا اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کرتے، آپؐ کے اعلیٰ اخلاق و کردار کو دیکھتے، اور اس حقیقت کو دیکھتے کہ اب تو آپؐ کو ملکِ عرب کی وسیع سلطنت حاصل ہو چکی ہے، یعنی اب آپؐ محض اللہ کے نبی اور دینی رہنما ہی نہیں' بلکہ اس کے ساتھ ساتھ اب تو آپؐ اتنی بڑی سلطنت کے حکمران اور فرمانروا بھی بن چکے ہیں...... مگر اس کے باوجود کوئی فخر و غرور نہیں ہے...... کوئی زیب و زینت نہیں ہے...... کوئی عیش و عشرت نہیں ہے...... بس وہی سیدھی سادھی زندگی ہے...... مسجد کی وہی چٹائی آپؐ کا شاہی تخت ہے...... اور وہی پرانا عمامہ آج بھی آپؐ کے سر کا تاج ہے...... گھر میں ایک چارپائی ہے جو کہ بان کی رسیوں سے بُنی ہوئی ہے، جب آپؐ آرام کی غرض سے اس پر لیٹتے ہیں تو جسم مبارک پر ان رسیوں کے نشان پڑ جاتے ہیں...... آپؐ کے جاں نثاروں اور فرمانبرداروں کی بہت بڑی فوج موجود ہے' جو ہر دم ہر لمحہ اور ہر آن آپؐ کی خدمت کیلئے بیتاب رہتے ہیں، اور آپؐ کے اشارے کے منتظر رہتے ہیں، مگر اس کے باوجود آپؐ اپنے سبھی کام کاج خود ہی کرتے ہیں...... اپنے کپڑوں میں پیوند خود ہی لگاتے ہیں...... جوتا پھٹ جاتا ہے تو خود ہی اس کی مرمت کر لیتے ہیں...... اپنے کسی کام کیلئے کسی کو تکلیف نہیں دیتے...... دوسروں کو بھی یہی تاکید و تلقین کیا کرتے ہیں کہ کوئی کسی پر بوجھ نہ بنے...... ہر کوئی اپنا کام کاج خود کیا کرے...... آپؐ ہر ایک کی عزت کرتے ہیں...... کبھی کسی کا دل نہیں دکھاتے...... کسی کو تکلیف نہیں دیتے...... اور دوسروں کو بھی یہی تعلیم دیتے ہیں کہ کوئی کسی کا دل نہ دکھائے،

کسی کونقصان نہ پہنچائے......کسی کا حق نہ دبائے......کسی کوتکلیف نہ پہنچائے......نہ تو اپنی زبان سے......اور نہ ہی اپنی کسی حرکت سے......

دور دراز کے علاقوں سے آئے ہوئے یہ لوگ یہ تمام مناظر دیکھتے......اور متأثر ہوئے بغیر نہ رہ سکتے......اور پھر واپس اپنے علاقوں میں جا کر اپنے قبائل اور خاندان والوں کو بھی اس بارے میں تفصیلات سے آگاہ کرتے ، جس پر وہ سب بھی متأثر ہوتے......اور یوں اُس دور میں لوگ بہت بڑی تعداد میں فوج درفوج مسلمان ہوتے چلے گئے......چنانچہ اسی کا یہ نتیجہ تھا کہ محض ایک سال قبل یعنی ہجرت کے آٹھویں سال فتحِ مکہ کے تاریخی موقع پر رسول اللہ ﷺ کے ہمراہ آپؐ کے جاں نثار ساتھیوں کی تعداد دس ہزار تھی، اور پھر محض اگلے ہی سال یعنی ہجرت کے نویں سال غزوۂ تبوک کے موقع پر آپؐ جب اپنے لشکر کی قیادت کرتے ہوئے مدینہ سے تبوک کی جانب رواں دواں تھے تب یہ تعداد تیس ہزار تک جا پہنچی تھی......اور پھر محض اگلے ہی سال یعنی ہجرت کے دسویں سال آپؐ کے ہمراہ حجۃ الوداع کے یادگار موقع پر جو صحابۂ کرام شریک تھے ان کی تعداد ایک لاکھ سے تجاوز کر چکی تھی......!!

☆......☆......☆

الحمدللہ آج بتاریخ ۲۷/محرم ۱۴۳۵ھ، مطابق ۳۰/نومبر ۲۰۱۳ء بروز ہفتہ
یہ باب مکمل ہوا۔

رَبَّنَا تَقَبَّل مِنَّا اِنّكَ أنتَ السَّمِيعُ العَلِيمُ ، وَتُب عَلَينَا اِنَّكَ أنتَ التَوَّابُ الرَّحِيم

حجۃ الوداع:

بیت اللہ کے معمارِ اول اللہ کے جلیل القدر پیغمبر حضرت ابراہیم خلیل اللہ علیہ السلام تھے(۱) جنہوں نے اپنے فرزند حضرت اسماعیل علیہ السلام کے ساتھ مل کر اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے حکم کی تعمیل کے طور پر تعمیرِ کعبہ کا مقدس ترین اور تاریخی فریضہ انجام دیا، جب یہ دونوں حضرات تعمیرِ کعبہ کے مقدس کام سے فارغ ہوئے تو انہیں اللہ کی طرف سے یہ حکم دیا گیا کہ لوگوں کو حجِ بیت اللہ کا حکم سنائیں، جیسا کہ قرآن کریم میں ارشاد ہے: ﴿وَأَذِّنْ فِي النَّاسِ بِالْحَجِّ يَأْتُوكَ رِجَالًا وَعَلَىٰ كُلِّ ضَامِرٍ يَأْتِينَ مِن كُلِّ فَجٍّ عَمِيقٍ﴾ (۲)

ترجمہ: (لوگوں میں آپ حج کی منادی کردیجئے، لوگ آپ کے پاس آئیں گے پیادہ بھی اور دوردراز کے ہر راستے سے دبلے پتلے اونٹوں پر بھی)

یعنی دوردراز کے علاقوں سے طویل سفر کی مشقت وصعوبت برداشت کرنے کی وجہ سے سواری کے یہ جانور کمزور ولاغر ہو چکے ہوں گے۔

چنانچہ اللہ کے اس حکم کی تعمیل کرتے ہوئے حضرت ابراہیم خلیل اللہ علیہ السلام نے بیت اللہ کے قریب (صفا کی جانب) جبل ابی قبیس پر چڑھ کر یہ اعلان فرمایا۔

چنانچہ اس ندائے خلیل کے جواب میں دوردراز کے علاقوں اور تمام اطراف واکنافِ عالَم سے حجِ بیت اللہ کی غرض سے لوگوں کی آمد کا سلسلہ شروع ہو گیا، مکہ کے اس بلند وبالا پہاڑ کی چوٹی سے بلند ہونے والی اس نحیف صدا کو اللہ عزوجل نے اپنی قدرت سے دنیا کے کونے کونے تک پہنچا دیا، جس کا عملی مشاہدہ آج بھی حج وعمرہ کے موقع پر بخوبی کیا جا سکتا ہے۔

---

(۱) یعنی طوفانِ نوح [علیہ السلام] کے نتیجے میں بیت اللہ کے آثار ونشانات مٹ جانے کے بعد از سرِ نو معمارِ اول حضرت ابراہیم علیہ السلام اور ان کے فرزند حضرت اسماعیل علیہ السلام تھے۔ (۲) الحج [۲۷]

ہزاروں سال گذر جانے کے باوجود جزیرۃ العرب کے مشرکین بھی حج بیت اللہ کا خوب اہتمام کیا کرتے تھے، خصوصاً مشرکینِ مکہ کے نزدیک اس چیز کی مزید اہمیت تھی۔(۱)

البتہ دینِ اسلام کا سورج طلوع ہونے کے بعد باقاعدہ اسلامی عبادت کی حیثیت سے فرضیتِ حج کا حکم ہجرت کے نویں سال حج کے موقع پر نازل ہوا، اور اس عبادت کو دینِ اسلام کی اہم ترین عبادات بلکہ ''ارکانِ اسلام'' میں شمار کیا گیا۔

چنانچہ اس حکم کے نزول کے بعد رسول اللہ ﷺ نے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو ''امیر الحجاج'' مقرر فرمایا اور انہیں مسلمان حجاج کی قیادت کرتے ہوئے مکہ مکرمہ کی جانب روانگی کا حکم دیا۔

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی روانگی کے بعد سورۂ براءۃ کی ابتدائی چالیس آیات نازل ہوئیں، جن میں کفار و مشرکین کے ساتھ کئے گئے مختلف معاہدات کے خاتمے کا، نیز آئندہ کیلئے ان سے مکمل لاتعلقی و برائت (بیزاری) کا اعلان کیا گیا تھا، اسی ''اعلانِ برائت'' کی وجہ سے یہ سورت ''براءۃ'' کے نام سے مشہور ہوگئی (۲)

حج کے موقع پر چونکہ جزیرۃ العرب کے تمام اطراف اکناف سے آئے ہوئے حجاج بڑی تعداد میں مکہ میں موجود ہوا کرتے تھے، لہٰذا یہ بات ضروری تھی کہ کسی طرح اس مناسب ترین موقع پر یہ آیات وہاں مکہ میں تمام حجاج کے اجتماع میں پڑھ کر سنا دی جائیں، نیز ان آیات کے مفہوم و مضمون اور ان میں موجود احکام سے انہیں آگاہ کر دیا جائے۔

(۱) یعنی دینِ ابراہیمی سے تو وہ یقیناً مکمل منحرف ہو چکے تھے، عقیدہ و ایمان کا فساد، نیز ہر قسم کا اخلاقی بگاڑ بھی ان میں عروج پر تھا...... البتہ اس کے باوجود بیت اللہ کا احترام اور حج کا سلسلہ بدستور جاری تھا۔

(۲) اس سورۃ کا نام ''توبہ'' بھی ہے کیونکہ اس میں ان تین حضرات (کعب بن مالک، ہلال بن امیہ اور مرارہ بن الربیع رضی اللہ عنہم) کی قبولیتِ توبہ کا تذکرہ ہے جو غزوۂ تبوک کے موقع پر شریک نہیں ہوئے تھے۔

چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے اس مقصد کی خاطر اب حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کو مکہ کی جانب روانہ فرمایا، تاکہ وہ ''امیرالحجاج حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ'' سے جاملیں، اس حکم کی تعمیل میں حضرت علی رضی اللہ عنہ بھی مکہ کی جانب روانہ ہوگئے اور تیز رفتاری کے ساتھ سفر کرتے ہوئے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے جاملے۔

مکہ مکرمہ پہنچنے کے بعد یوم النحر یعنی دس ذوالحجہ کے روز عرفات میں حجاج کے اجتماع کے موقع پر حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ ﷺ کی طرف سے تاکید کے مطابق وہ آیات تمام مشرکین کو پڑھ کر سنائیں' نیز اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی طرف سے نازل شدہ ان احکام وہدایات کے بارے میں انہیں مطلع کرتے ہوئے ان کے ساتھ کئے گئے تمام معاہدات کے خاتمے کا اعلان کیا۔(۱)

چونکہ انہی آیات میں ایک حکم یہ بھی تھا کہ ''مشرکین چونکہ نجس ہیں' لہٰذا اس سال کے بعد اب آئندہ کوئی مشرک مسجدِ حرام کے قریب بھی نہیں جائے گا''۔

چنانچہ حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ نے وہاں موجود حجاج میں سے مشرکین کو یہ حکم بھی پڑھ کر سنایا اور انہیں اس بارے میں خبردار کیا......اور یوں مشرکین کیلئے ''حج بیت اللہ'' کا یہ آخری سال ثابت ہوا......جس کے بعد ان کیلئے ہمیشہ کیلئے ''حدودِ حرم'' میں داخلے کی ممانعت ہوگئی۔(۲)

---

(۱) مشرکین کے مختلف قبائل کے ساتھ مسلمانوں کے معاہدات مختلف نوعیت کے تھے اور اسی مناسبت سے یہ ''اعلانِ براءت'' تمام مشرک قبائل کیلئے یکساں نہیں تھا، بلکہ اس میں کچھ تفصیل تھی، اس بارے میں مزید آگاہی کیلئے سورۃ براءۃ کی ابتدائی آیات کی تفسیر ملاحظہ کی جائے۔

(۲)﴿ یَا أَیُّھَا الَّذِینَ آمَنُوا إِنَّمَا المُشرِکُونَ نَجَسٌ فَلَا یَقرَبُوا المَسجِدَ الحَرَامَ بَعدَ عَامِھِم ھذَا......﴾ التوبة [۲۸]

سن ۹ ہجری میں فرضیتِ حج کے اس حکم کے نزول کے بعد کیا جانے والا یہ حج نہایت عجیب وغریب نوعیت کا تھا، اس میں ایسے مناظر تھے کہ جو نہ کبھی اس سے قبل دیکھے گئے تھے اور نہ ہی کبھی اس کے بعد دیکھے گئے...... کیونکہ تاریخِ عالم میں یہ واحد حج تھا کہ جس میں مسلمان اور مشرکین بیک وقت دونوں شریک تھے...... دونوں وہاں یکجا تھے...... اور ایک ساتھ مناسکِ حج کی ادائیگی میں مشغول تھے...... البتہ دونوں کے طریقے یقیناً جدا جدا تھے......!

☆ ...... اور پھر جب اگلے سال یعنی سن ۱۰ ہجری میں حج کا مہینہ قریب آیا تو رسول اللہ ﷺ نے خود حج کا اردا ہ فرمایا، فرضیتِ حج کا حکم نازل ہونے کے بعد یہی آپؐ کا پہلا حج تھا اور یہی آخری حج تھا جو کہ تاریخ میں ''حجۃ الوداع'' کے نام سے معروف ہے، مسلمانوں کو جب آپؐ کے اس ارادے کی اطلاع ہوئی تو قریب و دور ہر جگہ سے بڑی تعداد میں انہوں نے نہایت ذوق وشوق اور خوب جذبہ ولگن کے ساتھ حج کی تیاری شروع کردی، کیونکہ اس سے قبل اسلامی عبادت کے طور پر کبھی حج ادا نہیں کیا گیا تھا، مزید یہ کہ رسول اللہ ﷺ کی معیت وصحبت میں اس مبارک اور اہم ترین فریضے کی ادائیگی کی تو یقیناً شان ہی کچھ نرالی تھی...... اس کے علاوہ یہ کہ اسلامی فریضے کی حیثیت سے چونکہ حج کا یہ پہلا موقع تھا' لہٰذا ہر ایک کی خواہش تھی کہ رسول اللہ ﷺ کی معیت میں اب اسلامی طریقے کے مطابق حج ادا کیا جائے اور اس نادر موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے آپؐ سے براہِ راست ''مناسکِ حج'' کی بھی خوب اچھی طرح عملی تربیت حاصل کرلی جائے۔

چنانچہ دور دراز کے علاقوں سے بھی بہت بڑی تعداد میں شمعِ توحید کے پروانے مکہ پہنچنے لگے، اور پھر رسول اللہ ﷺ کی صحبت ومعیت میں حج کے دوران جب یہ خوش نصیب افراد میدانِ عرفات میں جمع تھے تب وہاں ان کی تعداد ایک لاکھ سے تجاوز کرچکی تھی، اس سے

قبل کبھی حج کے موقع پر چشمِ فلک نے اتنا بڑا جمعِ غفیر اور انسانوں کا بحرِ بیکراں نہیں دیکھا تھا...... اور تب وہاں میدانِ عرفات میں رسول اللہ ﷺ نے اپنی اونٹنی ''قصواء'' پر سوار ہو کر حجۃ الوداع کا وہ مشہور اور یادگار ترین خطبہ دیا جو تمام دنیائے انسانیت کیلئے ''دستور العمل'' کی حیثیت رکھتا ہے، اور جسے بجا طور پر ''انسانی حقوق'' کا بہترین منشور کہا جا سکتا ہے......

چنانچہ اس موقع پر آپؐ نے اس عظیم الشان مجمع کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا: أَيُّهَا النّاس! اِسمَعُوا قَولِي ، فَانِّي لَا أدرِي ، لَعَلِّي لَا أَلقَاكُم بَعدَ عَامِي هٰذَا المَوقِفِ أَبَــداً ، یعنی ''لوگو! میری بات غور سے سنو، کیونکہ شاید آج کے بعد آئندہ کبھی اس موقع پر میری تم سے ملاقات نہیں ہو سکے گی......''

اس کے بعد آپؐ نے اپنی امت کو ''توحید'' کا سبق ایک بار پھر یاد دلایا...... کہ جس پر دینِ اسلام کی اصل بنیاد ہے...... اور جو تمام انبیائے کرام علیہم السلام کا اصل مقصدِ بعثت ہے۔

اس کے علاوہ آپؐ نے مزید ارشاد فرمایا: اِنَّ دِمَاءَكُم وَأموَالَكُم وَأعرَاضَكُم حَرَامٌ عَلَيكُم ، كَحُرمَةِ يَومِكُم هٰذا ، فِي بَلَدِكُم هٰذا ، وَفِي شَهرِكُم هٰذا ، یعنی ''بے شک تمہارا خون، تمہارا مال، تمہاری عزت و آبرو باہم ایک دوسرے کیلئے اسی طرح حرام ہیں کہ جس طرح آج کا یہ دن، اور یہ شہر، اور یہ مہینہ قابلِ احترام ہے''

یعنی یہ حج کا دن، یہ مہینہ، اور یہ مقام جہاں حجِ بیت اللہ کے مناسک ادا کئے جا رہے ہیں ...... جس طرح یہ سب کچھ واجب الاحترام ہے...... اور تم ان تمام چیزوں کی انتہائی عزت و تعظیم کیا کرتے ہو...... بعینہٖ اسی طرح اے مسلمانو! آپس میں ایک دوسرے کیلئے تمہاری جان، تمہارا مال، اور تمہاری عزت و آبرو بھی واجب الاحترام ہے ...... ایک دوسرے کے خلاف قتل و غارتگری، لوٹ مار، اور عزت و آبرو کی پامالی اسی طرح تم سب پر حرام ہے......!

نیز آپ ﷺ نے اس موقع پر اخوت ومساوات، تحمل وبرداشت، رواداری، اور بقائے باہمی کا سبق سکھاتے ہوئے ان سب کو یہ حقیقت بھی یاددلائی کہ ''تمام انسان آدم کی اولاد ہیں، اور آدم مٹی سے بنے تھے، لہٰذا عزت کا معیار صرف تقویٰ ہے''۔

اس طرح رسول اللہ ﷺ نے اس اہم ترین موقع پر اپنے اس یادگار خطبے میں انسانی جان ومال اور عزت وآبرو کی قدر وقیمت کو سمجھنے کا سبق سکھایا، اور اس کی حفاظت اور احترام کی تاکید وتلقین فرمائی۔

نیز اس موقع پر آپ ﷺ نے اپنی امت کو مزید بہت سی وصیتیں اور نصیحتیں فرمائیں، خصوصاً کمزوروں کے ساتھ حسنِ سلوک اور ان کے حقوق کی حفاظت ورعایت، نیز عورتوں کے ساتھ حسنِ معاشرت اور نرمی برتنے کی خاص تاکید فرمائی۔

مجموعی طور پر اس خطبے میں جہاں عقیدہ وایمان کی حفاظت، کتاب وسنت کو مضبوطی کے ساتھ تھامے رکھنے، اور ''حقوق اللہ'' کی ادائیگی کی خوب تاکید وتلقین کی گئی تھی......وہیں ''حقوق العباد'' کی ادائیگی کا بھی بہت زیادہ تاکید واصرار کے ساتھ حکم دیا گیا تھا......یہی وجہ ہے کہ صرف مسلمان ہی نہیں، بلکہ اغیار میں سے بھی بڑے بڑے نامی گرامی مفکرین ومصلحین اور دانشوروں کی نظر میں یہ ''خطبۂ حجۃ الوداع'' محض وعظ ونصیحت ہی نہیں، بلکہ بجا طور پر یہ ''انسانی حقوق'' کا بہترین ''منشور'' بھی ہے۔

اور پھر اس خطبے کے اختتام پر رسول اللہ ﷺ نے اس عظیم الشان مجمع کو مخاطب کرتے ہوئے استفسار فرمایا ''أَلَا هَل بَلَّغتُ؟ ''یعنی'' کیا میں نے تم تک اللہ کا دین پہنچا دیا؟'' اس پر وہ سب بیک زبان بولے: نَشْهَدُ بِأَنَّكَ بَلَّغتَ ، وَأَدَّيتَ ، وَنَصَحْتَ ، یعنی ''ہم گواہی دیتے ہیں کہ آپ نے اللہ کا دین پہنچا دیا، اور آپ کے ذمے (تبلیغِ دین کی) جو

امانت تھی، وہ آپ نے ادا کردی، اور آپ نے خوب نصیحت فرمادی'' تب رسول اللہ ﷺ نے آسمان کی جانب دیکھتے ہوئے تین بار یہ کلمات کہے: اَللّٰھُمَّ فَاشْھَدْ، اَللّٰھُمَّ فَاشْھَدْ اَللّٰھُمَّ فَاشْھَدْ ، یعنی''اے اللہ! اب تو بھی گواہ رہنا......''(۱)

اس یادگار موقع پر رسول اللہ ﷺ جب اپنے اس تاریخی خطبے سے فارغ ہوئے تو وہیں اسی وقت اور اسی مقام پر میدانِ عرفات میں ہی قرآن کریم کی یہ آیت نازل ہوئی: ﴿اَلیَومَ أَکْمَلتُ لَکُم دِینَکُم وَ أتمَمتُ عَلَیکُم نِعْمَتِي وَرَضِیتُ لَکُم الِاسْلَامَ دِینًا﴾ (۲) ترجمہ: (آج میں نے تمہارے لئے دین کو کامل کردیا اور تم پر اپنا انعام بھرپور کردیا اور تمہارے اسلام کے دین ہونے پر رضامند ہوگیا)

اس آیت میں اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کی طرف سے ''تکمیلِ دین'' کی خوشخبری دی گئی تھی، یعنی اللہ کے دین کے نزول کا سلسلہ، نیز نزولِ وحی اور نبوت کا سلسلہ، جس کی ابتداء حضرت آدم علیہ السلام سے ہوئی تھی، مختلف اوقات، مختلف مقامات، اور مختلف انبیائے کرام علیہم السلام سے ہوتا ہوا یہ مبارک سلسلہ آج اپنے عروج اور مرحلۂ تکمیل کو پہنچ گیا۔

(۱) اس تاریخی خطبے کی تفصیلات صحیح بخاری و صحیح مسلم و دیگر کتبِ حدیث میں موجود ہیں (باب حجۃ النبی ﷺ)

(۲) المائدہ[٦]

الحمدللہ آج بتاریخ ۱۰/صفر ۱۴۳۵ھ، مطابق ۱۳/ دسمبر ۲۰۱۳ء بروز جمعہ یہ باب مکمل ہوا۔

رَبَّنَا تَقَبَّل مِنَّا اِنَّكَ أنتَ السَّمِیعُ العَلِیمُ ، وَتُب عَلَینَا اِنَّكَ أنتَ التَوَّابُ الرَّحِیم

اپنے رب کی طرف واپسی:

ہجرت کے دسویں سال حجۃ الوداع کے دوران میدانِ عرفات میں وقوف کے موقع پر اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی طرف سے نازل ہونے والی آیت: ﴿اَلیَومَ أکمَلتُ لَکُم دِینَکُم وَ أتمَمتُ عَلَیکُم نِعمَتِي ......﴾ میں اگرچہ "تکمیلِ دین" کی عظیم خوشخبری تھی کہ جس پر اہلِ ایمان بہت زیادہ شاداں وفرحاں ہوگئے تھے......لیکن اس آیت میں اس عظیم بشارت کے ساتھ ساتھ ایک پیغام اور "اشارہ" بھی پوشیدہ تھا......جس کی طرف اُس وقت حضرات صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی توجہ نہیں گئی تھی......البتہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ اُس خفیہ "اشارے" کو سمجھ گئے تھے، اور تب وہ انتہائی رنجیدہ وافسردہ ہوگئے تھے۔

وہ خفیہ "اشارہ" دراصل یہ تھا کہ رسول اللہ ﷺ کو اس آیت میں اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی طرف سے یہ خبر دی گئی تھی کہ اے ہمارے حبیبؐ! آپ کا مقصدِ بعثت اب پورا ہو چکا ہے...... لہٰذا اب اس دنیائے فانی سے آپ کی واپسی کا وقت قریب ہے......!

مزید یہ کہ اس حج کے موقع پر آپ ﷺ نے اپنے یادگار خطبے کے آغاز میں ہی یہ الفاظ ارشاد فرمائے تھے کہ "لوگو! میری بات غور سے سنو، کیونکہ شاید آج کے بعد آئندہ کبھی اس موقع پر میری تم سے ملاقات نہیں ہو سکے گی"

نیز اس حج کے دوران ایام التشریق میں رمیٔ جمرات کے موقع پر بھی آپؐ نے اپنے جاں نثار ساتھیوں کو مخاطب کرتے ہوئے یہ کلمات ارشاد فرمائے تھے: خُذُوا عَنِّي مَنَاسِكَكُم

...... لَعَلِّي لَا أَلقَاكُم بَعدَ عَامِي هٰذا...... یعنی''لوگو! یہ مناسکِ حج تم مجھ سے خوب اچھی طرح سیکھ لو...... کیونکہ شاید اب آئندہ کبھی اس مقام پر میری تم سے ملاقات نہیں ہو سکے گی''۔

جبکہ اس سے کچھ عرصہ قبل ہی سورۃ ''النصر'' بھی (۱) نازل ہو چکی تھی، جس میں فتحِ مکہ جیسے اہم ترین اور تاریخی واقعہ کے نتیجے میں لوگوں کے فوج در فوج قبولِ اسلام کا تذکرہ تھا...... لیکن اس کے ساتھ ہی اس میں ایک اشارہ بھی پوشیدہ تھا......اور وہ یہ کہ ''مقصدِ بعثت اب پورا ہو چکا......لہٰذا اے ہمارے نبی......اب آپ کی واپسی کا وقت قریب ہے، اور اس چیز کا تقاضا یہ ہے کہ اب آپ زیادہ سے زیادہ اپنے رب کی تسبیح اور حمد و ثناء بیان کیجئے، اور توبہ واستغفار کا خوب اہتمام کیجئے''۔

اس موقع پر بھی اس سورت کے معنیٰ ومفہوم میں چھپے ہوئے اس خاص ''اشارے'' کی طرف کسی کی توجہ نہیں گئی تھی......البتہ رسول اللہ ﷺ کے خاص ساتھی اور ''یارِ غار'' یعنی حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ اس خاص ''اشارے'' کو سمجھ گئے تھے......اور تب بے اختیار ان کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے تھے۔(۲)

(۱) اذا جاء نصر اللّٰہ والفتح...... (۲) سورۃ النصر میں پوشیدہ اسی ''اشارے'' کے تقاضوں پر عمل کرتے ہوئے ہر انسان کو چاہئے کہ اپنی عمر کے آخری حصے میں جب اس دنیائے فانی سے رخصتی کا وقت قریب آ چکا ہو...... تو بکثرت استغفار کا اہتمام والتزام کرے، کیونکہ دنیا سے رخصتی اور اپنے خالق ومالک کی طرف روانگی سے قبل انسان کیلئے یہ بات انتہائی ضروری ہے کہ وہ گناہوں کے بوجھ سے آزاد ہو، ظاہری وباطنی پاکیزگی ونفاست سے آراستہ ہو، عیوب ونقائص کم ہوں اور خیر وخوبی زیادہ ہو، اس کی گردن میں کسی کے ساتھ ظلم وزیادتی کا کوئی بوجھ نہ ہو......بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ انسان کی ہمیشہ ہی یہی کیفیت رہنی چاہئے ......کیونکہ کیا معلوم آخری وقت کب آ جائے......؟؟

نیز یہ کہ اسی سال حج سے قبل جب رمضان کا مبارک مہینہ آیا تھا' تب رسول اللہ ﷺ نے جبریل امین علیہ السلام کے ساتھ قرآن کریم کا دو بار ''مذاکرہ'' فرمایا تھا(۱)، جبکہ اس سے قبل ہر سال ماہِ رمضان میں قرآن کریم کا یہ ''مذاکرہ'' ایک بار کرنے کا معمول تھا۔

اسی طرح رسول اللہ ﷺ اس سے قبل ہمیشہ ماہِ رمضان میں اپنی مسجد میں دس روز ''اعتکاف'' فرمایا کرتے تھے، جبکہ اس سال جب رمضان آیا تھا' تب آپ ﷺ نے خلافِ معمول بیس روز اعتکاف فرمایا تھا، اور جب آپ ﷺ کی صاحبزادی حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا نے اس کی وجہ دریافت کی تھی' تو آپ ﷺ نے اپنی لاڈلی بیٹی کو مخاطب کرتے ہوئے اس کی وجہ یہ بیان فرمائی تھی کہ: ''مجھے اب اپنی موت قریب محسوس ہوتی ہے''۔(۲)

انہی دنوں آپ ﷺ نے حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کو جب ملکِ یمن کی جانب روانہ فرمایا تو آپؐ اس موقع پر انہیں رخصت کرنے کی غرض سے کچھ دور تک ان کے ہمراہ چلتے رہے......اس موقع پر حضرت معاذؓ اپنی سواری پر تھے، جبکہ آپؐ ان کے ہمراہ پیدل ہی چل رہے تھے......اور پھر ایک جگہ رُک کر آپؐ نے انہیں مخاطب کرتے ہوئے ارشاد فرمایا: ''اے معاذ! شاید اب دوبارہ ہماری کبھی ملاقات نہیں ہو سکے گی......تم جب یمن سے واپس آؤ گے تو شاید میری مسجد......اور میری قبر......کے قریب سے گذرو گے......''

اور تب آپ ﷺ کی زبانی یہ بات سن کر معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ پھوٹ پھوٹ کر رو دیئے تھے......

اور پھر آپ ﷺ نے اپنا رُخِ انور مدینہ شہر کی جانب موڑ لیا تھا، اور اُس طرف بغور دیکھتے

(۱) یعنی رسول اللہ ﷺ اور جبریل امین علیہ السلام دونوں باہم ایک دوسرے کو قرآن کریم سنایا کرتے تھے (دَور کیا کرتے تھے) (۲) لا أریٰ اِلا حَضَرَ أجَلِي (بخاری[۴۹۹۶] کتاب[۶۹] فضائل القرآن، باب[۷] کان جبریل یعرض القرآن علیٰ النبی ﷺ)

ہوئے یہ ارشاد فرمایا تھا ''اِنَّ أولیٰ النَّاسِ بِي المُتَّقُونَ ، مَن کَانُوا ، وَ حَیثُ کَانُوا ''(۱) یعنی ''مجھ پر سب سے زیادہ حق ان لوگوں کا ہے جو ''متقی'' ہوں، خواہ وہ کوئی بھی ہوں، اور جہاں کہیں بھی ہوں'' (۲)

اسی کیفیت میں سن دس ہجری اپنے اختتام کو پہنچا، اوراس کے بعد جب اگلا سال آیا، یعنی سن گیارہ ہجری ، تواس نئے سال کا پہلا مہینہ یعنی محرم آیا اور گذر گیا، اور پھر دوسرا مہینہ یعنی صفر شروع ہوا تو اس مہینے کے آغاز کے ساتھ ہی آپؐ نے باقاعدہ اپنے ''سفرِ آخرت'' کی تیاری شروع فرمادی، چنانچہ انہی دنوں ایک روز آپؐ میدانِ اُحد کی طرف تشریف لے گئے، اور وہاں شہدائے اُحد کیلئے دعائے مغفرت فرمائی، اور پھر وہاں سے واپسی پر آپؐ نے لوگوں کے سامنے مختصر خطبہ دیا، جس میں آپؐ نے فرمایا: ''اِنّي فَرَطُکُم ، وَاِنّي شَھِیدٌ عَلَیکُم ، وَاِنّي وَاللّٰہِ لأنظُرُ اِلَیٰ حَوضِي الآن '' (۳) یعنی ''لوگو! میں تم سے آگے جانے والا ہوں ، اور میں تمہارے بارے میں گواہی دینے والا ہوں ، اللہ کی قسم ! میں اپنے حوض کو ابھی سے دیکھ رہا ہوں''۔(۴)

اور پھر انہی دنوں ایک رات آپ ﷺ نصف شب کے قریب ''بقیع''(۵) تشریف لے گئے، اور اہلِ بقیع (۶) کیلئے دعائے خیر فرمائی۔(۷)

---

(۱) احمد[۲۱۵۴۷] (۲) گویا اس طرح رسول اللہ ﷺ حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کی دلجوئی فرمانا چاہتے تھے کہ اب اگرچہ انہیں کبھی آپؐ کی زیارت نصیب نہیں ہوسکے گی، لیکن پریشانی کی کوئی بات نہیں ، کیونکہ ''اہلِ تقویٰ'' کا تو آپؐ کے ساتھ ہمیشہ ہی بہت قریبی تعلق رہے گا......خواہ وہ کوئی بھی ہوں، اور جہاں کہیں بھی ہوں۔

(۳) بخاری [۶۴۲۶] کتاب الرقاق[۸۱] باب[۷] مایُحذر من زھرۃ الدنیا...... (۴) یعنی ''حوض کوثر''

(۵) یعنی مدینہ کا قبرستان (۶) یعنی بقیع میں مدفون مسلمانوں کیلئے......

(۷) احمد عن أبی مویہبہ، مولیٰ للنبی ﷺ [۱۵۵۶۷]

مرض الموت:

سن گیارہ ہجری میں جب ماہِ صفر کے آخری دن چل رہے تھے، تب ۲۹/صفر بروزِ پیر' رسول اللہ ﷺ کسی کی نمازِ جنازہ پڑھا کر بقیع سے جب واپس تشریف لا رہے تھے' کہ اچانک راستے میں ہی آپ کو دردِ سر کی تکلیف شروع ہوگئی، جو کہ دیکھتے ہی دیکھتے شدت اختیار کرگئی، اور پھر ساتھ ہی شدید بخار بھی ہوگیا، یہ تکلیف مسلسل تیرہ یا چودہ دن جاری رہی، بالآخر یہی تکلیف ''مرض الموت'' ثابت ہوئی۔

اور پھر ماہِ صفر کے اختتام کے بعد ماہِ ربیع الاول شروع ہوا...... آج سے تریسٹھ برس پہلے بھی ربیع الاول کا مہینہ آیا تھا...... جب نبیٔ رحمت ﷺ کی ولادت باسعادت کی وجہ سے یہ تمام کائنات جھوم اٹھی تھی...... اس جہانِ رنگ و بو میں بہار کا جھونکا آیا تھا...... اور اب تریسٹھ برس بعد پھر وہی ربیع الاول ہی کا مہینہ آیا تھا...... لیکن اس بار یہ ربیع الاول ''مژدۂ بہار'' نہیں...... بلکہ ''پیغامِ خزاں'' بن کر آیا تھا۔

اس دوران مرض مسلسل شدت اختیار کرتا گیا، اُن دنوں آپ ﷺ بکثرت ''مُعوّذتین'' (۱) پڑھتے اور اپنے ہاتھوں پر دم کر کے انہیں اپنے جسمِ اطہر پر پھیر لیتے، جب کمزوری بڑھ گئی تو ام المؤمنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا یہی دونوں سورتیں پڑھ کر آپ کے دستِ مبارک پر دم کرتیں' اور پھر انہیں پکڑ کر آپ کے جسم پر پھیر دیا کرتیں۔

اس دوران شدتِ مرض اور نقاہت کے باوجود آپ ابتک بدستور نماز کیلئے مسجد تشریف لے جاتے، اور خود نماز بھی پڑھاتے، البتہ مسجد میں وعظ و نصیحت وغیرہ کا کوئی سلسلہ اب جاری

(۱) ''مُعوّذتین''، یعنی سورۂ ''قل اعوذ برب الفلق'' اور ''قل اعوذ برب الناس''

نہیں رہ سکا تھا۔

آخری چھ ایام نیز آخری وصیتیں:

☆......۷/ ربیع الاول بروز بدھ:

اس روز آپ ﷺ کو قدرے افاقہ محسوس ہوا اور طبیعت کچھ سنبھلی......تو ظہر کے وقت آپؐ نماز سے کچھ قبل ہی مسجد تشریف لے گئے، اور بظاہر اُس موقع پر وہاں موجود اپنے صحابۂ کرام کو خطاب کرتے ہوئے آپؐ نے قیامت تک آنے والے تمام مسلمانوں کیلئے یہ ارشاد فرمایا: ''لَعنَةُ اللّٰهِ عَلَىٰ اليَهُودِ وَ النَّصَارَىٰ ، اِتَّخَذُوا قُبُورَ أنبِيَائِهِم مَسَاجِدَ ''(۱) یعنی ''اللہ نے یہود و نصاریٰ پر لعنت فرمائی، کیونکہ انہوں نے اپنے انبیاء کی قبروں کو سجدہ گاہ بنالیا''

نیز اس موقع پر آپ ﷺ نے یہ ارشاد بھی فرمایا: ''لَا تَتَّخِذُوا قَبرِي وَثَناً يُعبَدُ'' یعنی ''میرے بعد تم کسی بت کی مانند میری قبر کی پرستش میں نہ لگ جانا'' (۲)

یوں اپنی حیاتِ طیبہ کے آخری دنوں میں آپ ﷺ نے نہایت اہتمام کے ساتھ اپنی امت کو ہمیشہ کیلئے شرک اور قبر پرستی سے باز رہنے کی وصیت اور تاکید و تلقین فرمائی۔

اور پھر اسی موقع پر ہی آپ ﷺ نے مزید ارشاد فرمایا: (مَن كُنتُ جَلَدتُ لَهُ ظَهراً فَهٰذا ظَهرِي ، فَليَستَقِدُ مِنهُ ، وَمَن كُنتُ شَتَمتُ لَهُ عِرضاً فَهٰذَا عِرضِي ، فَليَستَقِدُ مِنهُ) (۳) یعنی ''جس کسی کو میں نے ناحق کبھی مارا پیٹا ہو، تو یہ میری کمر حاضر

(۱) [بخاری ۴۴۴۳] کتاب المغازی [۶۴] باب [۸۳] مرض النبی ﷺ ووفاتہٖ۔

(۲) الرحیق المختوم ''قبل الوفاۃ بخمسۃ أیام'' صفحہ: ۴۶۵، بحوالۂ: موطا امام مالک صفحہ: ۶۵۔

(۳) مجمع الزوائد للہیثمی، عن الفضل بن عباسؓ۔ حدیث: ۱۴۲۵۲، ج: ۹، باب فی وداعہٖ ﷺ)۔

ہے، وہ آئے اور مجھ سے بدلہ چکالے......اگر میں نے کبھی کسی کو بے عزت کیا ہو تو وہ آئے اور مجھ سے اپنا انتقام لے لے"۔

اور پھر مزید یہ بھی فرمایا: "جس کسی کا میرے ذمے کوئی حق ہو تو وہ آئے اور مجھ سے اپنا حق وصول کرلے"۔

رسول اللہ ﷺ کی زبانِ مبارک سے صحابۂ کرام یہ تمام گفتگو سنتے رہے......اور ہچکیاں لے لے کر روتے رہے......

غور طلب بات ہے کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے اپنے پیارے نبی ﷺ کو تمام دنیائے انسانیت کیلئے "رحمت" بنا کر بھیجا تھا، آپ ﷺ کے تمام بنی نوعِ انسان پر بیشمار احسانات تھے، اور بالخصوص وہ لوگ جو کہ اُس وقت آپؐ کی اُس مجلس میں موجود تھے، جو اُس وقت آپؐ کے براہِ راست مخاطب تھے، اُن پر تو آپؐ کے بہت ہی زیادہ احسانات تھے......اور پھر یہ کہ آپؐ اللہ کے رسول تھے، بلکہ سید الانبیاء والمرسلین تھے، جبکہ وہ لوگ تو محض آپؐ کے اُمتی تھے......لیکن اس کے باوجود......آپؐ کا تواضع ......عجز وانکسار......اور حسنِ اخلاق ملاحظہ ہو......کہ آپؐ اُس موقع پر انہیں مخاطب کر کے یہ تمام باتیں ارشاد فرماتے رہے۔

اس کے بعد آپ ﷺ منبر سے نیچے تشریف لائے اور ظہر کی نماز پڑھائی، نماز سے فراغت کے بعد آپؐ دوبارہ منبر پر جلوہ افروز ہوئے، آپؐ کا اپنے منبر پر یہ آخری جلوہ تھا......

اور اب آپؐ نے انصارِ مدینہ کے حق میں چند وصیتیں فرمائیں، اور ان کے ساتھ ہمیشہ حسنِ سلوک اور ان کے اکرام واحترام کی بہت زیادہ تاکید فرمائی۔

اس کے بعد آپؐ نے ارشاد فرمایا (اِنَّ عَبْداً خَيَّرَهُ اللّٰهُ أن يُؤتِيَهُ مِن زَهرَةِ الدُّنيَا مَا شَاءَ ، وَبَينَ مَا عِندَهُ ، فَاختَارَ مَا عِندَهُ) یعنی "اللہ کا ایک بندہ ہے،

جسے اللہ نے اس بات کا اختیار دیا ہے کہ اگر وہ چاہے تو اللہ اسے دنیاوی زندگی کی خوب رونقیں عطاء فرمائے، اور اگر وہ چاہے تو اب اللہ کے پاس موجود نعمتوں میں چلا آئے...... اور اس بندے نے اللہ کے پاس موجود نعمتوں کو پسند کر لیا ہے''۔(۱)

حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ''یہ بات سن کر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ رونے لگے......اور یوں کہنے لگے (فَدَيْنَاكَ بِآبَائِنَا وَ أُمَّهَاتِنَا يَا رَسُولَ اللّٰه) یعنی ''اے اللہ کے رسول! آپ پر ہمارے ماں باپ قربان''۔

ابوبکر کی اس کیفیت پر ہمیں تعجب ہونے لگا......اور یہ منظر دیکھ کر کچھ لوگ یوں کہنے لگے کہ ابوبکر کو دیکھو......رسول اللہ ﷺ ہمیں یہ بات بتا رہے ہیں کہ ''اللہ کا ایک بندہ ہے' جسے اللہ نے اس بات کا اختیار دیا ہے کہ اگر وہ چاہے تو اللہ اسے دنیاوی زندگی کی خوب رونقیں عطاء فرمائے ......اور اگر وہ چاہے تو اب اللہ کے پاس موجود نعمتوں میں چلا آئے......اور اس بندے نے اللہ کے پاس موجود نعمتوں کو پسند کر لیا ہے''۔اور ذرہ ابوبکر کو دیکھو......رسول اللہ ﷺ کی یہ بات سن کر یہ رو رہے ہیں ......اور کہتے ہیں کہ ''اے اللہ کے رسول! آپ پر ہمارے ماں باپ قربان......'' بھلا یہ کیا بات ہوئی......؟؟

اس کے بعد حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ (فَكَانَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ هُوَ الْمُخَيَّرُ ، وَكَانَ أَبُوبَكر أعلَمَنَا) یعنی ''اللہ کی طرف سے اپنے جس بندے کو یہ اختیار دیا گیا تھا......وہ خود رسول اللہ ﷺ تھے......اور ابوبکر ہم سبھی سے زیادہ علم والے تھے''۔(۲)

---

(۱) یعنی اس دنیا میں مزید زندگی بسر کرنے کی بجائے اللہ کے پاس چلے جانے کو پسند کر لیا ہے......

(۲) متفق علیہ، مشکاۃ المصابیح [۵۹۵۷] کتاب الفضائل والشمائل، باب ہجرۃ أصحابہ من مکۃ......

مطلب یہ کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی جانب سے اختیار دیئے جانے پر جواب میں رسول اللہ ﷺ اس فانی دنیا میں اب مزید زندگی بسر کرنے کی بجائے اپنے رب کے جوارِ رحمت میں منتقل ہو جانے کو پسند فرما چکے تھے...... ہم اس بات کو نہیں سمجھ سکے...... البتہ ابوبکر (رضی اللہ عنہ) ہم میں سب سے زیادہ علم و دانش سے مالا مال تھے...... رسول اللہ ﷺ کی گفتگو کو اور اس میں پوشیدہ اسرار و رموز کو ہم سب سے زیادہ وہی سمجھنے والے تھے...... لہٰذا اس راز کی بات کو ہم نہیں سمجھ سکے، اور اس وجہ سے ہم تعجب کرنے لگے...... جبکہ ابوبکر اس راز کو سمجھ گئے ...... اور تب وہ...... بے اختیار رونے لگے۔

☆......۸/ ربیع الاول بروز جمعرات:

اس روز یعنی رحلت سے چار روز قبل رسول اللہ ﷺ کی طبیعت مزید ناساز ہو گئی، اور مرض کی شدت بڑھ گئی، اس وقت آپؐ کے گھر میں متعدد افراد موجود تھے، جن میں سے بعض کا تعلق آپؐ کے اپنے اہلِ بیت سے تھا، جبکہ ان کے علاوہ بھی کبارِ صحابہ میں سے متعدد حضرات اس موقع پر وہاں موجود تھے، تب آپؐ نے انہیں مخاطب کرتے ہوئے ارشاد فرمایا: هَلُمُّوا أَكْتُبُ لَكُم كِتَاباً لَن تَضِلّوا بَعدَهُ یعنی ''لاؤ، میں تمہیں کچھ لکھوا دوں' تاکہ اس کے بعد تم گمراہی میں نہ پڑ سکو''۔

اس پر وہاں موجود افراد میں رسول اللہ ﷺ کی شدتِ مرض اور ناسازیٔ طبع کو دیکھتے ہوئے اختلافِ رائے ہونے لگا، چنانچہ ان میں سے کچھ لوگ یہ اصرار کرنے لگے کہ ''جلدی کوئی سامانِ کتابت حاضر کیا جائے...... کیونکہ رسول اللہ ﷺ کوئی اہم وصیت لکھوانا چاہتے ہیں...... تاکہ ہم گمراہی سے محفوظ رہ سکیں''

جبکہ دیگر کچھ افراد یوں کہنے لگے کہ ''اس وقت رسول اللہ ﷺ پر شدتِ درد غالب ہے، اور

ہمارے پاس چونکہ اللہ کی کتاب (قرآن کریم) موجود ہے، لہٰذا وہ ہمارے لئے کافی ہے، ہمیں اس وقت رسول اللہ ﷺ کو کسی مشکل یا مشقت میں ڈالنے کی بجائے آپ ؐ کی راحت اورآرام کی فکر کرنی چاہئے''۔

یوں ان میں اختلافِ رائے ہونے لگا، کوئی کچھ کہتا......اور کوئی کچھ...... جب شور وشغب زیادہ بڑھنے لگا......تو آخر رسول اللہ ﷺ نے انہیں مخاطب کرتے ہوئے فرمایا ''تم سب یہاں سے اٹھ جاؤ''۔

اور یوں وہ اہم بات نہیں لکھی جاسکی جو رسول اللہ ﷺ بالکل آخری ایام میں اپنی امت کیلئے لکھوانا چاہتے تھے۔(۱)

رسول اللہ ﷺ شدتِ مرض اور ناسازیٔ طبع کے باوجود اب تک نماز کیلئے بدستور مسجد تشریف لاتے، اور تمام نمازیں خود ہی پڑھاتے......اور اُس روز بھی......یعنی اپنی وفات سے محض چار روز قبل' بتاریخ ۸/ ربیع الاول بروز جمعرات چار نمازیں' یعنی فجر' ظہر' عصر' اور مغرب کی نمازیں آپ ﷺ نے خود ہی پڑھائیں، البتہ یہ مغرب کی نماز آخری نماز تھی جو آپ ﷺ نے پڑھائی ......اس آخری نماز میں آپ ؐ نے اُس روز سورۃ ''المرسلات'' تلاوت فرمائی تھی (یعنی انتیسویں سپارے [تبارک] کی آخری سورت)۔

(۱) اس واقعے کے حوالے سے متعدد اہلِ علم نے یہ اظہارِ خیال کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کا یہ حکم غالبًا ''علیٰ الوجوب'' نہیں ہوگا، بلکہ محض احتیاطی تدبیر کے طور پر آپ ؐ کچھ لکھوانا چاہتے ہوں گے......کیونکہ آپ ؐ کا یہ حکم اگر ''علیٰ الوجوب'' ہوتا اور اس کی تعمیل واجب اور ضروری ہوتی تو آپ ؐ دوبارہ بھی یہی حکم دے سکتے تھے......یا کم از کم یہ کہ آپ ؐ زبانی ہی وہ وصیت فرمادیتے ......لیکن آپ ؐ نے ایسا نہیں فرمایا......آپ ؐ کا انتقال اس واقعے کے چار دن بعد ہوا، اور اس دوران آپ ؐ نے متعدد وصیتیں بھی فرمائیں اور مختلف ہدایات بھی دیں، لیکن اس بارے میں کچھ ارشاد نہیں فرمایا (تفصیل کیلئے ملاحظہ ہو' السیرۃ النبویۃ الصحیحۃ ''تألیف؛ دکتور اکرم ضیاء العمری، صفحہ:۵۵۳)۔

لیکن اس کے بعد جب عشاء کی نماز کا وقت آیا تو آپ ﷺ نے مسجد جانے کی غرض سے وضوء کرنا چاہا، مگر...... کمزوری اور نقاہت کی شدت کی وجہ سے آپؐ پر بے ہوشی طاری ہوگئی...... تین بار ایسا ہی ہوا...... جب آپ ﷺ وضوء کیلئے بیٹھتے تو بے ہوشی طاری ہوجاتی...... آخر آپؐ نے حکم دیا کہ '' مُــــرُوا أبَـــــابَــكـــر، فَـلـيُـصَـلِّ بِالنَّاس ''یعنی ''ابوبکر سے کہو کہ وہ لوگوں کو نماز پڑھائیں''

اُم المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا چونکہ اپنے والد (حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ) کے مزاج سے بخوبی واقف تھیں' لہٰذا اس موقع پر انہوں نے اپنے والد کے بارے میں عرض کیا کہ ''یَـا رَسُولَ اللّٰه! اِنَّهٗ رَجُلٌ رَقِيْق ، ضَعِيفُ الصَّوت ، كَثِيرُ البُكَاءِ اِذَا قَرَأ القُرآن ''

یعنی ''اے اللہ کے رسول! وہ تو بہت ہی کمزور اور نرم دل انسان ہیں' ان کی آواز بھی کافی پست ہے...... مزید یہ کہ...... وہ جب بھی قرآن پڑھتے ہیں تو بہت زیادہ رونے لگتے ہیں''۔(۱)

تب آپؐ نے اپنا وہی حکم دہرایا...... اور حضرت عائشہؓ نے بھی اپنی وہی گذارش دہرائی' آخر تیسری بار آپؐ نے قدرے سختی کے ساتھ یہی حکم دہرایا...... اور تب حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے آپؐ کی حیاتِ طیبہ کے دوران ہی...... اور خود آپؐ کے حکم پر...... آپؐ کی جگہ مسجد نبوی میں امامت کا آغاز کیا۔

(۱) یعنی میرے والد تو کمزور دل انسان ہیں، لہٰذا اے اللہ کے رسول...... وہ آپ کی جگہ کھڑے ہونے کی جرأت کس طرح کرسکیں گے؟ مزید یہ کہ ان کی آواز بھی پست ہے، لہٰذا جب مقتدیوں تک ان کی آواز ہی نہیں پہنچ سکے گی تو لوگ ان کی اقتداء میں کس طرح نماز پڑھیں گے؟ اور پھر یہ کہ قرآن کی تلاوت کرتے ہوئے ان پر تو ہمیشہ بہت زیادہ گریہ طاری ہوجاتا ہے، لہٰذا وہ امامت کرتے ہوئے کس طرح قرآن پڑھ سکیں گے......؟

☆......۹/ ربیع الاول بروز جمعہ:

اس روز بھی حسبِ معمول آپ ﷺ پر نقاہت اور کمزوری کا غلبہ رہا، اس روز جب آپؐ کی عیادت کی غرض سے متعدد افراد حاضرِ خدمت تھے، تب آپؐ نے ان سے مخاطب ہوتے ہوئے ارشاد فرمایا: (لَایَمُوتَنَّ أَحَدُکُم اِلَّا وَھُوَیُحسِنُ الظَّنَّ بِاللّٰہِ تَعَالیٰ) (۱) یعنی ''تم میں سے کسی کو موت نہ آئے مگر اس حالت میں کہ وہ اپنے رب کے بارے میں حسنِ ظن رکھتا ہو'' (۲)

☆......۱۰/ ربیع الاول بروز ہفتہ:

اس روز آپ ﷺ کو بوقتِ ظہر قدرے افاقہ محسوس ہوا تو آپؐ ایک طرف اپنے محترم چچا حضرت عباس رضی اللہ عنہ اور دوسری طرف اپنے چچازاد اور داماد یعنی حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کے کندھوں کا سہارا لئے ہوئے مسجد تشریف لائے، اس وقت حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ امامت کر رہے تھے، انہوں نے جب آپؐ کے قدموں کی آہٹ محسوس کی تو نماز میں ہی اپنی جگہ سے پیچھے ہٹنے لگے، جس پر آپؐ نے اپنے دستِ مبارک سے انہیں پیچھے نہ ہٹنے کا اشارہ کیا...... پھر آپؐ حضرت ابوبکرؓ کی دائیں جانب بیٹھ کر نماز میں شامل ہوگئے، اور اب اس نماز کی کیفیت یہ ہوئی کہ حضرت ابوبکرؓ آپؐ کی اقتداء کرنے لگے، جبکہ تمام مقتدی حضرت ابوبکرؓ کی تکبیروں پر نماز ادا کرنے لگے۔

☆......۱۱/ ربیع الاول بروز اتوار:

اس روز یعنی اپنی رحلت سے محض ایک روز قبل آپ ﷺ نے حکم دیا کہ گھر میں جو بھی نقدی ہے، وہ مساکین میں تقسیم کردی جائے، چنانچہ تلاش کے بعد گھر میں کل پونجی سات دینار

(۱) مسلم [۲۸۷۷] کتاب الفتن۔ (۲) یعنی بندۂ مؤمن کو بوقتِ موت اپنے رب سے اچھی امید رکھنی چاہئے۔

نکلے، جوکہ اسی وقت مساکین میں تقسیم کردیئے گئے......اوراس شام جب اندھیرا چھانے لگا تو گھر میں چراغ جلانے کیلئے ام المؤمنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو ایک پڑوسن سے تیل ادھار مانگنا پڑا۔

نیز اس وقت آپ ﷺ کی زرہ ایک یہودی کے پاس رہن رکھی ہوئی تھی......کیونکہ کچھ عرصہ قبل آپؐ نے اس کے پاس اپنی وہ زرہ رہن رکھوا کر اس سے گھر میں پکانے کیلئے کچھ جو کے دانے حاصل کئے تھے۔

☆......۱۲/ ربیع الاول بروز پیر (آخری دن):

اُس روز علیٰ الصباح جب نمازِ فجر کا وقت ہوا، نمازی مسجد نبوی میں جمع ہوئے اور حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی اقتداء میں نماز کی ادائیگی میں مشغول ہوگئے......رسول اللہ ﷺ کا حجرہ مبارک تو مسجد سے متصل ہی تھا، درمیان میں محض ایک پردہ پڑا ہوا تھا، آپؐ نے پردہ اٹھا کر دیکھا، اپنے صحابہ کو یوں انتہائی خشوع وخضوع کے ساتھ نماز میں مشغول ومنہمک پایا......کچھ دیر اسی طرح آپؐ اسی منظر میں کھوئے رہے......اپنے صحابہ کو یوں نماز پڑھتے ہوئے دیکھتے رہے، اور پھر اس منظر کی وجہ سے آپؐ فرطِ مسرت سے مسکرادیئے......رُخِ انور پر بشاشت پھیل گئی......اور ہونٹوں پر مسکراہٹ کھیل گئی......

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ جوکہ نماز پڑھا رہے تھے، انہیں کچھ اندازہ ہوا کہ شاید آپ ﷺ نماز کیلئے تشریف لانا چاہتے ہیں، یہ سوچ کر وہ نماز میں ہی اپنی جگہ سے کچھ پیچھے کی جانب سرکنے لگے، جس پر آپؐ نے اشارے سے انہیں منع فرمایا۔

آپ ﷺ کے جاں نثار صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین' جو اُس وقت نماز میں مشغول تھے' اُس موقع پر آپؐ کیلئے شوقِ دیدار اور بیتابی کی وجہ سے ان کا یہ حال ہوا کہ......گویا وہ

سب ابھی نماز میں ہی آپؐ کی طرف متوجہ ہو جائیں گے......آپؐ کے خادمِ خاص حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ اس وقت میری نظر جب اچانک آپؐ کے چہرۂ مبارک پر پڑی تو مجھے آپؐ کا چہرہ بالکل ''قرآن کے ورق'' کی طرح محسوس ہوا......(۱)

اور پھر تھوڑی دیر بعد آپؐ نے پردہ گرا دیا......اور یہ نماز بھی حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے مکمل فرمائی۔

اس کے بعد ''نبیٔ رحمت ﷺ'' پر کسی اور نماز کا وقت ہی نہیں آیا......

اور پھر جب صبح کی روشنی پھیلنے لگی، سورج قدرے بلند ہو گیا، تو آپؐ نے اپنی پیاری بیٹی حضرت فاطمہ الزہراء رضی اللہ عنہا کو بلایا اور ان کے کان میں کچھ سرگوشی فرمائی......جس پر وہ رونے لگیں......اور پھر جلد ہی ان کے کان میں دوبارہ کچھ سرگوشی فرمائی......تب وہ مسکرانے لگیں......(۲)

نیز اسی موقع پر آپ ﷺ نے اپنی پیاری بیٹی حضرت فاطمہ الزہراء رضی اللہ عنہا کو ''سیدة نساء العالمین'' ہونے کی بشارت بھی دی۔

اس کے بعد آپ ﷺ نے اپنے کمسن نواسوں حسن اور حسین رضی اللہ عنہما کو بلوایا، دونوں کو پیار سے چوما، اور وہاں موجود سبھی افراد کو ان کے ساتھ ہمیشہ احترام سے پیش آنے کی

(۱) یعنی ''قرآن کے ورق'' میں بیک وقت حسن و جمال، تقدس، اور پاکیزگی ...... یہ تمام خوبیاں یکجا ہوا کرتی ہیں......یہی کیفیت انہیں اس موقع پر رسول اللہ ﷺ کے رُخِ انور میں محسوس ہوئی۔

(۲) بعد میں کسی موقع پر جب حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا سے اس بارے میں دریافت کیا گیا تھا تو انہوں نے یہ جواب دیا تھا کہ میرے والد نے پہلے مجھے اس راز سے مطلع کیا کہ ''اب اسی تکلیف کے دوران ہی میری روح قبض کر لی جائیگی''، جس پر میں رو دی......اور پھر کچھ دیر بعد مجھے مطلع کیا کہ ''اہلِ بیت میں سے سب سے پہلے میں اپنے والد سے جا ملوں گی......''، جس پر میں مسکرا دی۔

وصیت فرمائی۔

اوراس کے بعد آپ ﷺ نے اپنی ازواجِ مطہرات کو بلوایااورانہیں چند نصیحتیں فرمائیں، اسی دوران آپؐ کی طبیعت زیادہ ناساز ہونے لگی ......اورتب اسی کیفیت اورشدید نقاہت وکمزوری کی حالت میں اپنی امت کو یہ آخری وصیت فرمائی ''الصّلاۃ ، الصّلاۃ ...... وَمَا مَلَکَتْ أیمَانُکُم ''یعنی''نماز کی پابندی کرتے رہنا......اوروہ لوگ جوتمہارے ماتحت ہیں' ان کے ساتھ ہمیشہ حسنِ سلوک سے پیش آنا''(۱) یہ الفاظ آپ ﷺ نے متعدد بار دہرائے۔

اسی دوران نوجوان اُسامہ بن زید رضی اللہ عنہما اندرداخل ہوئے' جنہیں دیکھ کرآپ ﷺ نے دونوں ہاتھ فضاء میں بلند کئے ......یہ منظر دیکھ کروہاں موجودافرادسمجھ گئے کہ آپؐ حضرت اسامہ بن زید رضی اللہ عنہما کیلئے کامیابی کی دعاء فرمارہے ہیں۔(۲)

انہی آخری لمحات میں حضرت ابوبکرصدیق رضی اللہ عنہ کے بیٹے اورام المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے بھائی عبدالرحمٰنؓ وہاں آئے،ان کے ہاتھ میں تازہ مسواک تھی،آپؐ مسواک کی جانب بغوردیکھنے لگے،حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا چونکہ مزاج شناس

(۱)''ماتحت''میں انسان کیلئے اس کے اہل وعیال' خادم' اوراس کے ماتحت افراد......وغیرہ......سبھی شامل ہیں، یعنی سبھی کے ساتھ حسنِ سلوک کی وصیت فرمائی۔

(۲)رسول اللہ ﷺ نے آخری ایام میں سلطنتِ روم کے خلاف کارروائی کی غرض سے ایک لشکر کی روانگی کا حکم صادرفرمایا تھا،اس لشکر کا سپہ سالار آپؐ نے حضرت اسامہ بن زید رضی اللہ عنہما کومقررفرمایا تھا جوکہ اُس وقت بالکل نوجوان تھے،آپؐ کی ناسازیٔ طبع کی وجہ سے یہ لشکر مدینہ سے کچھ فاصلے پرپہنچ کررک گیا تھا،حضرت اسامہؓ واپس مدینہ پہنچے تھے تاکہ خودآپؐ کی طبیعت کے بارے میں صورتِ حال سے آگاہی ہوسکے......اس موقع پر یہ صورتِ حال پیش آئی تھی جواوپر بیان کی گئی،یعنی کمزوری اورشدتِ مرض کی وجہ سے چونکہ آپؐ کیلئے گفتگوکرنا دشوار تھا......لہٰذااس موقع پرآپؐ نے دونوں ہاتھ اٹھاکراشارے سے حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ کودعائے خیردی۔

تھیں، لہٰذا سمجھ گئیں آپؐ مسواک کرنا چاہتے ہیں، چنانچہ انہوں نے آپؐ سے اس بارے میں استفسار کیا، جس پر آپ ﷺ نے اثبات میں سر ہلایا......تو انہوں نے اپنے بھائی سے وہ مسواک لے کر آپؐ کی خدمت میں پیش کی، لیکن نقاہت کی وجہ سے وہ آپؐ سے چبائی نہیں جا رہی تھی، اس پر حضرت عائشہؓ نے عرض کیا کہ ''اگر ارشاد ہو تو میں نرم کر دوں؟'' آپؐ نے سر کے اشارے سے ''ہاں'' فرمایا، تو آپؐ سے مسواک لے کر حضرت عائشہؓ نے اسے دانتوں سے چبا کر خوب نرم کر کے دوبارہ آپؐ کی خدمت میں پیش کی......اور تب آپؐ نے ان سے وہ مسواک لے لی اور خوب اچھی طرح اپنے دانتوں پر پھیری......اُس وقت پانی کا ایک پیالہ قریب ہی رکھا ہوا تھا، آپؐ بار بار اس میں اپنا ہاتھ ڈبوتے اور چہرۂ مبارک پر پھیر لیتے۔

اسی دوران آپ ﷺ نے یہ الفاظ کہے ''لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰه ...... اِنَّ لِلمَوتِ سَكَرَات'' یعنی اللہ کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں......بیشک......موت کی یہ سختی ہوا ہی کرتی ہے۔'' اور اس کے ساتھ ہی آپؐ پر نزع کی کیفیت طاری ہو گئی......آپؐ نے اپنا دستِ مبارک بلند فرماتے ہوئے انگشتِ شہادت سے آسمان کی طرف اشارہ فرمایا......نگاہیں اوپر کی جانب جم گئیں......ہونٹوں میں خفیف سی جنبش ہونے لگی......ام المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے کان لگا کر سنا تو اُس وقت آپؐ کی زبان مبارک پر یہ آخری کلمات تھے ''مَعَ الَّذِينَ أَنعَمَ اللّٰهُ عَلَيهِم مِنَ النَّبِيّينَ وَالصِّدِّيقِينَ وَالشُّهَدَاءِ وَالصَّالِحِينَ ، اللّٰهُمَّ اغفِرلِي وَارحَمنِي '' یعنی ''ان لوگوں کے ساتھ جن پر اللہ نے اپنا انعام فرمایا، انبیاء، صدیقین، شہداء اور صالحین......اے اللہ! مجھے بخش دے اور مجھ پر رحم فرما''

اور پھر آخر میں تین بار فرمایا ''وَ أَلحِقنِي بَالرَّفِيقِ الأعلىٰ، اَللّٰهُمّ الرَّفِيقَ الأعلىٰ''

یعنی ''اور مجھے اوپر والے ساتھی کے ساتھ ملا دے......اے اللہ! اے اوپر والے ساتھی''۔

اوران آخری الفاظ کے ساتھ ہی آپ ﷺ کا اٹھا ہوا ہاتھ گر گیا......اور......جسمِ اطہر سے روح مبارک پرواز کرگئی......

اور یوں وہ بولتا ہوا قرآن' نورِ ہدایت کا پیکر' مکمل نمونۂ حیات' خیر البشر' رحمۃ للعالمین' دشمنوں کا خیر خواہ' مظلوموں کا غمخوار' اور انسانیت کا محسنِ اعظم' یعنی رسول اکرم ﷺ، تئیس سال کے عرصے میں اللہ کے بندوں تک اللہ کا دین مکمل پہنچا دینے کے بعد، ہجری کیلنڈر کے مطابق تریسٹھ برس کی عمر میں' ۱۲/ ربیع الاول سن ۱۱ ہجری' بروز پیر' بوقتِ چاشت اپنے رب سے جا ملے۔ (۱)

اناللہ وانا الیہ راجعون......کل من علیہا فان ویبقیٰ وجہ ربک ذوالجلال والاکرام......اللھم صل وسلم وبارک علیٰ عبدک ورسولک محمد، وعلیٰ آلہٖ واصحابہٖ اجمعین، برحمتک یا ارحم الراحمین۔

❁❁❁

(۱) خط کشیدہ عبارت فقیر سید وحید الدین کی کتاب ''محسنِ اعظم'' سے مأخوذ ہے، جو کہ میں نے بچپن میں ۱۹۶۵ء میں پڑھی تھی......اور یہ الفاظ اس وقت سے ہی میرے ذہن میں نقش ہیں۔

سوگوار فضاء:

اشرف الأنبیاء والمرسلین، سید الأولین والآخرین، رسول اکرم ﷺ کی رحلت اور اس جہانِ فانی سے رخصتی کا یہ سانحہ یقیناً آپؐ کے افرادِ خانہ اور اہلِ بیت کیلئے، نیز تمام مسلمانوں کیلئے بہت ہی بڑا صدمہ تھا، جیسا کہ حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: مَا رَأَیتُ یَوماً قَطُّ کَانَ أَحسَنَ وَلَا أَضوَأَ مِن یَومٍ دَخَلَ عَلَینَا فِیهِ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ وَمَا رَأَیتُ یَوماً أَقبَحَ وَلَا أَظلَمَ مِن یَومٍ مَاتَ فِیهِ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ (۱)
یعنی ''میں نے مدینہ شہر میں کبھی کوئی ایسا خوشگوار اور روشن دن نہیں دیکھا کہ جیسا رسول اللہ ﷺ کی مدینہ تشریف آوری کے موقع پر تھا...... اسی طرح میں نے مدینہ شہر میں کبھی کوئی ایسا سوگوار اور بجھا بجھا سا دن نہیں دیکھا کہ جیسا رسول اللہ ﷺ کی وفات کے موقع پر تھا''۔

چنانچہ اُس روز تمام مدینہ شہر میں ہر جانب رنج والم کی فضاء چھائی ہوئی تھی...... ہر کوئی غم کے سمندر میں ڈوبا جارہا تھا...... یہ افسوسناک خبر سنتے ہی صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین بڑی تعداد میں مسجد میں اور قرب وجوار کے علاقے میں جمع ہونے لگے...... ہر طرف آہ وبکاء کا ماحول تھا۔

حتیٰ کہ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ جیسا انتہائی جرأت مند، بہادر، باہمت اور مدبر انسان (جسے دنیا ''فاروقِ اعظم'' کے لقب سے یاد کرتی ہے) شدتِ غم کی وجہ سے ہوش وحواس کھو بیٹھا، انہیں کسی صورت یقین ہی نہیں آرہا تھا کہ رسول اللہ ﷺ اب ہمیشہ کیلئے ہم سے جدا ہو چکے ہیں...... چنانچہ وہ وہاں موجود مسلمانوں کو مخاطب کرتے ہوئے بآوازِ بلند

(۱) مشکاۃ المصابیح [۵۹۶۲] کتاب الفضائل والشمائل، باب ہجرۃ أصحابہ من مکۃ ووفاتہ......

یوں کہنے لگے ’’کوئی ہرگز یوں نہ کہے کہ رسول اللہ ﷺ وفات پا چکے ہیں...... کیونکہ رسول اللہ ﷺ تو اللہ کے پاس گئے ہیں...... جس طرح موسیٰ علیہ السلام چالیس روز کیلئے کوہِ طور پر اللہ کے پاس گئے تھے...... تورات لینے کیلئے...... اور پھر واپس آ گئے تھے...... اسی طرح رسول اللہ ﷺ کو بھی اللہ نے اپنے پاس بلایا ہے...... اور یہ کہ آپ ؐ بھی چالیس روز کے بعد واپس تشریف لائیں گے...... اور آج جو لوگ یوں کہہ رہے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کا انتقال ہو چکا ہے...... وہ یاد رکھیں کہ آپ ؐ جب اپنے اللہ کے پاس سے واپس تشریف لائیں گے، تب خود اپنے ہاتھ سے ان لوگوں کی گردن اڑا دیں گے‘‘۔(۱)

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا گھر مسجدِ نبوی سے کچھ دور تھا (۲) اُس روز نمازِ فجر کے وقت چونکہ رسول اللہ ﷺ کی طبیعت میں قدرے بہتری اور افاقے کے آثار نمایاں تھے...... لہٰذا حضرت ابوبکرؓ فجر کی نماز پڑھانے کے بعد اپنے گھر چلے گئے تھے، لیکن کچھ وقت گذرنے کے بعد جب انہیں رسول اللہ ﷺ کے انتقال کی جان لیوا خبر موصول ہوئی تو وہ واپس تشریف لائے، مسجد کے اندر بھی اور آس پاس بھی انتہائی سوگوار ماحول میں مسلمانوں کا ایک جمِ غفیر نظر آیا...... نیز انہوں نے یہ منظر بھی دیکھا کہ اس مجمع کے درمیان حضرت عمر رضی اللہ عنہ کھڑے ہوئے بآوازِ بلند کیسی عجیب وغریب باتیں کر رہے ہیں...... کچھ دیر وہ ان کے قریب کھڑے رہے، ان کی باتیں سنتے رہے، اور سمجھ گئے کہ شدتِ غم کی وجہ سے یہ ہوش وحواس گنوا بیٹھے ہیں...... لہٰذا انہوں نے حضرت عمرؓ سے کوئی بات نہیں کی، نہ ہی کسی اور سے کوئی بات کی، بلکہ اس مجمع میں کچھ دیر توقف کے بعد فوری طور پر رسول اللہ

(۱) السیرۃ النبویہ لابن ہشام/ رقم النص: ۲۰۹۵/ صفحہ: ۳۶۳/ جلد: ۴۔
(۲) ’’سُنح‘‘ کے مقام پر، جسے آجکل ’’عوالی‘‘ کہا جاتا ہے۔

ﷺ کے گھر پہنچے' جو کہ ان کی صاحبزادی ام المؤمنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا گھر بھی تھا، گھر میں داخل ہونے کے بعد اپنی بیٹی سے مختصر گفتگو کی، جو دل گداز اور جان لیوا خبر سنی تھی...... اس کی تصدیق چاہی......اور پھر یقین ہو جانے کے بعد رسول اللہ ﷺ کے جسدِ اطہر کی طرف متوجہ ہوئے......رُخِ انور سے کپڑا اٹھایا......جبینِ اقدس پر بوسہ دیا...... کچھ آنسو بہائے......اور پھر کچھ دیر اسی طرح کھڑے دیکھتے رہے......اس کے بعد ہونٹوں میں لرزش ہوئی......اور لرزتی ہوئی آواز میں یہ الفاظ کہے''بِأبِي أنتَ وَ أُمّي يَا رَسُولَ اللّه...... ''یعنی''اے اللہ کے رسول......آپ پر میرے ماں باپ قربان......''اور پھر وہاں سے چل دیئے......

اس کے بعد حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ باہر تشریف لائے، اور مسجد میں پہنچے، لوگوں کا وہی جمِ غفیر اسی طرح موجود تھا، کسی کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا، حضرت عمر رضی اللہ عنہ اسی طرح مجمع کے درمیان کھڑے ہوئے بے خودی کی کیفیت میں اپنی وہی باتیں مسلسل دہرا رہے تھے......

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے جب یہ صورتِ حال دیکھی، اور حضرت عمرؓ کی یہ باتیں سنیں تو سمجھ گئے کہ یہ تو ہوش کھو بیٹھے ہیں......اس پر انہوں نے حضرت عمرؓ سے کہا کہ''اے عمر......آپ بیٹھ جائیے......''لیکن حضرت عمرؓ شدتِ غم کی وجہ سے اس قدر مغلوب الحال ہو چکے تھے کہ بیٹھنے سے انکار کر دیا......

اسی دوران اب یہ صورتِ حال ہوئی کہ لوگوں نے جب حضرت ابوبکرؓ کو دیکھا تو سب ان کی طرف متوجہ ہو گئے......اور ان کے گرد جمع ہونے لگے......تب انہیں مخاطب کرتے ہوئے حضرت ابوبکرؓ نے مختصر خطبہ دیا' جس میں رسول اللہ ﷺ کی اس جہانِ فانی سے رخصتی کا یوں

اعلان فرمایا ’’مَن کَانَ مِنکُم یَعبُدُ مُحَمَّداً فَاِنَّ مُحَمَّداً قَد مَاتَ ، وَمَن کَانَ یَعبُدُ اللّٰہَ فَاِنَّ اللّٰہَ حَيٌّ لَا یَمُوتُ ‘‘یعنی ’’تم میں سے جو کوئی محمدؐ کی عبادت کرتا تھا‘ وہ جان لے کہ محمدؐ کا اب انتقال ہو چکا ہے......اور جو کوئی اللہ کی عبادت کرتا تھا‘ تو اللہ ہمیشہ زندہ رہنے والا ہے‘ اسے کبھی موت آنے والی نہیں ہے......‘‘(۱)اور پھر قرآن کریم کی یہ آیت تلاوت کی: ﴿وَ مَا مُحَمَّدٌ اِلّا رَسُولٌ قَد خَلَت مِن قَبلِهِ الرُّسُلُ أفَاِن مَّاتَ أو قُتِلَ انقَلَبتُم عَلَىٰ أعقَابِکُم ومَن یَّنقَلِب عَلَىٰ عَقِبَیهِ فَلَن یَّضُرَّ اللّٰهَ شَیئاً وَّ سَیَجزِي اللّٰهُ الشَّاکِرِینَ﴾ (۲)

ترجمہ: ’’محمد [ﷺ] تو صرف رسول ہی ہیں، ان سے پہلے بھی بہت سے رسول گذر چکے ہیں، کیا اگر ان کا انتقال ہو جائے‘ یا وہ شہید ہو جائیں‘ تو تم اسلام سے اپنی ایڑیوں کے بل پھر جاؤ گے؟ اور جو کوئی پھر جائے اپنی ایڑیوں پر تو ہرگز وہ اللہ کا کچھ نہیں بگاڑے گا، عنقریب اللہ شکر گذاروں کو نیک بدلہ دے گا‘‘

حضرات صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین اس آیت سے‘ نیز اس کے مضمون سے خوب واقف تھے، اور عرصۂ دراز سے اسے پڑھتے اور سنتے چلے آرہے تھے......لیکن اس روز حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی زبانی جب یہ آیت سنی تو انہیں یوں محسوس ہوا کہ گویا یہ آیت ابھی نازل ہوئی ہو......ان کے ذہنوں میں اس آیت کا مضمون تازہ ہو گیا......وہ سب اس آیت کو باربار دہرانے لگے......جیسا کہ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ اُس وقت وہاں جس شخص کی طرف بھی میری نگاہ اٹھی مجھے اس کے لب ہلتے ہوئے نظر آئے......اور وہ یہی آیت زیرِ لب دہراتا ہوا نظر آیا......اور تب رفتہ رفتہ انہیں

(۱) صحیح بخاری [۳٦٦۸] کتاب [٦۲] فضائل الصحابۃ، باب [۵] لو کنت متخذاً خلیلاً......(۲) آل عمران [۱۴۴]

اس تلخ ترین حقیقت پر یقین آنے لگا کہ رسول اللہ ﷺ واقعی اب ہم میں نہیں رہے......
حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی زبانی یہ آیت دیگر صحابۂ کرام کی طرح حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے بھی سنی......تو انہیں بھی اب یقین آنے لگا کہ واقعی رسول اللہ ﷺ اب ہم میں نہیں رہے......اور تب صدمے نے دوسری شکل اختیار کر لی...... جب تک یقین نہیں آیا تھا اُس وقت تک بے خودی کی کیفیت طاری تھی......لیکن جب یقین آ گیا تو صدمے کی شدت کی وجہ سے ایسا لرزہ طاری ہوا کہ ٹانگوں میں جسم کا بوجھ اٹھانے کی سکت باقی نہیں رہی......
جیسا کہ بعد میں انہوں نے خود اپنی یہ کیفیت بیان کرتے ہوئے بتایا کہ ''ابوبکر کی زبانی یہ آیت سننے کے بعد مجھے یقین آ گیا کہ رسول اللہ ﷺ وفات پا چکے ہیں......مگر ساتھ ہی صدمے کی وجہ سے میرا یہ حال ہو گیا کہ میری ٹانگیں میرا بوجھ اٹھانے سے قاصر ہو گئیں......
اور میں بے اختیار اسی جگہ گر گیا......''(۱)

تجہیز و تکفین:

اشرف الأنبیاء والمرسلین، سید الأولین والآخرین، رسول اکرم ﷺ کی رحلت اور اس جہانِ فانی سے رخصتی کے بعد تجہیز و تکفین کا عمل فوری طور پر شروع نہیں کیا جا سکا...... یہ سانحہ پیر کی صبح پیش آیا تھا، جبکہ تجہیز و تکفین کا عمل دوسرے روز یعنی منگل کے دن شروع کیا گیا......اس تاخیر کی وجہ یہ تھی کہ یہ سانحہ آپ ﷺ کے افرادِ خانہ واہلِ بیت، نیز دیگر تمام مسلمانوں کیلئے اتنے بڑے صدمے کا باعث تھا کہ ہوش و حواس بحال نہیں تھے، کسی میں کوئی سکت ہی باقی نہیں رہی تھی......مدینے کی گلیوں میں ہر طرف کہرام مچا ہوا تھا......ہر کوئی انتہائی افسردہ و غمزدہ تھا......صدمے اور غم واندوہ کی اس کیفیت سے نکلنے میں کچھ وقت لگا......

(۱) السیرۃ النبویۃ لابن ہشام/ رقم النص: ۲۰۹۵/ صفحہ: ۳۶۴/ جلد: ۴۔

نیز اس موقع پر ایک اور انتہائی نازک معاملہ یہ درپیش تھا کہ رسول اللہ ﷺ کے سانحۂ ارتحال کے بعد اب آپؐ کا جانشیں کون ہوگا......؟ کبارِ صحابہ کا اصرار یہ تھا کہ یہ نازک ترین معاملہ رسول اللہ ﷺ کی تجہیز و تکفین سے قبل طے پا جانا ضروری ہے......تاکہ منافقین یا دیگر موقع پرست اور سازشی عناصر کو اس نازک صورتِ حال سے فائدہ اٹھانے کا موقع نہ مل سکے......

چنانچہ تجہیز و تکفین سے متعلق انتظامات کے سلسلے میں ہی جب حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ' نیز حضرت عمر رضی اللہ عنہ و دیگر چند کبارِ صحابہ رسول اللہ ﷺ کے گھر میں ہی موجود تھے کہ اسی دوران انہیں یہ اطلاع ملی کہ ''سقیفہ بنی ساعدہ'' نامی مقام پر بڑی تعداد میں لوگ جمع ہیں اور ان کا موضوعِ گفتگو یہی ہے کہ اب رسول اللہ ﷺ کا جانشیں کون ہوگا......؟

یہ اطلاع ملنے پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ سے اصرار کرتے ہوئے کہا کہ ''قبل اس کے کہ معاملہ نازک ہو جائے......ہمیں وہاں چلنا چاہئے......''

چنانچہ یہ حضرات وہاں پہنچے، وہاں یہی موضوع زیرِ بحث تھا، اور کسی بھی لمحے یہ معاملہ کوئی غلط رُخ اختیار کر سکتا تھا، صورتِ حال کی اس نزاکت کو بھانپتے ہوئے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے لوگوں کو مخاطب کرتے ہوئے اس نازک موقع پر ''فتنہ و افتراق'' سے بچنے' اور اتفاق و اتحاد کو بہرصورت قائم رکھنے کی اہمیت و ضرورت کے بارے میں مختصر گفتگو کی، اس کے بعد حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ' نیز حضرت ابوعبیدہ عامر بن الجراح رضی اللہ عنہ کی جانب اشارہ کرتے ہوئے فرمایا کہ ''یقیناً یہی دو حضرات رسول اللہ ﷺ کی جانشینی کے قابل ہیں، لہٰذا میرا مشورہ یہ ہے کہ ان میں سے کسی ایک کے ہاتھ پر جلد از جلد بیعت کر لی جائے''۔

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی یہ بات سُن کر حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

''ہم میں سے کس کا دل اس بات کو گوارا کرے گا کہ وہ شخص جسے خود رسول اللہ ﷺ نے ہماری امامت کیلئے منتخب فرمایا تھا' اس کے ہوتے ہوئے کسی اور کو اس منصب کیلئے پسند کیا جائے......؟

حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ کی زبانی یہ بات سنتے ہی حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے اصرار کیا ''ابوبکر، اپنا ہاتھ بڑھایئے'' جس پر حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے ان کی جانب اپنا ہاتھ بڑھایا، اور تب فوراً ہی حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے وہاں موجود لوگوں کو مخاطب کرتے ہوئے بآوازِ بلند یہ الفاظ کہے ''لوگو! میں ابوبکر کے ہاتھ پر بیعت کر رہا ہوں......تم سب بھی انہی کے ہاتھ پر بیعت کرلو......یہی رسول اللہ ﷺ کے جانشیں ہیں......''

اس پر وہاں موجود سبھی افراد نے بڑی تعداد میں حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے ہاتھ پر بیعت کی، کبارِ صحابہ کرام میں سے چند افراد اس وقت وہاں موجود نہیں تھے، جنہوں نے بعد میں مسجدِ نبوی میں بیعت کی......

یوں حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو بالاتفاق رسول اللہ ﷺ کے جانشین اور ''خلیفۂ اول'' کی حیثیت سے منتخب کر لیا گیا۔

البتہ یہ اہم ترین معاملہ' نیز دیگر کچھ نازک معاملات کو طے کرنے میں اُس دن کا کافی حصہ گذر گیا......اور شام کا اندھیرا پھیلنے لگا......لہٰذا رسول اللہ ﷺ کے جسدِ اطہر کی تجہیز و تکفین کے معاملے کو دوسرے روز یعنی منگل تک ملتوی کر دیا گیا۔

اس کے بعد دوسرے دن بروز منگل تجہیز و تکفین کا سلسلہ شروع ہوا، آپ ﷺ کو کپڑوں سمیت غسل دیا گیا، اس موقع پر فضل بن عباس اور اُسامہ بن زید رضی اللہ عنہم پردہ آگے کئے

کھڑے رہے، جبکہ حضرت عباس بن عبدالمطلب ' حضرت علی بن ابی طالب ' اور انصارِ مدینہ میں سے اَوس بن خولی (رضی اللہ عنہم اجمعین) نے جسدِ اطہر کو غسل دیا......جس کے بعد آپ ﷺ کو تین سفید سوتی کپڑے کی چادروں میں کفن دیا گیا۔

''تجہیز و تکفین'' کے اس مرحلے سے فراغت کے بعد اب یہ سوال پیدا ہوا کہ ''تدفین'' کس مقام پر کی جائے......؟ اس موقع پر حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے فرمایا ''میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ ارشاد فرماتے ہوئے سنا ہے کہ ''لَن یُقبَرَ نَبِیٌّ اِلّا حَیثُ یَمُوتُ'' ' یعنی ''ہر نبی کو اسی جگہ دفن کیا جاتا ہے جہاں اس کی وفات ہوئی ہو'' (۱)

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی زبانی یہ ارشادِ نبوی سننے کے بعد طے پایا کہ آپ ﷺ کے بسترِ وفات کے مقام پر ہی قبر تیار کی جائے (جو کہ دراصل ام المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کا حجرہ تھا) (۲)

تجہیز و تکفین اور پھر مقامِ تدفین کی تعیین کے بعد جب جنازہ اسی جگہ (یعنی حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے حجرے میں) رکھا ہوا تھا......تب نمازِ جنازہ کا آغاز ہوا، پہلے آپ ﷺ کے افرادِ خانہ اور اہلِ خاندان نے ' اور پھر دیگر مہاجرین و انصار ' مردوں اور عورتوں نے نمازِ جنازہ ادا کی۔

آپ ﷺ کی نمازِ جنازہ کے موقع پر کوئی امام نہیں تھا، حجرے کی تنگ دامانی کی وجہ سے دس

(۱) مسند امام احمد [۱/۳۵]

(۲) قبر مبارک کی کھدائی کا کام حضرت ابوطلحہ انصاری رضی اللہ عنہ نے انجام دیا، جو کہ مسجدِ نبوی سے متصل (اب مسجدِ نبوی کے اندر باب فہد سے متصل) ''بیرحاء'' نامی اپنے کنوئیں اور باغ کی وجہ سے ' اور پھر اس بارے میں نازل ہونے والی آیت ﴿لَن تَنَالُوا البِرَّ حَتَّیٰ تُنفِقُوا مِمَّا تُحِبُّونَ......﴾ (آل عمران:۹۲) کے حوالے سے معروف ہیں......جبکہ خود ان کی اپنی قبر میں ترکی کے قریب بحرِ احمر میں کسی گمنام جزیرے میں واقع ہے۔

دس اشخاص اندر جاتے ......اور نماز پڑھ کر نکل آتے...... یہ سلسلہ لگاتار جاری رہا......اس لئے تدفین منگل اور بدھ کی درمیانی شب' یعنی وفات کے تقریباً بتیس گھنٹے بعد عمل میں آئی۔

آپ ﷺ کے جسمِ اطہر کو حضرت علی بن ابی طالب' حضرت عباس بن عبدالمطلب' اوران کے بیٹوں یعنی فضل بن عباس اور قُثَم بن عباس' نیز آپ ﷺ کے ایک آزاد کردہ غلام ''شُقران'' (رضی اللہ عنہم اجمعین) نے مل کر قبر شریف میں اتارا۔(۱)

اللہم صل وسلم وبارک علیٰ عبدک ورسولک محمد، وعلیٰ آلہٖ واصحابہٖ اجمعین برحمتک یاارحم الراحمین۔

❁❁❁

(۱)السیرۃ النبویۃ لابن ہشام،۴/ ۴۱۸۔

الحمدللہ آج بتاریخ ۷/ ربیع الاول ۱۴۳۵ھ،مطابق ۸/ جنوری ۲۰۱۴ء بروز بدھ یہ باب مکمل ہوا۔

رَبَّنَا تَقَبَّل مِنَّا اِنّکَ أنتَ السَّمِیعُ العَلِیمُ ، وَتُب عَلَینَا اِنَّکَ أنتَ التَوَّابُ الرَّحِیم

اصل مقصود؛اتباع رسول ﷺ:

الحمدللہ گذشتہ صفحات میں رسول اللہ ﷺ کی سیرتِ مبارکہ اورحیاتِ طیبہ کے بارے میں مختصرتذکرے کی ہمیں سعادت نصیب ہوئی اور یوں اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی طرف سے خاص فضل وکرم اورتوفیق کی بدولت ہم اس قابل ہوسکے کہ اللہ کے حبیب ﷺ کے مبارک تذکرے کے ذریعے اپنے دلوں کومنورکرسکیں۔

البتہ اس موقع پر یہ اہم ترین تنبیہ ضروری ہے کہ جب بھی رسول اللہ ﷺ کی سیرتِ مبارکہ کاکہیں تذکرہ سناجائے......یااس بارے میں کسی کتاب کامطالعہ کیاجائے......تویہ بات ضرورذہن نشیں رکھی جائے کہ اس سے اصل مقصود آپ ﷺ کی پاکیزہ تعلیمات کا ’’اتباع‘‘ ہے......کیونکہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی طرف سے دنیائے انسانیت کیلئے آپ ﷺ کی بعثت کااصل مقصدیہی تھا۔

☆......نیزاس موقع پر یہ بات سمجھنابھی ضروری ہے کہ رسول اللہ ﷺ ہمارے محسن ہیں، تمام دنیائے انسانیت پرآپؐ کے بیشماراحسانات ہیں،اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی طرف سے آپؐ کودنیاومافیہا کیلئے’’رحمت‘‘ بناکربھیجاگیا،حتیٰ کہ آپؐ کاوجودِمسعودتو آپؐ کے بدترین مخالفین اوردشمنوں کیلئے بھی باعثِ رحمت تھا......مشرکینِ مکہ ہمیشہ آپؐ کامذاق اڑایاکرتے......طنزکیاکرتے......اورتمسخرواستہزاء کےطورپریوں کہاکرتے کہ’’آپ جس عذاب کاتذکرہ کرتے رہتے ہیں......اورہمیں اللہ کےجس عذاب سےآپ ہمیشہ ڈراتے ہیں......کہاں ہےوہ عذاب......؟لایئے وہ عذاب......اللہ سےکہئے کہ ہم پرآسمان سے

پتھر برسائے......یا ہمیں کسی بڑے عذاب میں مبتلا کر کے دکھائے‘‘۔

مشرکینِ مکہ کی اسی بیہودہ گوئی کا قرآن کریم میں یوں تذکرہ کیا گیا ہے:﴿وَإِذ قَالُوا اللّٰهُمَّ اِن كَانَ هٰذَا هُوَا الحَقَّ مِن عِندِكَ فَأمطِرُ عَلَينَا حِجَارَةً مِّنَ السَّمَاءِ أَو ائتِنَا بِعَذَابٍ أَلِيمٍ﴾ (۱) ترجمہ:(اور جب ان لوگوں نے کہا کہ اے اللہ!اگر یہ قرآن تیری طرف سے واقعی ہے تو ہم پرآسمان سے پتھر برسا ٗ یا ہم پر کوئی دردناک عذاب واقع کردے)

اس پر اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی طرف سے اپنے حبیب ﷺ کو مخاطب کرتے ہوئے یہ ارشاد ہوا: ﴿وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُعَذِّبَهُم وَأنتَ فِيهِم......﴾ (۲) ترجمہ:(اور اللہ تعالیٰ ایسا نہیں کرے گا کہ ان میں آپ کے ہوتے ہوئے انہیں عذاب دے......)

اس سے یہ حقیقت واضح ہوئی کہ رسول اللہ ﷺ کا وجودِ مسعود تمام بنی نوعِ انساں کیلئے ٗ حتیٰ کہ بدترین دشمنوں ٗ مخالفوں ٗ بدخواہوں اور تمسخر واستہزاء کرنے والوں کیلئے بھی باعثِ رحمت تھا......اسی حقیقت کا قرآن کریم میں ان الفاظ میں تذکرہ کیا گیا ہے:﴿وَمَا أَرسَلنَاكَ اِلَّا رَحمَةً لِّلعَالَمِينَ﴾ (۳) یعنی’’[اے نبیؐ] ہم نے آپ کو تمام دنیا والوں کیلئے رحمت بنا کر ہی بھیجا ہے‘‘

اور پھر بالخصوص اپنی امت کیلئے آپ ﷺ کے قلبِ مبارک میں خیرخواہی وہمدردی کے جو جذبات تھے......اپنی امت کی صلاح وفلاح کی خاطر آپؐ جس طرح ہمیشہ فکرمند اور کوشاں رہا کرتے تھے......اور امت کی رہبری ورہنمائی کی خاطر آپؐ جس طرح ہمیشہ مشغول ومنہمک رہا کرتے تھے......اسی حقیقت کی طرف اشارے کے طور پر قرآن کریم

(۱)انفال[۳۲] (۲)انفال[۳۳] (۳)الأنبیاء[۱۰۷]

میں یوں ارشادِ ربانی ہوا:﴿لَقَد جَاءَ كُم رَسُولٌ مِّن أَنفُسِكُم عَزِيزٌ عَلَيهِ مَا عَنِتُّم حَرِيصٌ عَلَيكُم بِالمُؤمِنِينَ رَؤُفٌ رَّحِيمٌ﴾ (۱) ترجمہ:(تمہارے پاس ایک ایسے رسول تشریف لائے ہیں جو تمہاری ہی جنس میں سے ہیں' جنہیں تمہاری مضرت کی بات نہایت گراں گذرتی ہے' جو تمہاری منفعت کے بڑے خواہشمند رہتے ہیں' ایمان والوں کے ساتھ بڑے ہی شفیق اور مہربان ہیں)

یقیناً اس سے یہی حقیقت خوب واضح وثابت ہوجاتی ہے کہ تمام دنیائے انسانیت پر عموماً......جبکہ اپنی امت پر خصوصاً......آپؐ کے بہت زیادہ احسانات ہیں۔

اسی طرح آپ ﷺ کا ارشاد ہے: (اِنَّمَا مَثَلِي وَمَثَلُ النَّاسِ كَمَثَلِ رَجُلٍ اِستَوقَدَ نَاراً ، فَلَمَّا أَضَاءَ تْ مَا حَولَهَا جَعَلَ الفَرَاشُ يَقَعْنَ فِيهَا ، فَأنَا آخِذٌ بِحُجَزِكُم عَنِ النَّارِ ، وَأنتُم تُقحَمُونَ فِيهَا) (۲) ترجمہ:''میری اور تم لوگوں کی مثال اُس شخص کی مانند ہے کہ جس نے کوئی آگ جلائی، اور جب وہ آگ خوب روشن ہوگئی تو پروانے آ آ کر اس میں گرنے لگے......میں ہوں کہ مسلسل تمہارے لباس کی گرہوں سے پکڑ پکڑ کر تمہیں اس آگ میں گرنے سے بچانے کی کوشش کرتا ہوں، جبکہ تم لوگ ہو کہ اس آگ میں گرتے پڑتے ہو''۔

یعنی جس طرح پروانے آگ پر ٹوٹے پڑ رہے ہوں، اور کوئی شخص انہیں موت سے اور جل مرنے سے بچانے کی غرض سے مسلسل انہیں وہاں سے دور رکھنے کیلئے محنت ومشقت اور جدوجہد کئے جارہا ہو......لیکن اس کے باوجود پروانے اس آگ میں جل مرنے کیلئے ہر طرف سے ٹوٹے پڑ رہے ہوں......یہی حال رسول اللہ ﷺ کا اپنی امت کے ساتھ ہے،

(۱) التوبہ[۱۲۹] (۲) بخاری[۶۴۸۳] کتاب الرقاق[۸۱] باب[۲۶] الانتہاء عن المعاصی۔

گویا ''اُمتی'' برائیوں اور نافرمانیوں کے مسلسل ارتکاب کے ذریعے جہنم کی آگ میں جل مرنے پر تُلے ہوئے ہیں......جبکہ رسول اللہ ﷺ انہیں اس بربادی سے اور جل مرنے سے بچانے کی خاطر شب و روز محنت وکوشش میں مشغول و منہمک ہیں۔(۱)

اسی طرح رسول اللہ ﷺ نے ارشادفرمایا: (لِكُلِّ نَبِيٍّ دَعوَةٌ مُستَجَابَةٌ ، فَتَعَجَّلَ كُلُّ نَبِيٍّ دَعْوَتَهُ ، وَاِنِّي اِختَبَأْتُ دَعْوَتِي شَفَاعَةً لِأُمَّتِي يَومَ القِيَامَةِ) (۲) ترجمہ: ''ہر نبی کو کسی ایک خاص دعاء کا موقع دیا جاتا ہے جو قبول کی جاتی ہے، اور ہر نبی نے دنیا میں ہی اللہ سے وہ دعاء مانگ لی ہے، جبکہ میں نے اپنی وہ خاص دعاء قیامت کے روز اپنی امت کی شفاعت کیلئے چھپا کر رکھ لی ہے''

یعنی ہر نبی کو اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی طرف سے ایک موقع ایسا دیا جاتا ہے کہ وہ اللہ سے جو چاہیں دعاء مانگ لیں، ان کی وہ دعاء ضرور قبول کی جائیگی......آپؐ نے فرمایا کہ مجھ سے پہلے انبیائے کرام علیہم السلام میں سے ہر نبی نے اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے دنیا میں ہی اللہ سے اپنے لئے وہ دعاء مانگ لی ہے......لیکن میں نے ابتک وہ دعاء نہیں مانگی ہے...... کیونکہ میں نے تو اسے روزِ قیامت اپنی امت کی شفاعت کیلئے چھپا کر رکھا ہوا ہے......

(۱) انسان کے لباس میں کچھ حصے ایسے ہوا کرتے ہیں جو نسبۃً زیادہ موٹے اور مضبوط ہوا کرتے ہیں، مثلاً کسی جوڑ پر کہ جہاں کپڑا آکر اکٹھا ہوتا ہے اور بعض اوقات کسی موٹی گرہ کی شکل محسوس ہوتی ہے......یا جو لوگ تہبند یا لنگی باندھتے ہیں تو جس جگہ لنگی کی گرہ ہوا کرتی ہے (مَعقِدُ الاِزَارِ أو السَّرَاوِيل) مضبوطی کے ساتھ پکڑنے کیلئے وہ جگہ مناسب ہوا کرتی ہے......لہٰذا آپ ﷺ نے یہی تشبیہ دیتے ہوئے فرمایا کہ ''میں تمہیں تمہارے لباس کی ان گرہوں سے پکڑ پکڑ کر تمہیں آگ میں جل مرنے سے بچانے کیلئے مسلسل جدوجہد میں مشغول رہتا ہوں......مگر تم لوگ ہو کہ بس جلنے پر ہی مُصر ہو......''

(۲) بخاری[۶۳۰۴] کتاب الدعوات[۸۰] باب[۱] لکل نبی دعوۃ مستجابۃ۔ نیز: مسلم[۱۹۹] کتاب الایمان۔

سبحان اللہ! رسول اللہ ﷺ کے قلبِ مبارک میں اپنی امت کیلئے اس قدر خیرخواہی وہمدردی کے جذبات......اتنی محبت......اس قدر فکر......اور اتنا درد......کہ وہ دعاء کہ جس کی قبولیت یقینی ہے......جس کی قبولیت کا اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی طرف سے وعدہ ہے...... آپؐ نے وہ دعاء خود اپنے لئے نہیں مانگی......بلکہ اپنی امت کیلئے بچا کر اور چھپا کر رکھ لی ہے۔

لہٰذا آپؐ کے قلبِ مبارک میں جب امت کیلئے خیرخواہی وہمدردی کے اس قدر شدید جذبات تھے......تو اس کا تقاضا یہ ہے کہ ''اُمتی'' کی حیثیت سے ہمارے دلوں میں بھی آپؐ کیلئے عقیدت ومحبت کے جذبات ہمیشہ موجزن رہیں......بلکہ آپؐ کی محبت تو ہر مؤمن کیلئے ''جزءِ ایمان'' ہے، جس کے بغیر ایمان کی تکمیل کا تصور نہیں کیا جاسکتا، جیسا کہ آپؐ کا ارشاد ہے: (لَا یُؤمِنُ أحَدُکُم حَتّیٰ أکُونَ أحَبَّ اِلَیہِ مِن وَلَدِہٖ وَ وَالِدِہٖ وَالنَّاسِ أجمَعِینَ) (۱) یعنی ''تم میں سے کوئی شخص مؤمن نہیں ہوسکتا، تاوقتیکہ میں اسے اس کی اولاد، اس کے والدین، نیز تمام سے لوگوں سے بڑھ کر محبوب نہ ہو جاؤں''۔

☆......محبت تقاضا کرتی ہے ''اتباع'' کا، جیسا کہ خود اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے قرآن کریم میں ارشاد فرمایا ہے: ﴿قُل اِن کُنتُم تُحِبُّونَ اللّٰہَ فَاتَّبِعُونِي یُحبِبکُمُ اللّٰہُ وَیَغفِرلَکُم ذُنُوبَکُم وَاللّٰہُ غَفُورٌ رَّحِیم﴾ (۲) ترجمہ: (کہہ دیجئے! اگر تم اللہ تعالیٰ سے محبت رکھتے ہو تو میری تابعداری کرو، خود اللہ تعالیٰ تم سے محبت کرے گا اور تمہارے گناہ معاف فرمادے گا اور اللہ تعالیٰ بڑا بخشنے والا مہربان ہے)

نیز ارشاد ہے: ﴿مَن یُطِعِ الرَّسُولَ فَقَد أطَاعَ اللّٰہَ﴾ (۳) ترجمہ: (اس رسول ﷺ

(۱) نسائی [۵۰۲۸] (۲) آل عمران [۳۱] (۳) النساء [۸۰]

کی جوکوئی اطاعت کرے اس نے اللہ تعالیٰ کی اطاعت کی)

اسی طرح ارشاد ہے:﴿قُل أَطِيعُوا اللَّهَ وَ الرَّسُولَ﴾ (۱)

ترجمہ: (کہہ دیجئے! کہ اللہ تعالیٰ اور رسول کی اطاعت کرو)

اسی طرح ارشاد ہے:﴿قُل أَطِيعُوا اللَّهَ وأَطِيعُوا الرَّسُولَ﴾ (۲)

ترجمہ: (کہہ دیجئے! کہ اللہ تعالیٰ کا حکم مانو اور رسول کی اطاعت کرو)

نیز ارشاد ہے:﴿وَاِن تُطِيعُوهُ تَهتَدُوا﴾ (۳) ترجمہ: (ہدایت تو تمہیں اسی وقت ملے گی جب تم رسول کی اطاعت کرو)

نیز ارشاد ہے:﴿فَلیَحذَرِ الَّذِينَ يُخَالِفُونَ عَن أَمرِهِ أَن تُصِيبَهُم فِتنَةٌ أَو يُصِيبَهُم عَذَابٌ أَلِيمٌ﴾ (۴) ترجمہ: (جولوگ حکمِ رسول کی مخالفت کرتے ہیں انہیں ڈرتے رہنا چاہئے کہ کہیں ان پر کوئی زبردست آفت نہ آپڑے یا انہیں دردناک عذاب نہ پہنچے)

نیز ارشاد ہے:﴿وَمَا آتَاكُمُ الرَّسُولُ فَخُذُوهُ وَمَانَهَاكُم عَنهُ فَانتَهُوا وَاتَّقُوااللَّهَ اِنَّ اللّهَ شَدِيدُ العِقَابِ﴾ (۵) ترجمہ: (اور جو کچھ تمہیں رسول دے لے لو۔اور جس سے تمہیں روکے رک جاؤ۔اور اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہا کرو۔یقیناً اللہ تعالیٰ سخت عذاب والا ہے)

نیز رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے:(كُلُّ اُمَّتِي يَدخُلُونَ الجَنَّةَ اِلَّا مَن أَبَىٰ ، قِيلَ : وَمَن يَأبَىٰ يَارَسُولَ اللّه؟ قَالَ : مَن أَطَاعَنِي دَخَلَ الجَنَّةَ ، وَمَن عَصَانِي

(۱) آل عمران[۳۲] (۲) النور[۵۴] (۳) النور[۵۴] (۴) النور[۶۳]
(۵) الحشر[۶]

فَقَد أبَىٰ) (۱) ترجمہ: (میری امت کے سب ہی لوگ جنت میں داخل ہو ہی جائیں گے سوائے اس شخص کے جو خود ہی [جنت میں جانے سے] انکار کر دے، عرض کیا گیا کہ: اے اللہ کے رسولؐ: ایسا شخص کون ہوسکتا ہے کہ جو خود ہی [جنت میں جانے سے] انکار کر دے؟ آپؐ نے فرمایا: جس نے میری اطاعت کی وہ جنت میں داخل ہو گیا، اور جس نے میری نافرمانی کی اس نے خود ہی [جنت میں جانے سے] انکار کر دیا)

گذشتہ نصوص کی روشنی میں یہ بات خوب واضح وثابت ہو جاتی ہے کہ مسلمان کیلئے زندگی کے ہر شعبے میں رسول اللہ ﷺ کی شخصیت کو ''اُسوۂ حسنہ'' سمجھنا اور آپؐ کی پاکیزہ تعلیمات پر صدقِ دل کے ساتھ عمل کی فکر وجستجو کرتے رہنا از حد ضروری ہے۔

اسی سلسلے میں مزید یہ ارشادِ ربانی بھی بڑی اہمیت کا حامل ہے: ﴿لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللّٰهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ﴾ (۲) ترجمہ: (یقیناً تمہارے لئے رسول اللہ ﷺ کی ہستی میں بہترین نمونہ ہے)

اس آیت کی رو سے ہر مسلمان کیلئے یہ بات ضروری ولازمی ہے کہ وہ زندگی کے ہر معاملہ میں رسول اللہ ﷺ کی شخصیت کو اپنے لئے بہترین مثال اور قابلِ تقلید نمونہ تصور کرے اور آپؐ کی تعلیمات وہدایات کو اپنے لئے مشعلِ راہ اور روشنی کا مینار سمجھے۔

☆...... یہاں یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ تمام بنی نوعِ انسان میں سے صرف رسول اللہ ﷺ کی شخصیت کو اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی طرف سے تمام دنیائے انسانیت کیلئے بہترین مثال اور قابلِ تقلید نمونہ قرار دیا گیا اور تمام اہلِ ایمان کو آپ ﷺ کا اخلاق وکردار اپنانے کی تاکید

(۱) بخاری [۷۲۸۰] کتاب الاعتصام بالکتاب والسنۃ [۹۶] باب [۲] الاقتداء بسنن رسول اللہ ﷺ وقول اللہ تعالیٰ: واجعلنا للمتّقین اماماً۔ (۲) الاحزاب [۲۱]

تاکید و تلقین کی گئی ہے، اس بارے میں اگر غور وفکر کیا جائے تو یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ تمام دنیائے انسانیت کیلئے قابلِ تقلید نمونہ اور مثال صرف اسی شخصیت کو قرار دیا جاسکتا ہے جس میں درجِ ذیل دو اوصاف موجود ہوں:

ا۔ سیرت و تعلیمات کا محفوظ و معلوم ہونا:

یعنی اگر کوئی شخص کسی مخصوص شخصیت کو اپنے لئے مثال اور نمونہ قرار دیتے ہوئے اس کی تعلیمات کی پیروی اور اتباع کا خواہشمند ہو تو اس مقصد کیلئے ضروری ہے کہ اس مخصوص شخصیت کے حالاتِ زندگی اور اس کی تعلیمات و ہدایات محفوظ اور معلوم ہوں، ورنہ یہ کہ اگر اس کی تعلیمات کے بارے میں کسی کو علم ہی نہ ہو تو ان پر عمل کس طرح کیا جائیگا؟ لہٰذا قابلِ تقلید نمونہ یا اُسوہ حسنہ صرف ایسی شخصیت کو قرار دیا جاسکتا ہے جس کے حالاتِ زندگی محفوظ ہوں، جس کا اخلاق و کردار معلوم و معروف ہو، جس کی تعلیمات و ہدایات محفوظ ہوں اور ان کے بارے میں بسہولت معلومات حاصل کی جاسکتی ہوں۔

اس دنیا میں بیشمار مشہور و معروف اور بڑی نامور ہستیاں گذری ہیں، جن میں حضرات انبیائے کرام علیہم السلام کی جلیل القدر ہستیاں بھی شامل ہیں، عظیم فاتحین و سلاطین بھی شامل ہیں، بڑے بڑے دانشور، مصلحین و مجددین، سیاسی و مذہبی رہنما، شعراء و ادباء اور شعلہ بیان خطباء و مقررین کی بھی طویل فہرست ہے، لیکن یہ ایک ناقابلِ تردید حقیقت ہے کہ آج ان ہستیوں میں سے کسی کے بھی حالات یا تعلیمات اس قدر محفوظ و معلوم نہیں کہ جس قدر رسول اللہ ﷺ کی سیرت، آپؐ کے حالاتِ زندگی نیز آپؐ کی تعلیمات و ہدایات محفوظ و معلوم ہیں، چنانچہ آپ ﷺ کی ولادت، آپؐ کا بچپن، آپؐ کی پاکیزہ جوانی، آپؐ کی بعثت، آپؐ کی ہجرت، آپؐ کی عبادت، آپؐ کی تجارت، آپؐ کی سیاست، آپؐ کی گھریلو زندگی،

آپؐ کی مسجد کی زندگی، آپؐ کی بازار کی زندگی، آپؐ کے صلح و جنگ کے حالات و واقعات، سفر وحضر کے حالات و واقعات، آپؐ کے اخلاق و عادات، آپؐ کا حلیہ مبارکہ، آپؐ کا اندازِ تکلم، اندازِ تبسم، آپؐ کی رفتار و گفتار، آپؐ کی نشست و برخواست، آپؐ کے کھانے پینے کے طور طریقے، اپنی ازواجِ مطہرات کے ساتھ آپؐ کی معاشرت، نیز اپنے اصحاب کے ساتھ آپؐ کا رویہ وسلوک، غرضیکہ آپؐ کی حیاتِ طیبہ نیز آپؐ کی پاکیزہ ومقدس تعلیمات کا ہر پہلو اور ہر گوشہ نہایت ہی وضاحت وتفصیل کے ساتھ سیرت کی کتابوں میں موجود ومحفوظ ہے، گویا آپؐ کی سیرت نیز آپؐ کی تعلیمات وہدایات کسی کھلی کتاب کی طرح دنیا کے سامنے موجود ہیں، اور تمام دنیائے انسانیت میں یقیناً یہ امتیازی وصف صرف اور صرف آپؐ ہی کو حاصل ہے، تمام بنی نوعِ انسان میں آپؐ کے سوا اور کسی کو یہ امتیازی وصف اور یہ شرف حاصل نہیں ہوسکا۔

۲۔ جامعیت واکملیت:

تمام دنیائے انسانیت کیلئے اُسوہ حسنہ اور قابلِ تقلید نمونہ صرف ایسی شخصیت کو ہی قرار دیا جاسکتا ہے جس میں جامعیت واکملیت کی صفت پائی جاتی ہو، جس کی شخصیت ہمہ گیر ہو......اور یقیناً یہ امتیازی وصف اور شرف بھی تمام بنی نوعِ انسان میں صرف رسول اللہ ﷺ ہی کو حاصل ہے، چنانچہ آپؐ نے بعثت سے قبل بکریاں بھی چرائیں، محنت ومشقت بھی کی، تجارت بھی کی، آپؐ واعظ وناصح بھی تھے، معلم ومربی بھی تھے، قاضی ومُنصف بھی تھے، اسلامی سلطنت کے فرمانروا اور پیشوا بھی تھے، اسلامی لشکر کے سپہ سالار بھی تھے، اپنی مسجد میں امام وخطیب بھی تھے، مثالی شوہر اور مشفق ومہربان باپ بھی تھے......

☆......لہٰذا اگر کوئی تاجر ہے تو اس کیلئے آپ ﷺ کی زندگی کا وہ دور نمونہ ہے جب تجارت

کے حوالے سے چہار سو آپؐ کی امانت و دیانت کے چرچے تھے، اپنے اور پرائے، دوست اور دشمن، سب ہی آپ کو ''صادق'' و ''امین'' کے لقب سے پکارتے تھے۔

☆......اگر کوئی مظلوم و مجبور ہے تو اس کیلئے آپ ﷺ کی مکی زندگی کا وہ دور نمونہ ہے جو بے پناہ مصائب و مشکلات سے بھرپور تھا، خصوصاً وہ عرصہ جو آپ ﷺ نے کفارِ مکہ کی طرف سے مقاطعہ (سوشل بائیکاٹ) کے دوران شعبِ ابی طالب میں انتہائی بے بسی اور عسرت و تنگی کی کیفیت میں گذارا۔

☆......اگر کوئی فاتح و غالب ہے تو اس کیلئے آپ ﷺ کی زندگی کا وہ حصہ نمونہ اور مثال ہے جب آپ ﷺ کو اللہ نے کفارِ مکہ کے مقابلے میں ہمیشہ کیلئے فتح و غلبہ سے نوازا، اور فتحِ مکہ کے تاریخی اور یادگار موقع پر آپؐ فاتحانہ شان و شوکت یا کبر و غرور کی بجائے اپنے رب کی کبریائی اور حمد و ثناء بیان کرتے ہوئے انتہائی عاجزی و انکساری کے عالم میں مکہ مکرمہ میں داخل ہوئے، اور اس وقت کفارِ مکہ جب آپؐ کے سامنے عاجز و بے بس تھے اور مکمل طور پر آپؐ کے رحم و کرم پر تھے، آپؐ نے انتقام کی مکمل قدرت و طاقت کے باوجود کسی سے کوئی انتقام نہیں لیا اور اپنے بدترین دشمنوں کو بھی معاف فرما دیا۔

لہٰذا اگر کوئی شخص مزدور ہو یا تاجر، کسی سلطنت کا فرمانروا اور حکمران ہو یا مسجد کا امام و خطیب، معلم و مربی ہو یا منصف و قاضی، سپاہی ہو یا سپہ سالار، غرض یہ کہ رسول اللہ ﷺ کی ہستی میں ہر انسان کیلئے بہترین اُسوہ اور قابلِ تقلید نمونہ موجود ہے، خواہ اس کا تعلق معاشرے کے کسی بھی طبقہ سے ہو۔

☆......الغرض رسول اللہ ﷺ کی سیرتِ مبارکہ کا جب بھی تذکرہ ہو، یا اس موضوع پر جب بھی کسی کتاب یا کسی مضمون کے مطالعے کا اتفاق ہو تو، ایسے میں اصل مقصود یہی ہونا چاہئے

کہ ہم آپ ﷺ کی سیرتِ مبارکہ کو جاننے اور آپ ؐ کی پاکیزہ تعلیمات کو سمجھنے کے بعد، خلوصِ نیت اور جذبۂ صادق کے ساتھ زندگی کے ہر شعبے میں ان تعلیمات کو جاری ونافذ کرنے کی مخلصانہ کوشش کریں ......اوراس طرح ہم دنیاوآخرت میں اپنے لئے صلاح وفلاح اور خیروخوبی کا انتظام کرسکیں......واللہ الموفق والہادی الیٰ سواء السبیل......!

وآخر دعوانا أن الحمد للہ رب العالمین

وصلیٰ اللہ تعالیٰ علیٰ خیر خلقہٖ محمد وعلیٰ آلہٖ وأصحابہٖ أجمعین۔

❁❁❁

الحمد للہ آج بتاریخ ۱۷/ربیع الاول ۱۴۳۵ھ، مطابق ۱۸/جنوری ۲۰۱۴ء بروز ہفتہ، بعد نمازِ عشاء، یہ کتاب ''سیرت النبی ﷺ'' مکمل ہوئی۔

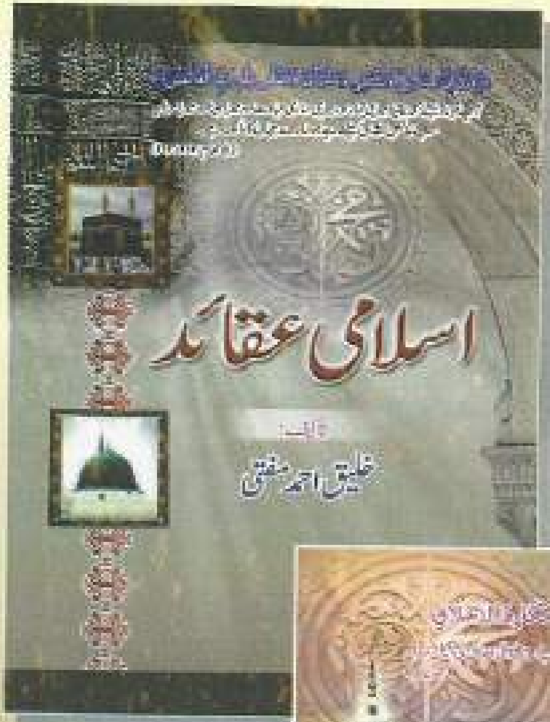
رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ ، وَتُبْ عَلَیْنَا اِنَّکَ اَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِیْمُ ،

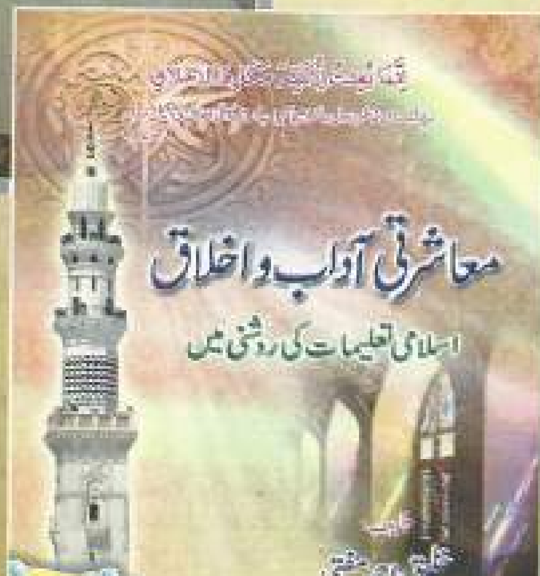
اَللّٰھُمَّ احشُرنَا مَعَ النَّبِیّینَ وَالصِّدِّیقِینَ وَالشُّھَدَاءِ وَالصَّالِحِینَ ، وَارزُقنَا صُحبَۃَ نَبِیّکَ مُحَمَّدٍ صلی اللہ علیہ وسلم وَأصحَابِہٖ فِي جَنَّاتِکَ جَنَّاتِ النَّعِیم،

بِرَحمَتِکَ یَا أرحَمَ الرَّاحِمِینَ ،

سُبُحَانَ رَبِّکَ رَبِّ العِزَّۃِ عَمَّا یَصِفُوْنَ ، وَسَلَامٌ عَلٰی الْمُرْسَلِیْنَ ، وَالْحَمْدُلِلّٰہِ رَبِّ الْعَالمِیْنَ.

☆☆☆


اسلامی عقائد
تالیف
خلیق احمد مفتی


معاشرتی آداب و اخلاق
اسلامی تعلیمات کی روشنی میں
خلیق احمد مفتی